ملفوظات

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مولانا شیخ رحیم الدین

مکتبہ خدام القرآن لاہور

بسم الله الرحمن الرحيم

ملفوظات

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مرتّب:

مولانا شیخ رحیم الدین

مکتبہ خُدّامُ القُرآن لاہور

36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون : 3-35869501

maktaba@tanzeem.org

مؤسس انجمن خدام القرآن جناب ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی اپنی دلی خواہش اور جدوجہد کے تقاضوں کے عین مطابق' مرحوم کے تمام قانونی وارثین ہر مسلمان کو ڈاکٹر صاحبؒ کی طبع شدہ تصنیفات/ تالیفات' آڈیوز' ویڈیوز کو طبع/ تیار کر کے شائع کرنے کی کھلی اجازت دیتے ہیں (چاہے قیمتاً ہو یا مفت تقسیم) اور اس کے لیے کسی پیشگی اجازت کی ضرورت نہیں۔ ہمارا کسی قسم کی رائلٹی یا ''محفوظ حقوق'' کا تقاضا بھی نہ ہے اور نہ ہوگا' البتہ تیار کردہ مواد (آڈیوز یا ویڈیوز) اور کتب کے چند نسخے ہمارے ریکارڈ کے لیے بھیج دیے جائیں تو ممنون ہوں گے۔ تاہم ان میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی ناپسندیدہ کوشش مثلاً تبدیلی الفاظ' غلط اقتباس' سیاق وسباق سے الگ کر کے جملے کا حوالہ یا اس کا ایسا استعمال جس سے ڈاکٹر صاحب مرحوم اور ہمارے موقف کی صحیح ترجمانی نہ ہو اور جس سے ہماری عزت وشہرت پر حرف آئے' تو ہم اس شخص کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا مکمل حق محفوظ رکھتے ہیں۔

نام کتاب ——— ملفوظات ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مرتب ——— مولانا شیخ رحیم الدین

طبع اوّل (دسمبر 2015ء) ——— 1100

ناشر ——— ناظم نشر واشاعت' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ——— 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

فون: 35869501-3

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس' لاہور

قیمت ——— 200 روپے

ISBN : 978 - 969 - 606 - 021 - 5

email:publications@tanzeem.org
website:www.tanzeem.org

آئینہ ملفوظات

- عرض مرتب 7
- تقدیم 9
  از حافظ عاطف وحید صاحب
  انچارج شعبہ تحقیق اسلامی، قرآن اکیڈمی لاہور
- پیش لفظ 15
  از حافظ عاکف سعید صاحب، امیر تنظیم اسلامی
- ایمان اور توکل 17
- رمضان: نزول قرآن کا سالانہ جشن 18
- وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ
- قرآن حکیم کے بارے میں ہمارا عقیدہ 24
- قرآن کریم کا اسلوبِ استدلال 25
- قرآن مجید کا موضوع 27
- قرآن حکیم کی محفوظیت 28
- قرآن حبل اللہ ہے 31
- قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت 38
- اسلام اور مغرب 41
- روحِ قربانی 42
- ہمارے دین میں تقویٰ کا مقام 43
- حقیقت موت 44
- قرآن حکیم اور جہاد فی سبیل اللہ 45

- غور کیجیے! 51
- وقت کی اہم ترین ضرورت 52
- حاکمیت اور خلافت میں فرق 53
- غور کیجیے اور عمل کیجیے 55
- اسلامی تاریخ میں بیعت کا مقام 56
- عریضہ بنام علماء کرام 57
- میرے تصور فرائض دینی کا خلاصہ 59
- اسلامی نظام کیسے آئے گا؟ 61
- مواخات کی اہمیت 62
- قیام اللیل کی اہمیت 63
- معاشرتی بے راہ روی کا تجزیہ اور تشخیص 65
- خطبہ نکاح کی اہمیت 67
- ہماری بہنوں کے لیے لمحۂ فکریہ 74
- قرآن مجید سے بے اعتنائی کا اصل سبب 77
- مساوی شہریت کا فریب 78
- جماعتی زندگی مردوں اور عورتوں کے لیے ضروری ہے 79
- انقلابِ نبویؐ پر یہودیت کا حملہ 82
- مناقشاتِ صحابہؓ کے بارے میں معتدل رائے 84
- اسلام میں زکوٰۃ کا نظام اور اس کی برکات 86
- انقلابی کارکنوں کی تربیت 90
- پرویز مشرف سے میری ملاقات 91
- دنیا کا واحد جامع ترین انقلاب 92

- عورت کا اصل دائرہ کار 95
- ستر وحجاب سے متعلق ڈاکٹر صاحب کا دعویٰ 96
- خواتین کا کھیتوں، کھلیانوں اور دفاتر میں کام کی نوعیت کا اختلاف 97
- تدبر قرآن کی شرائط 99
- انکارِ آخرت کا ایک اہم سبب 103
- خدائی تدبیر میں مدینہ کا انتخاب 104
- گمراہ فرقوں اور تحریکوں کا طریق واردات 106
- خلیفہ 111
- نظریہ پاکستان کا تاریخی پس منظر 112
- اسلاف سے مضبوط تعلق 118
- میرا معیار اور آئیڈیل 120
- علامہ اقبال مرحوم اور وطنی قومیت 121
- انتخابات کے ذریعے اولی الامر کا تقرر 128
- ہمارے عقائد 129
- منافق کی علامت 139
- حسرت بوقت مرگ 141
- ایک غلط فہمی کا ازالہ 142
- نفاق کا علاج: انفاق 143
- تکمیل وختم نبوت کا منطقی تقاضا 144
- غور کیجیے! 145
- مرتبہ ومقام محمدی کا لحاظ اشد ضروری ہے 147
- تقویٰ: عزت وشرف کی بنیاد 149

- مقامِ رسالت کے حوالے سے ہماری ذمہ داری 150
- تحریک پاکستان میں مسلمانانِ ہند کا جوش وجذبہ 151
- غیر اسلامی نظام کے تحت زندگی گزارنے کا کفارہ 153
- خلافت راشدہ کے خصائص 154
- اسلامی تحریک کی اساس: شعوری ایمان 159
- انسانی زندگی کی حقیقت 162
- تحقیر آمیز ناموں سے پکارنے کی ممانعت 164
- یقین قلبی کا ذریعہ: قرآن مجید 165
- عیب جوئی کی ممانعت 167
- منافق کون ہے؟ 168
- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خصوصی فضیلت 170
- قرآن حکیم کی روشنی میں اخلاقیات کی فلسفیانہ اساس 171
- ضبطِ نفس اور ستر وحجاب کے احکامات 176
- نظریۂ پاکستان سے انحراف کا نتیجہ 179
- سالمیتِ پاکستان کے ناگزیر لوازم 180
- جزوی نہیں کلی اطاعت مطلوب ہے 181
- اسلام کے عالمی غلبہ میں پاکستان کا مقام وکردار 182
- قرابت دار کے ساتھ حسنِ سلوک 183
- مغربی تہذیب کا المیہ 185
- زبان کے غلط استعمال کا معاشرے پر اثر 187
- رہبانیت خلافِ فطرت اور خلافِ دین ہے 188
- شادی بیاہ کے ضمن میں اصلاحی تحریک کا خلاصہ 189

◄ قرآن حکیم میں لفظ ''شہید'' کا استعمال 193
◄ بندۂ مؤمن کا نظریہ حیات 194
◄ خلافت راشدہ دوبارہ قائم نہیں ہوسکتی 195
◄ سیاسی وملی زندگی کے رہنما اصول 198
◄ کل روئے ارضی پر اللہ کا دین غالب آئے گا' (ان شاء اللہ) 199
◄ غزوۂ بدر..... یوم الفرقان 200
◄ صدیقین کے ایمان کی کیفیت 201
◄ تسلیم ورضا 202
◄ توکّل علی اللہ 204
◄ طبعی محبتوں کے ضمن میں احتیاط 205
◄ صبر کا قرآنی تصور 205
◄ ہجرت کس لیے؟ 206
◄ احتسابی نظام 207
◄ ''تسبیح'' کے معنی ومفہوم 208
◄ عظمتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم 209
◄ تکمیلِ نبوت ورسالت 210
◄ غور کیجیے! 211
◄ مال اور اولاد فتنہ ہیں 214
◄ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دور اندیشی کا شاہکار 215
◄ غور کیجیے' سمجھیے اور پھر عمل کیجیے 216
◄ غور کیجیے! 217
◄ غور کیجیے! 218

- انفاق فی سبیل اللہ 219
- تقویٰ کیا ہے؟ 220
- لفظ ایمان کی نحوی اور شرعی تعریف 221
- مذاہب عالم کی ایک بڑی غلطی 224
- غور کیجیے، سمجھیے اور حرز جان بنایئے! 227
- رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وفاداری کے تقاضے 228
- جذبۂ شکر کی انتہا 234
- ایمان بالرسالت کا خصوصی مقام 235
- عیب تلاش کرنے کی ممانعت 237
- غیبت کی ممانعت 238
- بندۂ مؤمن کا کام 239
- میری نصیحتیں 240

عرضِ مرتب

قارئینِ کرام! زیرِ نظر کتاب کے ذریعے میں آپ حضرات کی خدمت میں صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن و بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی تصنیفات و تالیفات سے ایسے چنیدہ اقتباسات اور پیراگراف پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں جن کی روشنی میں آپ محترم ڈاکٹر صاحب کے خیالات' نظریات اور افکار سے روشناس ہو سکیں گے۔

آپ جوں جوں ان صفحات کا مطالعہ کرتے جائیں گے تو یہ بات واضح ہو کر آپ کے قلوب و اذہان میں اجاگر ہوتی جائے گی کہ بانی تنظیم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے دل میں اللہ جل جلالہ کی عظمت و رفعت' اس کے کلام سے والہانہ عقیدت و محبت' اس کے انبیاء و رسل کا اتباع' اس کی شریعتِ مطہرہ کی اطاعت اور اس کے عطا کردہ نظام عدل و قسط کو کل روئے ارضی پر نافذ و غالب کرنے کی خواہش کتنی شدید ہے اور وہ اپنی اس خواہش کو محض ذاتی خواہش نہیں بلکہ دینِ اسلام کا ایک ''رکنِ رکین'' سمجھتے ہیں۔

اس حقیر و عاجز کو یہ گراں قدر سعادت حاصل رہی ہے کہ زندگی کے قریباً تیس ۳۰ سال آپؒ کی کشف برداری میں گزارے ہیں۔ اس ثلث صدی کے دوران آپؒ کا جو ''جذبہ عمل'' دیکھا ہے قلم و زباں اس کے اظہار و بیاں سے عاجز ہیں۔ آپؒ کو آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ کی روشنی میں اس مشن کی تکمیل اور کامیابی کا ''حق الیقین'' حاصل تھا۔

میں نے ایک دن آپؒ کو اپنے دفتر میں ایک خاص ''وجد'' کی حالت میں علامہ اقبال مرحوم کے یہ اشعار پڑھتے دیکھا ہے جو ان کے دلی جذبات کی غمازی کر رہے تھے وھو ھذا:

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہو گی ترنّم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

معزز قارئین! یہ کتاب جو آپ کے ہاتھوں میں ہے ''لف ونشر غیر مرتب'' کے زمرے کی کتاب ہے۔ یعنی ایسا نہیں کہ ایک عنوان کے تحت ایک بات مکمل کی گئی ہو۔ پھر دوسرا اور تیسرا عنوان ہو— بلکہ جو چیز سامنے آئی اس کو وہیں رکھ دیا گیا۔ یہ خطابی انداز ہے۔ ''قرآن حکیم'' بھی خطابی انداز میں مدون ہے اور ایک ''عاشقِ قرآن'' کے خیالات و نظریات وافکار کو میں نے اسی انداز میں مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ آپ حضرات کریں گے۔

زیرِنظر کتاب میں بعض اقتباسات بغیر کسی عنوان کے شائع کیے گئے ہیں' اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں ایسے غامض اور ہمہ جہت مضامین ہیں کہ کسی ایک جہت اور عنوان کا تعین میرے لیے ممکن نہیں رہا..... اس لیے قارئین پر چھوڑتا ہوں کہ ''تفہم وتدبر'' کے تحت ان صفحات کا مطالعہ فرمائیں۔

امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید صاحب مدظلہ کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری اس سعی کو بنظر استحسان قبول فرمایا اور مزید یہ کہ کتاب کی تقریظ تحریر فرمائی جس سے اس کتاب کی اہمیت دوچند ہوگئی ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ اس کتاب کی تیاری میں برادرم حافظ عاطف وحید مدظلہ بن حضرت ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ ان کے صحیح اور صائب مشوروں سے رہنمائی ملی ہے جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ رب کریم اس حقیر وادنیٰ کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائیں اور ''داعی قرآن'' کی دعوت کو عام فرمادیں۔ (آمین) وما ذلك على الله بعزيز!

شیخ رحیم الدین عفی عنہ
قرآن اکیڈمی لاہور

تقـــدیم

از : حافظ عاطف وحید

''اے میرے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار جس میں میرے ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں' مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی جانب بڑھایا اور اس طرح ہم نے دو تاریخی مقاموں دیو بند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا.....''۔ اور ''.....میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت ونقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت پر اس لیے لبیک کہا کہ میں اپنی گمشدہ متاع کو یہاں پانے کا امید وار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر الٰہی کی روشنی جھلک رہی ہے...''۔

(یہ الفاظ ہیں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیو بندی رحمۃ اللہ علیہ کے جو انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں خطاب کے دوران ادا کیے۔)

اور ''میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے' ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا' دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کیے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کے صورت میں اس کے معنی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے''۔

(دار العلوم دیو بند میں حضرت شیخ الہندؒ کا اکابر علماء کے اجتماع سے خطاب)

جناب شیخ الہندؒ کے مذکورہ بالا اقتباسات میں پیش کردہ احیائے دین کے ''پروگرام'' کی

واقعی اور سچی تعبیر کے لیے قیامِ پاکستان کے بعد اگر کسی ایک ''ہمہ جہت'' شخصیت کا ہیولہ نگاہوں میں آتا ہے تو وہ صرف ہمارے والدِ گرامی قدر محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ ہیں..... جو نہ تو معروف معنی میں ''ابلہ مسجد'' تھے اور نہ ہی پورے طور پر ''تہذیب کا فرزند''۔ جناب شیخ الہندؒ ہی کی طرح انہوں نے اُمت کی پستی اور زبوں حالی کی فکرمندی اور احیائے دین و دعوت رجوع الی القرآن میں اپنی پوری زندگی ایسے گھلا دی کہ گویا ایک موم بتی ہو..... جسے ایک نہیں بیک وقت دونوں سروں سے سُلگا دیا گیا ہو! احیائے دین کے جس عظیم مشن کا بیڑا انہوں نے اللہ کے فضل اور اسی کی تائید و نصرت کے بھروسے پر اپنی نوجوانی کی عمر میں اُٹھانے کا عزم کر لیا' اس کے تقاضے پورا کرتے کرتے زندگی کھپا دی' بلکہ گھلا دی..... وہ اس راستے میں آگے سے آگے ہی بڑھتے چلے گئے اور کبھی پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ بقول شاعر ؎

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریتِ جاں' راحتِ تن' صحتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی

اور بقولِ خود: ''ایک شاعر کے بقول ''ہم لوگ اقراری مجرم ہیں'' کے مصداق مجھے برملا اعتراف ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے جس کام کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینے کی توفیق عطا فرمائی ہے' اور جس کے لیے میں نے اپنے پیشۂ طب کو بھی خیر باد کہا ہے' وہ وہی ہے جس کی بیسویں صدی عیسوی میں پہلی بار نہایت زوردار دعوت دی تھی مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے..... اور جس کے لیے انہوں نے عملی جدوجہد کا آغاز بھی 'حزب اللہ' کے قیام کی صورت میں کر دیا تھا' لیکن جسے وہ بعض داخلی عوامل اور خارجی موانع کے باعث جلد ہی بددل ہو کر چھوڑ بیٹھے۔''

گرامی قدر والد صاحب رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے جس مشن اور دین کی خدمت کے لیے چن لیا تھا' اسی کے اعتبار سے صلاحیتوں اور قوائے طبعی سے بھی نوازا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے بارے میں خود فرماتے ہیں:

''چونکہ اللہ تعالیٰ نے مزاج کچھ ایسا دیا ہے اور آج سے نہیں بلکہ بچپن سے دیا ہے کہ جو بات حق معلوم ہو اس پر ڈٹے رہو..... میری عمر چوبیس برس کی تھی جب میں نے جماعت اسلامی کے سالانہ اجتماع منعقدہ ماچھی گوٹھ میں کھڑے ہو کر مولانا

سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم سے جماعت کے انقلابی طریقہ کار کو چھوڑ کر انتخابی طریق کار اختیار کرنے کی پالیسی سے ڈٹ کر اختلاف کیا تھا۔ مولانا مرحوم میرے والد کی عمر کے تھے' پھر میرے محسن بھی تھے' کہ ان کی تصانیف کے مطالعہ سے مجھے دین کا صحیح مفہوم اور ایک مسلمان کی دینی ذمہ داریوں کا شعور حاصل ہوا تھا' جس پر محکم یقین مطالعہ قرآن سے حاصل ہوا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک مزاج دیا ہے کہ جو بات سمجھ میں آتی ہے اس کا برملا اظہار کیا جائے۔ لہٰذا مولانا مودودی مرحوم کی انتخابی سیاست کے موقف پر میں نے جماعت اسلامی کا رکن رہتے ہوئے اپنا اختلافی موقف دلائل کے ساتھ تحریری شکل میں بھی پیش کیا اور ماچھی گوٹھ میں اسٹیج پر کھڑے ہو کر بھی..... اگر کوئی دلیل سے میری رائے اور میرے موقف کو غلط ثابت کر دے تب تو میں فوراً ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہوتا ہوں اور اپنی غلطی تسلیم کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا' لیکن اگر کوئی اسے دلیل سے غلط ثابت نہیں کرتا تو مجھے اس کی قطعی پرواہ نہیں ہوتی کہ میری بات کی کون مخالفت کر رہا ہے' کسے باشد۔ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے مجھے یہ مزاج دیا ہے۔ میں نے جہاں تک اپنے مزاج اور اپنی طبیعت کی گہرائی میں جا کر ٹٹولا ہے' probe کیا ہے' تو میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ الحمدللہ ثم الحمدللہ مجھ میں انانیت اور عجب نہیں ہے اور میں شعوری طور پر اپنے رب سے پناہ طلب کرتا رہتا ہوں کہ وہ مجھے اس روگ سے محفوظ رکھے۔ نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق عُجب مہلکات میں سے سب سے زیادہ مہلک اور شدید مرض ہے۔''

والد محترمؒ نے غلبہ و اقامت دین کی جدوجہد کے لیے تنظیم اسلامی قائم کی تو علماء ربانیین بالخصوص منتسبین حضرت شیخ الہندؒ کی سرپرستی اور تعاون کی شدید احتیاج کا اظہار فرمایا اور اس مقصد کے لیے علماء کرام و مشائخ عظام کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ اس ضمن میں آنجنابؒ نے ۱۹۸۵ء کے دوران ایبٹ آباد میں ایک مقتدر دینی و روحانی راہنما مولانا غلام النصیر چلاسی سے ملاقات فرمائی تو انہیں اپنے مزاج اور خیالات و نظریات کے جملہ پہلوؤں سے حد درجہ ہم آہنگ پایا۔ انہوں نے والد محترمؒ کے بارے میں اپنا تاثر بایں الفاظ بیان فرمایا:

''آپ کو دیکھ کر میرا یقین نبی اکرم ﷺ کی اس حدیث پر مزید گہرا ہو گیا ہے کہ میری امت میں ہمیشہ کم از کم ایک گروہ ضرور حق پر قائم رہے گا۔''

اس ملاقات کے بعد والد محترمؒ نے ان کی خدمت میں اپنی جملہ مطبوعات کا سیٹ ارسال فرمایا تو اس پر ان کا مندرجہ ذیل مکتوب گرامی موصول ہوا:

۱۰/اگست ۱۹۸۵ء

محترم ومکرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کے ارسال کردہ تمام کتب اور خط موصول ہوئے۔ فرصت کے اوقات میں آپ کے چند رسائل کا اجمالی جائزہ لیا' جس سے آپ کی تنظیم کا عزم مصمم کا بخوبی علم ہوا۔ آپ کے کتب ورسائل جو مجھے موصول ہو چکے ہیں لوگوں میں تقسیم کردوں گا تا کہ عامۃ الناس استفادہ کرسکیں۔ میں چند اپنی کتب آپ کو مطالعہ کے لیے پیش کرنا چاہتا تھا جو کہ دستیاب نہ ہوسکیں۔ ''تحائف قدسیہ'' اور ''ینابیع الحکمت'' بڑی ضخیم کتب تھیں' ابتداءً مطالعہ کے لیے بہتر تھیں۔ فی الحال جو کتابیں دستیاب ہیں ارسال خدمت ہیں جن کے بالترتیب مطالعہ سے آپ ہمارے عزائم کی کیفیت سے آگاہ ہوں گے۔ سب سے پہلے ''خیابانِ چلاسی'' کا مکمل مطالعہ کریں۔ پھر ''معدنِ توحید'' ''گنجینۂ معرفت'' اور ''گلدستہ عشاق''۔ دوسری کتب دستیاب ہونے پر یا دوسری ملاقات میں آپ کو دیں گے۔ چند حروفِ پریشاں بطور تحفہ درویشاں آپ کی خدمت میں بھیج رہے ہیں۔

بہ مطلب می رسی اسرارِ احمد
اگر محکم بگیری تارِ احمد

مرادِ احقر از محکم گرفتن
بود اخلاص در ہر کارِ احمد

صداقت حلِّ ہر یک مشکلے ہست
ہمی دانست یارِ غارِ احمد

دِگر عرض اینکہ از گفتار بگذر
بہ میدان آ بہ آن کردارِ احمد

امیدِ ماست باشی ابرِ نیساں
بہ کم مدت پئے گلزارِ احمد

خدایا آور آں ساعت کہ بینیم
دوبارہ گرم تر بازارِ احمد

بہ سعی ایں رجالِ پاک فطرت
بہ ہر جا تازہ کن آثارِ احمد

چلاسی را سر و مال است حاضر
برائے یاریٔ ہر یارِ احمد

فقط والسلام
منجانب: غلام النصیر چلاسی

قارئین کی سہولت کے لیے ان اشعار کا اردو ترجمہ بھی پیش کیا جا رہا ہے:

''اگر احمد مصطفیٰ ﷺ کا تار (پیغام/اسوہ) مضبوطی سے پکڑ لیں تو اسرار احمد آپ نے مقصود پا لیا۔

مضبوط پکڑنے سے احقر (چلاسی) کی مراد احمد مجتبیٰ ﷺ کے ہر کام میں اخلاص کا ہونا ہے۔

صداقت ہر مشکل کا حل ہے اور یارِ غارِ احمدؐ (ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) یہی سمجھتے تھے۔

میری دوسری گزارش یہ ہے کہ گفتار (زبانی جمع خرچ) کو چھوڑیے' میدان میں نکلیے کہ احمد مجتبیٰ ﷺ کا کردار یہی ہے۔

ہمیں اُمید اور خواہش ہے کہ آپ تھوڑے ہی عرصہ میں احمد مجتبیٰ ﷺ کے باغ کے لیے موسم بہار کی خوشگوار بارش بن جائیں۔

اے اللہ! وہ وقت لے آ کہ ہم احمد مجتبیٰ ﷺ کے بازار کی رونق اور چہل پہل دوبارہ دیکھ سکیں۔

ان پاک فطرت لوگوں کی جدوجہد کے ساتھ آپ ہر جگہ آثارِ احمدؐ (تعلیماتِ نبویؐ) تازہ فرما دیں۔

احمد مجتبیٰ ﷺ کے ہر دوست کی مدد کے لیے چلاسی کی جان بھی حاضر ہے اور مال بھی۔''

محترمی و محبی مولانا شیخ رحیم الدین صاحب کی ہمارے والد محترمؒ کے ساتھ لگ بھگ تیس برس پر محیط انتہائی قریبی رفاقت کی کیفیت یہ ہے کہ شیخ صاحب نے والد صاحبؒ کی حیات میں ہی نہیں دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی ان کی خدمت' تعاون اور وفا شعاری کا بھرپور

ثبوت دیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس پورے عرصہ کے دوران والدِ محترمؒ کے افکار کی کتابی شکل میں اشاعت اور اخبارات و رسائل میں عوامی تشہیر کا فوری اور بروقت اہتمام شیخ صاحب کی کاوشوں ہی کا مرہونِ منت ہے تو ہرگز مبالغہ نہ ہوگا!

زیرِ نظر کتاب والدِ محترم کی شائع شدہ کتب سے اُن اقتباسات کا مجموعہ ہے جو شیخ رحیم الدین صاحب کی نظر میں والد صاحبؒ کی علمی قدر و منزلت کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہو سکتے ہیں۔ راقم کو جب شیخ صاحب نے اس تالیف پر نظرِ ثانی کی دعوت دی تو راقم شیخ صاحب کے حسنِ انتخاب کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس لیے کہ ان میں سے ہر ہر اقتباس اس قابل ہے کہ اسے یاد کر لیا جائے اور والد صاحبؒ کے مشن کو سمجھنے اور اسے پھیلانے کا ذریعہ بنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ شیخ صاحب کی اس کاوش کو شرفِ قبول عطا فرمائے اور اسے ان کے حق میں توشۂ آخرت بنائے..... آمین!

(حافظ) عاطف وحید

انچارج شعبہ تحقیق اسلامی، قرآن اکیڈمی لاہور

۸/ جنوری ۲۰۱۳ء

پیش لفظ

از: حافظ عاکف سعید

زیر نظر کتاب' جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے' والد محترم' ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے دینی افکار و خیالات پر مشتمل ہے جو آج کے مسلمان کے لیے مشعل راہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہمارا دین زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے والا ہر قاری یہ محسوس کرے گا کہ اس میں پیش کردہ افکار بھی زندگی کے تقریباً تمام ہی گوشوں کا احاطہ کرتے ہیں۔

والد محترمؒ کی دلچسپی کا اصل موضوع قرآن تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے انہیں جہاں غیر معمولی فہم و فراست اور عقل و دانش کی بے بہا دولت عطا فرمائی تھی وہاں اعتدال و توازن کی نعمت سے بھی نوازا تھا۔ اسی طرح اگر ایک طرف قدرتِ کلام اور خطابت کا غیر معمولی ملکہ عطا فرمایا تھا' تو دوسری طرف قلم کے استعمال پر بھی بے پایاں دسترس عطا فرمائی تھی۔ ان کی فصاحت و بلاغت سے معمور تقاریر و خطابات کو اگر ابلاغ کی معراج قرار دیا جا سکتا ہے تو ان کی قلمی کاوشیں بلاشبہ ادبیت اور جامعیت کا خوبصورت مرقع ہوتی تھیں۔ اللہ نے انہیں وسعت مطالعہ کے ساتھ ساتھ حکمت و دانائی سے بھی نوازا تھا۔ فرمان الٰہی ہے: ﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو زندگی کے آخری سانس تک خدمت دین ہی کے میدان میں لگایا اور کھپایا ع یہ مرتبہ بلند ملا جس کو مل گیا! یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اللہ ربّ العزت نے انہیں اپنے دین کی خدمت اور بالخصوص پیغامِ قرآنی کے وسیع پیمانے پر ابلاغ و نشر و اشاعت کے لیے چن لیا تھا۔ ان کے

تمام خطابات وتقاریر اور مضامین وتصانیف بلاشبہ ایک عظیم علمی ورثہ کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کا یہ فیض ایک صدقۂ جاریہ کی شکل میں ان کی کتابوں' کتابچوں اور خطابات کے آڈیوز اور ویڈیوز کی صورت میں آج بھی جاری ہے اور ایک خلقت ہے جو ان سے استفادہ کر کے اپنے لیے علمی وعملی رہنمائی کا سامان کر رہی ہے۔

برادرم شیخ رحیم الدین صاحب نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ اور محبت وخلوص کے جذبات سے معمور ہو کر زیرِنظر کتاب کو مرتب کیا ہے۔ والد محترمؒ کے نہایت وسیع علمی ورثے کو جو جرائد (میثاق' حکمت قرآن' ندائے خلافت)' بے شمار مطبوعات اور لاتعداد خطابات کی صورت میں منتشر ہے' اپنے سامنے رکھتے ہوئے مختلف موضوعات پر والد محترمؒ کے افکار وخیالات سے ایسے اقتباسات کا چناؤ کیا ہے جو بے شمار علمی اُلجھنوں کو رفع کرنے اور ذہنی اشکالات کو سلجھانے کا موجب اور دین کے بنیادی تصورات کو دوٹوک انداز میں واضح کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ مزید برآں ان کے ذریعے ملی وقومی ہی نہیں' بین الاقوامی سیاست ومعاشرت اور عالمی معیشت کے اتار چڑھاؤ کے اسباب و علل کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے' جس سے قاری کا اُفق ذہنی وفکری وسعت پذیر ہوتا ہے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ برادرم رحیم الدین صاحب کی اس کاوش کو شرفِ قبول عطا فرمائے اور اس کتاب کو ہر اعتبار سے اشاعت خیر کا موجب بنا دے۔ آمین!

ایمان اور توکل

ایمان کا سب سے بڑا ثمرہ توکل ہے، یہ یقین کہ میرے لیے کچھ نہیں ہوگا جب تک اللہ کی توفیق شامل نہ ہو۔ اقامتِ دین کی جدوجہد کی راہ میں قدم بڑھانے والوں میں یہ وصف ہونا ضروری ہے۔ اگر اپنی ذہانت، اپنی فطانت، اپنی صلاحیت، اپنی منصوبہ بندی، اپنے زورِ بازو پر تکیہ ہے تو سمجھ لیجئے کہ قدم رکھنے سے پہلے ہی ناکام ہوگئے۔ اپنی قوت کی نفی کرنا یہ ہوگا کہ میرے کئے کچھ نہیں ہوسکتا۔ میں تو اللہ کی توفیق، اللہ کی تائید، اللہ کی نصرت کے بھروسہ پر اس راہ میں قدم رکھ رہا ہوں۔ توکل اُسی کی ذات پر ہے، اپنی ذات پر نہیں، اپنے علم پر نہیں، اپنے فہم پر نہیں، اپنی محنت پر نہیں، اپنی مشقت پر نہیں، اپنی کوشش پر نہیں۔ کسی شے پر کوئی بھروسہ نہ ہو، صرف اللہ پر یقین ہو۔ توکل کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہوتا جب تک کسی کام کے لیے تمام مادی اسباب ہونے کے باوجود بھی آپ کو یہ یقین نہ ہو کہ ان سے کچھ نہ ہوگا، بلکہ یقین یہ ہو کہ ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا۔ دیا سلائی آپ کے پاس ہے اور سوکھا کاغذ بھی ہے، آپ جانتے ہیں کہ دنیا کا جو قانونِ طبعی ہے اور جو مادی اسباب ہیں وہ رکاوٹ نہیں بن سکتے، آپ ماچس سے کاغذ جلا سکتے ہیں، لیکن پھر بھی آپ کو یقین ہونا چاہیے کہ میں نہیں جلا سکتا اگر اللہ نہ چاہے۔ اور اگر اللہ چاہے تو دیا سلائی کے بغیر بھی کاغذ جل جائے گا۔ یہ یقین اگر نہیں ہے تو ایمان نہیں ہے۔ پھر تو ایمان ہے مادی اسباب و وسائل پر جن پر آپ کا اعتماد، تکیہ اور توکل ہے۔ اگر مادی اسباب و وسائل پر آپ کو بھروسہ اور توکل ہے تو درحقیقت آپ مؤمن بالمادہ ہیں۔ آپ کا ایمان ہے مادہ پر اور مادی، عادی اور طبعی قوانین پر۔ جب کہ توحید یہ ہے کہ ''اللہ ہی وہ ذات ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، (کوئی کارساز نہیں) لہٰذا اہل ایمان پر لازم ہے کہ وہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔''

(توحید عملی)

رمضان: نزول قرآن کا سالانہ جشن

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ رمضان المبارک کے پروگرام کی دو شقیں ہیں: ایک دن کا روزہ اور دوسرے رات کا قیام اور اس میں قراءت و استماعِ قرآن! اور اگرچہ ان میں سے پہلی شق فرض کے درجے میں ہے اور دوسری بظاہر نفل کے، تاہم قرآنِ مجید اور احادیثِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام دونوں نے اشارۃً اور کنایۃً واضح فرمادیا کہ یہ ہے رمضان المبارک کے پروگرام کا جزوِ لاینفک! ------ چنانچہ قرآن نے وضاحت فرمادی کہ روزوں کے لیے ماہِ رمضان معین ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ اس میں قرآن مجید نازل ہوا تھا: ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوا۔'' گویا یہ ہے ہی نزولِ قرآن کا سالانہ جشن!

اور احادیث نے تو بالکل ہی واضح کر دیا کہ رمضان المبارک میں 'صیام' اور 'قیام' لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں: چنانچہ:۔

1۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے رمضان المبارک کی فضیلت کے ضمن میں جو خطبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا 'شعبُ الایمان' میں نقل کیا ہے، اُس کے الفاظ ہیں: ''اللہ نے قرار دیا اس میں روزہ رکھنا فرض اور اُس کا قیام اپنی مرضی پر۔''

2۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے روایت کیا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> ''روزہ اور قرآن بندۂ مومن کے حق میں سفارش کریں گے۔ روزہ کہے گا، اے رب! میں نے اسے روکے رکھا دن میں کھانے اور خواہشات سے، پس اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ اور قرآن کہے گا میں نے روکے رکھا اسے رات کو نیند سے، پس اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ تو دونوں کی سفارش قبول کی جائے گی۔''

(عظمت صوم)

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ

''راقم قرآن مجید کا مفسّر تو بہت دُور کی بات ہے' مروّجہ مفہوم کے اعتبار سے ''عالمِ دین'' ہونے کا بھی ہرگز کوئی دعویٰ نہیں ہے' تاہم' خالصتاً ''تحدیثاً لِلنّعمۃ'' (بفحوائے ''وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ'') اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کے اعتراف واظہار میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی کہ اس نے اپنے خاص فضل وکرم سے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ اوائل عمر ہی میں قرآنِ حکیم کے ساتھ ایک دلی اُنس اور ذہنی مناسبت قائم ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ اوّلاً بالکل ہی نوعمری میں (ہائی سکول کے ابتدائی سالوں کے دوران) علاّمہ اقبال کی شاعری کے ذریعے قرآن کی عظمت' ملّتِ اسلامی کی نشأۃِ ثانیہ کی امید اور اس کے ضمن میں قرآن کی اہمیت کا ایک گہرا نقش قلب پر قائم فرما دیا' پھر ایک خاندانی روایت کے مطابق ہائی سکول کی تعلیم کے دوران عربی کو ایک اضافی مضمون کی حیثیت سے اختیار کرنے کی صورت پیدا فرما دی جس سے عربی گرامر کی اساسات کا علم حاصل ہو گیا ـــــ اور پھر میٹرک کے امتحان کے بعد فراغت کے دنوں میں' جبکہ ۱۹۴۷ء کے مسلم کش فسادات کے نتیجے میں ہم لگ بھگ ایک ماہ قصبہ حصار (جواَب بھارت کی ریاست ہریانہ میں ہے) میں ہندوؤں کے حملوں سے دفاع کے لیے چند محلّوں پر مشتمل ایک دفاعی بلاک میں 'محصور' تھے' قرآن حکیم سے پہلے معنوی تعارف کی یہ صورت پیدا فرما دی کہ مجھے اور میرے بڑے بھائی اظہار احمد صاحب مرحوم کو ایک مسجد میں بیٹھ کر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' میں شائع ہونے والی تفسیرِ سورۂ یوسفؑ کے اجتماعی مطالعے اور اس پر باہمی مذاکرے کا موقع ملا' جس سے اندازہ ہوا کہ قرآن فصاحت و بلاغت کی معراج اور سرچشمۂ ہدایت ہی نہیں منبعِ

علم وحکمت بھی ہے' اور واقعتاً اِس لائق ہے کہ بہترین ذہنی وفکری صلاحیتوں کو اس کے علم وفہم کے حصول میں اس طور سے صرف کیا جائے کہ اوّلاً اس کے عمومی پیغام کو صحیح طور پر سمجھیں جو کہ علم وحکمت کے اس بحرِ زخّار کی سطح پر بالکل اسی طرح تیر رہا ہے جیسے کسی تیل بردار جہاز میں شکست وریخت کے باعث اس سے نکل کر بہنے والا تیل سطحِ سمندر پر تیر رہا ہوتا ہے' اور پھر اس کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کر کے اس کی تہہ سے اس کے فلسفہ وحکمت کے اصل موتیوں کو تلاش کریں!

الحمدللہ' ثم الحمدللہ' کہ یہ ان ہی امورِ ثلاثہ کے نتیجے کا ظہور تھا کہ جب تقسیم ہند کے وقت ایک سو ستر میل کا سفر (حصار تا ہیڈ سلیمانکی) پیدل قافلے کے ساتھ آگ اور خون کے دریا عبور کر کے پاکستان پہنچنا نصیب ہوا تو فوراً تحریکِ جماعتِ اسلامی کے ساتھ عملی وابستگی ہوگئی (جو اوّلاً اسلامی جمعیتِ طلبہ میں شمولیت کی صورت میں تھی' اور اس کے بعد جماعتِ اسلامی کی رکنیت کی شکل میں!) اور اس پورے دس سالہ عرصے کے دوران جمعیت اور جماعت کے اجتماعات میں ''درسِ قرآن'' کی ذمہ داری عموماً مجھ پر عائد ہوتی رہی۔ جسے بالعموم بہت استحسان کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا ـــــ اگرچہ میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ سامعین کی جانب سے یہ تحسین وتعریف اقبال کے اس شعر کے عین مطابق ہے کہ ؎

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے! شاعری کیا ہے!!

مزید برآں میں ہرگز اس کا دعویٰ بھی نہیں کرتا کہ میرے اس تعلّم وتدبّر قرآن کے ذوق وشوق میں روز افزوں اضافے میں اس خارجی پسندیدگی کی بنا پر پیدا ہونے والی' ہمت افزائی' کو سرے سے کوئی دخل حاصل نہیں تھا' لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں اپنے دروس کے لیے تیاری کے ضمن میں جو مطالعہ کرتا اور مختلف عربی اور اردو تفاسیر سے رجوع کرتا اور پھر اپنے ذاتی غور وفکر سے بھی کام لیتا تو اس کے نتیجے میں مجھ پر قرآن کی عظمت مزید منکشف ہوتی چلی گئی ـــــ اور اس قول کو ہرگز کسی مبالغے پر مبنی نہ سمجھا جائے کہ قرآن نے مجھے اپنا ''اسیر'' (possess) کر لیا۔ چنانچہ یہ اسی اسیری کا مظہر ہے کہ میں نے ۱۹۵۲ء ہی میں (بیس سال

کی عمر میں) میڈیکل ایجوکیشن کے عین وسط میں یہ شعوری فیصلہ کرلیا تھا کہ اب یہ طب کی تعلیم بھی اور طبابت کا پیشہ بھی' سب میری ترجیحات میں نمبر دو پر رہیں گے' اوّلین ترجیح خدمتِ قرآن حکیم اور خدمت دین متین کو حاصل رہے گی! اور پھر ۱۹۷۱ء میں قمری حساب سے چالیس سال کی عمر میں جب یہ محسوس ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل وکرم سے مجھ پر اپنی شانِ ''عَلَّمَ الْقُرْآنَ'' کے ساتھ ساتھ ''عَلَّمَهُ الْبَيَانَ'' کا بھی کسی درجے میں فیضان فرما دیا ہے تو اپنے پیشۂ طبابت کو بالکل خیر باد کہہ کر اپنے آپ کو ہمہ تن اور ہمہ وقت قرآنِ مبین اور دینِ متین کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔

مجھ پر اللہ تعالیٰ کا ایک خاص فضل وکرم اس اعتبار سے بھی ہوا کہ اس نے مجھے کسی ایک لکیر کا فقیر ہونے سے بچالیا ـــــ چنانچہ قرآن کے علم وفہم کے ضمن میں میرے استفادے کا حلقہ بہت وسیع بھی ہے ـــــ اور بعض اعتبارات سے تضادات کا حامل بھی! ـــــ میں نے اپنی ایک تالیف ''دعوت رجوع الی القرآن کا منظر اور پس منظر'' میں اس کی پوری تفصیل درج کر دی ہے کہ میرے علم وفہمِ قرآن کے ''حوض'' میں تفسیر قرآن کے چار سلسلوں کی نہروں سے پانی آتا رہا' جن پر پانچواں اضافہ میری تعلیم میں شامل علومِ طبیعیہ کے مبادیات کا علم تھا ـــــ پھر اللہ نے مجھے جو منطقی ذہن عطا فرمایا تھا اس کے ذریعے ان پانچ سلسلوں سے حاصل شدہ معلومات میں ''تجمیع وتوافق'' (Synthesis) قائم کیا۔ جس کی بنا پر بحمد اللہ میرے ''بیان القرآن'' کو ایک جامعیت حاصل ہوگئی۔ اور غالباً یہی اس کی مقبولیت کا اصل راز ہے۔[1] واللہ اعلم!

ایک مستند ''عالمِ دین'' نہ ہونے کے باوجود جس چیز نے مجھے درس وتدریسِ قرآن کی جرأت (بلکہ ٹھیٹھ مذہبی حلقوں کے نزدیک ''جسارت'') کی ہمت عطا فرمائی' وہ نبی اکرم ﷺ

---

(۱) اس ضمن میں ایک واقعے کا ذکر نامناسب نہیں ہوگا۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب میرے اور مولانا اصلاحی صاحب کے مابین کچھ نظریاتی اختلاف پیدا ہوگیا تھا ـــــ ایک صاحب جن کا نام ڈاکٹر انوار احمد بگوی تھا (جو صوبائی محکمہ صحت میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہے' اور غالباً اب ریٹائر ہو چکے ہوں گے) جو مولانا اصلاحی کے غایت درجہ معتقد تھے اور مجھ سے شدید اختلاف رکھتے تھے' انہوں نے ایک بار مجھ سے کہا کہ: ''یہ بات بہرحال ماننی پڑتی ہے کہ آپ کے درس سے بالکل خالی ہاتھ کوئی بھی نہیں اٹھتا' ہر شخص ضرور کچھ نہ کچھ لے کر اٹھتا ہے!''

کا یہ قولِ مبارک ہے کہ: ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً)) یعنی ''پہنچاؤ میری جانب سے خواہ ایک ہی آیت!'' (صحیح بخاریؒ اور اس کے علاوہ ترمذیؒ' احمدؒ اور دارمیؒ)۔ چنانچہ میرے نزدیک جن علومِ دینی کی تحصیل کو علماءِ کرام لازمی قرار دیتے ہیں وہ کسی کے ''مفتی'' بننے کے لیے تو لامحالہ لازمی ہیں' لیکن قرآن کے داعی اور مبلّغ بننے کے لیے ہرگز ضروری نہیں ہیں۔ اس لیے کہ قرآن کا پیغام اگرچہ تاقیامِ قیامت پوری نوعِ انسانی کے لیے تھا' تاہم اس کے اوّلین مخاطب تو ''اُمّی'' تھے ——— چنانچہ قرآن کے اصل پیغام کو اللہ تعالیٰ نے نہایت ''یسیر'' صورت میں' جیسے کہ پہلے عرض کیا گیا' ایک اتھاہ سمندر کی سطح پر تیرنے والے تیل کے مانند پیش کیا (یہی وجہ ہے کہ سورۃ القمر میں چار بار فرمایا گیا کہ: ﴿وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ ○﴾ یعنی ''ہم نے نصیحت و ہدایت کے لیے قرآن کو بہت آسان بنا دیا ہے' تو ہے کوئی جو اس سے تذکّر حاصل کرے!'')

قصہ مختصر ——— لاہور میں ۱۹۶۵ء سے میرے باضابطہ حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن قائم ہوئے تو اس کے نتیجے میں پہلے ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور قائم ہوئی' جس کی کوکھ سے ذیلی انجمنوں کا ایک سلسلہ برآمد ہوا (کراچی' ملتان' فیصل آباد' جھنگ' کوئٹہ' اسلام آباد' پشاور) پھر ۱۹۷۶ء میں لاہور میں قرآن اکیڈمی قائم ہوئی' اور اس کی 'بیٹیوں' کے طور پر کراچی' ملتان' فیصل آباد اور جھنگ میں بھی اکیڈمیاں وجود میں آئیں۔ ساتھ ہی پاکستان کے طول و عرض میں بڑے بڑے شہروں میں میرے درسِ قرآن کی محفلیں منعقد ہونے لگیں' پھر قرآنی تربیت گاہوں (جو ایک ہفتہ سے لے کر ایک مہینے تک کے عرصے پر محیط ہوتی تھیں) کا سلسلہ شروع ہوا —— ادھر لاہور میں سالانہ قرآن کانفرنسوں کا سلسلہ جاری ہوا اور پھر جب پاکستان ٹیلی ویژن پر یہ درس قرآن شروع ہوا تو اوّلاً الکتٰب' پھر الٓمّٓ' پھر نبی کامل (ﷺ) اور بالآخر ''الھُدیٰ'' کا ہفتہ وار پروگرام جو پورے پندرہ مہینے اس شان سے جاری رہا کہ ہفتے کے ایک ہی دن' ایک ہی وقت پر' پاکستان کے تمام ٹی وی سٹیشنوں سے نشر ہوتا تھا ——— تو اس زمانے میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کی بنا پر مجھے اپنے بارے میں وہ شدید اندیشہ لاحق ہو گیا تھا جس کا ذکر ایک حدیث میں آیا ہے کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد

فرمایا: ''کسی شخص کی تباہی کے لیے یہ بات کافی ہے کہ اس کی جانب انگلیاں اٹھنی شروع ہو جائیں!'' اس پر دریافت کیا گیا کہ: ''اگر یہ کسی خیر کی بنیاد پر ہو تو کیا تب بھی؟'' تو آپؐ نے فرمایا: ''ہاں تب بھی' اس لیے کہ اس سے انسان کے لغزش میں مبتلا ہونے (یعنی اس میں عُجب اور تکبّر جیسی ہلاکت خیز بیماریوں کے پیدا ہو جانے) کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے ـــــ اِلاّ یہ کہ اللہ کی رحمت شامل حال ہو!'' (اس حدیث کو محدّث ذہبیؒ نے حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت کیا ہے' اگرچہ اس کی روایت میں کسی قدر ضعف موجود ہے) اس لیے کہ اس زمانے میں فی الواقع کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ میں جدھر جاتا تھا لوگ ایک دوسرے کو اشاروں کے ذریعے میری طرف متوجہ کرتے تھے ـــــ یہ بھی اُس زمانے کی بات ہے کہ مجھ سے متعدد لوگوں نے تفسیر قرآن لکھنے کی فرمائش کی' اور ایک پبلشر نے تو بہت اصرار کیا کہ آپ ایک ترجمۂ قرآن ہی لکھ دیں ـــــ لیکن میں نے ہمیشہ اور سب سے یہی کہا کہ یہ میرا مقام نہیں ہے! ـــــ

اس دعوتِ قرآنی میں اگرچہ میرا زیادہ زور قرآن کے چیدہ چیدہ مقامات پر مشتمل مطالعۂ قرآن حکیم کے ایک منتخب نصاب کے درس پر رہا لیکن بحمد اللہ دو بار پورے قرآن مجید کا درس دینے کی سعادت بھی حاصل ہوئی' اگرچہ وہ سارا ٹیپ پر ریکارڈ شدہ موجود نہیں ہے!

اس دعوتِ قرآنی کا نقطۂ عروج یہ تھا کہ ۱۹۸۴ء (۱۴۰۴ھ) میں نمازِ تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمۂ قرآن کا آغاز ہوا۔ چنانچہ ہر چار رکعت تراویح سے قبل ان رکعتوں میں پڑھی جانے والی آیات کا ترجمہ اور مختصر تشریح بیان ہوتی تھی ـــــ پھر نماز میں ان کی سماعت ہوتی تھی' جس کے نتیجے میں' بعض لوگوں میں کم اور بعض میں زیادہ' وہ کیفیت پیدا ہو جاتی تھی جسے اقبال نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے کہ ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف!

اس عمل کے نتیجے میں نمازِ عشاء اور نمازِ تراویح کی تکمیل میں لگ بھگ چھ گھنٹے صرف ہوتے تھے ـــــ اور بحمد اللہ سامعین کا جوش و خروش اور ذوق و شوق دیدنی ہوتا تھا ـــــ اور ثم الحمد للہ کہ اب یہ سلسلہ پاکستان کے بہت سے مقامات پر میری صُلبی اور معنوی اولاد کے ذریعے

جاری ہے!

اس سلسلے میں دورۂ ترجمہ کا جو پروگرام ۱۹۹۸ء میں کراچی کی قرآن اکیڈمی کی جامع مسجد میں ہوا اس کی آڈیو ویڈیو ریکارڈنگ اعلیٰ معیار پر کی گئی تھی۔ چنانچہ یہ بحمداللہ آڈیو ویڈیو کیسٹوں اور C.D.s اور D.V.D.s اور ٹی وی چینلز کے ذریعے پوری دنیا میں نہایت وسیع پیمانے پر پھیل چکا ہے ـــــ اور اب اسے کتابی شکل میں بھی شائع کرنے کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے، جس کی پہلی جلد آپ کی خدمت میں حاضر ہے! اس کی طباعت واشاعت کے سلسلے میں انجمن خدام القرآن صوبہ سرحد کے صدر جناب ڈاکٹر اقبال صافی نے تاکید کا جو دباؤ مرکزی انجمن پر برقرار رکھا اور مالی تعاون بھی پیش کیا، اس کی بنا پر اس سے استفادہ کرنے والے ہر شخص پر ان کا یہ حق ہے کہ ان کے لیے دعائے خیر ضرور کریں۔''

قرآن حکیم کے بارے میں ہمارا عقیدہ

''قرآن حکیم کے متعلق اپنا عقیدہ ہم تین سادہ جملوں میں بیان کر سکتے ہیں:

۱) قرآن اللہ کا کلام ہے۔

۲) یہ محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا ہے۔

۳) یہ ہر اعتبار سے محفوظ ہے، اور کُل کا کُل مِن وعَن موجود ہے، اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔

یہ تین جملے ہمارے عقائد کی فہرست کے اعتبار سے، قرآن حکیم کے بارے میں ہمارے عقیدے پر کفایت کریں گے۔''

(بیان القرآن، جلد اول)

قرآن کریم کا اسلوب استدلال

''قرآن کے طالب علم کو جاننا چاہیے کہ قرآن کا اسلوبِ استدلال منطقی نہیں' فطری ہے۔انسان جس فلسفے سے واقف ہے اس کی بنیاد منطق ہے۔ چنانچہ ہمارے فلاسفہ اور متکلمین استخراجی منطق (Deductive Logic) سے اعتناء کرتے رہے ہیں' جبکہ قرآن مجید نے اسے سرے سے اختیار نہیں کیا۔ وقتی تقاضے کے تحت ہمارے متکلمین نے اسے اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن اس سے کوئی زیادہ فائدہ نہیں پہنچ پایا۔ ایمانی حقائق کو جب استخراجی منطق کے ذریعے سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تو یقین کم اور شک زیادہ پیدا ہوا۔ اس ضمن میں کانٹ کی بات حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے' لہٰذا علامہ اقبال نے بھی اپنے خطبات کا آغاز اسی حوالے سے کیا ہے۔ کانٹ نے حتمی طور پر ثابت کر دیا کہ کسی منطقی دلیل سے خدا کا وجود ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ منطق میں اللہ کی ہستی کے اثبات کے لیے ایک دلیل لائیں گے تو منطق کی دوسری دلیل اسے کاٹ دے گی۔ جیسے لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اسی طرح منطق' منطق کو کاٹ دے گی۔ قرآن نے اگرچہ کہیں کہیں منطق کو استعمال تو کیا ہے لیکن وہ بھی منطقی اصطلاحات میں نہیں۔ قرآن مجید کا اسلوبِ استدلال فطری ہے اور اس کا انداز خطابی ہے۔ جیسے ایک خطیب جب خطبہ دیتا ہے تو جہاں وہ عقلی دلائل دیتا ہے وہاں جذبات سے بھی اپیل کرتا ہے۔ اس سے اس کے خطبے میں گہرائی و گیرائی پیدا ہوتی ہے۔ ایک لیکچر میں زیادہ تر دارومدار منطق پر ہوتا ہے۔ یعنی ایسی دلیل جو عقل کو قائل کر سکے۔ لیکن شعلہ بیان خطیب انسان کے جذبات کو اپیل کرتا ہے۔ اس کو خطابی دلیل کہا جاتا ہے۔ یہی خطابی انداز اور استدلال قرآن نے استعمال کیا ہے۔

انسان کی فطرت میں کچھ حقائق موجود ہیں۔ قرآن کے پیشِ نظر ان حقائق کو ابھارنا مقصود ہے۔ یعنی انسان کو آمادہ کیا جائے کہ ع

''اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی!''

عقل اور منطق کا دائرہ تو بڑا محدود ہے۔ انسان اپنے اندر جھانکے تو اس کے اندر صرف

عقل ہی نہیں ہے' کچھ اور بھی ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

ہے ذوقِ تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل! تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے!

یہ جو اِس کے اندر ''کوئی اور'' شے بھی ہے' اسے اپیل کرنا ضروری ہے تاکہ انسان فطرت کی بنیاد پر اپنے اندر جھانکے اور محسوس کرے کہ ہاں یہ ہے! تاہم اس کے لیے کوئی منطقی دلیل بھی پیش کر دی جائے۔ تو یہ نورٌ علیٰ نور ہوگا۔ یہ ہے درحقیقت قرآن کا فطری طرزِ استدلال۔ بعض مقامات پر ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے قرآن اپنے مخاطب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ کہہ رہا ہے اور اسے توجہ دلا رہا ہے کہ ذرا غور کرو' سوچو' اپنے اندر جھانکو۔ جیسے سورۃ ابراہیم کی آیت ۱۰ میں فرمایا گیا: ﴿اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''کیا اللہ کی ہستی میں کوئی شک ہے جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے؟'' یہاں کوئی منطقی دلیل نہیں ہے' لیکن مخاطب کو دروں بینی پر آمادہ کیا جا رہا ہے کہ اپنے اندر جھانکو' تمہیں اپنے اندر ثبوت ملے گا' تمہیں اپنے اندر اللہ کی ہستی کی شہادت ملے گی۔ سورۃ الانعام کی آیت ۱۹ میں ارشاد ہوا: ﴿اَئِنَّکُمْ لَتَشْہَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰہِ اٰلِہَۃً اُخْرٰی ؕ﴾ ''کیا تم واقعی اس بات کی گواہی دے رہے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ بھی ہے؟'' یعنی تم یہ بات کہہ تو رہے ہو' لیکن ذرا سوچو تو سہی کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تمہاری فطرت اسے تسلیم کرتی ہے؟ اپنے باطن میں جھانکو' کیا تمہارا دل اس کی گواہی دیتا ہے؟ حالانکہ ظاہر ہے کہ وہ تو اِس کے مدعی تھے اور اپنے معبودانِ باطل کے لیے کٹ مرنے کو تیار تھے۔ اس خطابی دلیل کے پس منظر میں یہ حقیقت موجود ہے کہ تم جانتے ہو کہ یہ محض ایک عقیدہ (dogma) ہے جو چلا آ رہا ہے' تمہارے باپ دادا کی روایت ہے' اس کی حیثیت تمہارے نسلی اعتقادات (racial creed) کی ہے۔ قرآن مجید درحقیقت انسان کی فطرت کے اندر جو شے مضمر ہے اسی کو ابھار کر باہر لانا چاہتا ہے۔ چنانچہ قرآن کا اسلوبِ استدلال منطقی نہیں ہے' بلکہ فطری ہے۔ اس کو خطابی انداز کہا جائے گا۔''

(بیان القرآن' حصہ اول)

قرآن مجید کا موضوع

''کیا قرآن فلسفہ کی کتاب ہے؟ کیا یہ سائنس کی کتاب ہے؟ کیا یہ جیالوجی یا فزکس کی کتاب ہے؟ کس قسم کی کتاب ہے؟ تو پہلی بات یہ سمجھئے کہ قرآن کا موضوع ہے انسان ـــ لیکن انسان کی اناٹومی' اس کی فزیالوجی یا anthropology نہیں' بلکہ انسان کی ہدایت ۔ یہ ہدایت کا لفظ قرآن مجید کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ دیکھئے سورۃ البقرۃ کے شروع ہی میں فرمایا: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲﴾ پھر اس کے وسط میں ارشاد ہوا: ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ یعنی پوری نوعِ انسانی کے لیے ہدایت ۔ سورۂ یونس میں فرمایا: ﴿هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۵۷﴾۔ سورۂ لقمان میں فرمایا: ﴿هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۝۳﴾۔ سورۃ البقرۃ (آیت ۹۷) اور سورۃ النمل (آیت ۲) میں ﴿هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ جبکہ سورۂ آل عمران میں ﴿هُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۱۳۸﴾ اور سورۃ المائدۃ میں ﴿هُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۴۶﴾ کے الفاظ آئے ۔ معلوم ہوا کہ ''هُدًى'' کا لفظ قرآن حکیم کے لیے کثرت کے ساتھ آیا ہے۔ پھر یہ صرف نکرہ نہیں' ''ال'' کے ساتھ معرفہ بن کر بھی کئی جگہ آیا ہے۔ تین مرتبہ تو اس آیت مبارکہ میں آیا جو رسول اللہ ﷺ کے مقصدِ بعثت کو بیان کرتی ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (التوبۃ: ۳۳' الفتح: ۲۸' الصف: ۹) هُدًى نکرہ تھا' اَلْهُدٰى معرفہ ہو گیا۔ یعنی ہدایتِ کاملہ' ہدایتِ تامہ' ہدایتِ ابدی۔ اسی طرح سورۃ النجم میں فرمایا: ﴿وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ۝۲۳﴾۔ سورۃ الجن کا آغاز جنات کی ایک جماعت کے اس قول ﴿اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝۱﴾ سے ہوتا ہے۔ آگے چل کر الفاظ آتے ہیں: ﴿وَاِنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰى اٰمَنَّا بِهٖ﴾ (آیت ۱۳) گویا سورۃ الجن نے معین کیا کہ ''قُرْاٰنًا عَجَبًا'' اور ''اَلْهُدٰى'' مترادف الفاظ ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف میں آیا ہے: ﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى﴾ (بنی اسراءیل: ۹۴' الکہف: ۵۵)۔ ''کیا شے ہے جو لوگوں کو ایمان لانے سے روکتی ہے جبکہ اُن کے پاس الہدیٰ آیا ہے؟'' تو گویا قرآن کا موضوع ہے انسان کی ہدایت۔''

قرآن حکیم کی محفوظیت

''یہ مِن وعَن کُل کا کُل محفوظ ہے۔اس میں نہ کوئی کمی ہوئی ہے نہ کوئی بیشی ہوئی ہے۔ نہ کمی ہوسکتی ہے نہ بیشی ہوسکتی ہے۔ نہ کوئی تحریف ہوئی ہے نہ کوئی تبدیلی۔ یہ گویا ہمارے عقیدے کا جزوِ لاینفک ہے۔اس میں کچھ اشتباہ اہل تشیع نے پیدا کیا ہے' لیکن ان کی بات بھی میں کچھ یقین کے ساتھ اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ ان کا یہ قول بھی سامنے آتا ہے کہ ''ہم اس قرآن کو محفوظ مانتے ہیں''۔البتہ عوام میں جو چیزیں مشہور ہیں کہ قرآن سے فلاں آیات نکال دی گئیں' فلاں سورت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدح اور شان میں تھی' وہ اس میں سے نکال دی گئی وغیرہ' ان کے بارے میں مَیں نہیں کہہ سکتا کہ یہ ان میں سے عوام کالانعام کی باتیں ہیں یا ان کے اعتقادات میں شامل ہیں۔لیکن یہ کہ بہرحال اہل سنت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ یہ قرآن حکیم محفوظ ہے اور کُل کا کُل مِن وعَن ہمارے سامنے موجود ہے۔اس کے لیے خود قرآن مجید سے جو گواہی ملتی ہے وہ سب سے زیادہ نمایاں ہوکر سورۃ القیامۃ میں آئی ہے۔ فرمایا: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝۱۶ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝۱۷﴾ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ازراہِ شفقت فرمایا کہ ''آپ اس قرآن کو یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں۔اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے''۔آپؐ مشقت نہ جھیلیں' یہ ذمہ داری ہماری ہے کہ ہم اسے آپؐ کے سینہ مبارک کے اندر جمع کر دیں گے اور اس کی ترتیب قائم کر دیں گے' اس کو پڑھوا دیں گے۔جس ترتیب سے یہ نازل ہو رہا ہے اس کی زیادہ فکر نہ کیجیے۔اصل ترتیب جس میں اس کا مرتب کیا جانا ہمارے پیش نظر ہے' جو ترتیب لوحِ محفوظ کی ہے اسی ترتیب سے ہم پڑھوا دیں گے۔﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝۱۹﴾ پھر اگر آپ کو کسی چیز میں ابہام محسوس ہو اور وضاحت کی ضرورت ہو تو اس کی توضیح اور تدوین بھی ہمارے ذمہ ہے۔

یہ ساری ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لی ہے۔اگر ان آیات کو کوئی شخص قرآن مجید کی آیات مانتا ہے تو اس کو ماننا پڑے گا کہ قرآن مجید پورے کا پورا جمع ہے' اس کا کوئی حصہ ضائع نہیں ہوا۔صراحت کے ساتھ یہ بات سورۃ الحجر کی آیت ۹ میں مذکور ہے۔فرمایا: ﴿اِنَّا

نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۹﴾ ''ہم نے ہی اس ''الذکر'' کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔ یہ گویا ہمیشہ ہمیش کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے گارنٹی ہے کہ ہم نے اسے نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ اس حقیقت کو علامہ اقبال نے خوبصورت شعر میں بیان کیا ہے: ع

حرفِ اُو را ریب نے ' تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

''اس کے الفاظ میں نہ کسی شک وشبہ کا شائبہ ہے نہ ردّوبدل کی گنجائش۔ اور اس کی آیات کسی تاویل کی محتاج نہیں۔''

اس شعر میں تین اعتبارات سے نفی کی گئی ہے: (۱) قرآن کے حروف میں یعنی اس کے متن میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ مِن وعَن محفوظ ہے۔ (۲) اس میں کہیں کوئی تحریف ہوئی ہو' کہیں تبدیلی کی گئی ہو' قطعاً ایسا نہیں۔ (۳) کیا اس کی آیات کی الٹ سلٹ تاویل بھی کی جاسکتی ہے؟ نہیں! یہ آخری بات بظاہر بہت بڑا دعویٰ معلوم ہوتا ہے' اس لیے کہ تاویل کے اعتبار سے قرآن مجید کے معنی میں لوگوں نے تحریف کی' لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں اگر کہیں معنوی تحریف کی کوشش بھی ہوئی ہے تو وہ قطعاً درجۂ استناد کو نہیں پہنچ سکی' اسے کبھی بھی استقلال اور دوام حاصل نہیں ہوسکا' قرآن نے خود اس کو رد کر دیا۔ جس طرح دودھ میں سے مکھی نکال کر پھینک دی جاتی ہے' ایسی تاویلات بھی اُمت کی تاریخ کے دوران کہیں بھی جڑ نہیں پکڑ سکی ہیں اور اسی طرح نکال دی گئی ہیں۔ اس بات کی سند بھی قرآن میں موجود ہے۔ سورۂ حم السجدۃ کی آیت ۴۲ میں ہے: ﴿لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ﴿۴۲﴾ ''باطل اس (قرآن) پر حملہ آور نہیں ہوسکتا' نہ سامنے سے نہ پیچھے سے' یہ ایک حکیم وحمید کی نازل کردہ چیز ہے''۔

یہ بات سرے سے خارج از امکان ہے کہ اس قرآن میں کوئی تحریف ہو جائے' اس کا کوئی حصہ نکال دیا جائے' اس میں کوئی غیر قرآن شامل کر دیا جائے ـــــ سورۃ الحاقۃ کی یہ آیات ملاحظہ کیجئے جہاں گویا اس امکان کی نفی میں مبالغے کا انداز ہے:

﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ﴿۴۷﴾﴾

''(کوئی اور تو اس میں اضافہ کیا کرے گا) اگر یہ (ہمارے نبی محمد ﷺ) خود بھی (بفرضِ محال) اپنی طرف سے کچھ گھڑ کر اس میں شامل کر دیں تو ہم انہیں داہنے ہاتھ سے پکڑیں گے اور ان کی شہ رگ کاٹ دیں گے۔ پھر تم میں سے کوئی (بڑے سے بڑا محافظ ان کا حامی و مددگار) نہیں ہوگا کہ جو انہیں ہماری پکڑ سے بچا سکے۔''

یہاں تو محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی اس شدت کے ساتھ نفی کر دی گئی۔ کفار و مشرکین کی طرف سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ آپ اس قرآن میں کچھ نرمی اور لچک دکھائیں' یہ تو بہت rigid ہے' بہت ہی uncompromising ہے' بہرحال دنیا میں معاملات ''کچھ لو کچھ دو'' (give and take) سے طے ہوتے ہیں' لہٰذا کچھ آپ نرم پڑیں کچھ ہم نرم پڑتے ہیں۔ اس کے بارے میں فرمایا: ﴿وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ﴿۹﴾﴾ (القلم) ''وہ تو چاہتے ہیں کہ آپ کچھ ڈھیلے ہو جائیں تو یہ بھی ڈھیلے ہو جائیں گے''۔ اور سورۂ یونس میں ارشاد ہوا:

﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾﴾

''جب انہیں ہماری آیاتِ بیّنات سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے' کہتے ہیں کہ اس قرآن کے بجائے کوئی اور قرآن لائیے یا اس میں کچھ ترمیم کیجیے۔ (اے نبی! ان سے) کہہ دیجیے میرے لیے ہرگز ممکن نہیں ہے کہ میں اپنے خیال اور ارادے سے اس کے اندر کچھ تبدیلی کر سکوں۔ میں تو خود پابند ہوں اس کا جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔ اگر میں اپنے ربّ کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے۔''

یہ ہے قرآن مجید کی شان کہ یہ لفظاً' معناً' متناً کلی طور پر محفوظ ہے۔''

(بیان القرآن حصہ اول)

قرآن ''حبل اللہ'' ہے!

''جب ہم کہتے ہیں کہ قرآن ''حبل اللہ'' ہے تو اس کے کیا معنی ہیں؟ ''حَبل'' کے ایک معنی رسّی کے ہیں اور یہی اصل معنی ہیں۔ سورۃ اللّھب میں یہ لفظ آیا ہے: ﴿حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝۵﴾ یعنی مونج کی بٹی ہوئی رسّی۔ امام راغبؒ نے اس کی تعبیر کی ہے: ''استعیر للوصل ولکل ما یتوسل بہ الی شیء'' یعنی کسی شے سے جڑنے کے لیے اور جس شے سے جڑا جائے اس کے لیے استعارۃً یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ عہد' قول وقرار اور میثاق دو فریقوں کو باہم جوڑ دیتا ہے۔ چنانچہ یہ لفظ عہد کے معنی میں بھی آتا ہے' اور قرآن حکیم میں یہ ایسے عہد کے لیے آیا ہے جس سے کسی کو امن مل رہا ہو' حفاظت اور امان حاصل ہو رہی ہو۔ سورۂ آل عمران (آیت ۱۱۲) میں یہود کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ﴾

''یہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار ہی پڑی' سوائے اس کے کہ کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں' ان پر محتاجی اور کم ہمتی مسلط کر دی گئی ہے۔''

گویا خود اپنے بل پر' اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر' خود مختاری کی اساس پر اُن کے لیے عزت کا معاملہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ یہ قرآن مجید کی پیشین گوئی ہے اور موجودہ ریاست اسرائیل اس کا واضح ثبوت ہے۔ امریکہ اگر ایک دن کے لیے بھی اپنی حفاظت ہٹا لے تو اسرائیل کا وجود باقی نہیں رہے گا۔

قرآن مجید میں اہل ایمان سے فرمایا گیا ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ (آل عمران: ۱۰۳) ''اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو سب مل کر''۔ البتہ ''حبل اللہ'' کیا ہے؟ قرآن میں اس کی صراحت نہیں ہے۔ اور قرآن مجید میں جو بات پوری طرح واضح نہ ہو' مجمل ہو' اس کی تشریح اور تبیین رسول اللہ ﷺ کا فرضِ منصبی ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَاَنْزَلْنَآ

اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ﴾ (النحل:۴۴) ''اور ہم نے (اے نبیؐ) آپ کی طرف 'الذکر' نازل کیا' تاکہ جو چیز اُن کے لیے اتاری گئی ہے آپ اسے ان پر واضح کریں''۔ چنانچہ احادیث نبویؐ میں یہ صراحت موجود ہے کہ ''حبل اللہ'' قرآن مجید ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اَلَا وَاِنِّیْ تَارِكٌ فِیْكُمْ ثَقَلَیْنِ ' اَحَدُهُمَا كِتَابُ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ.....))

''آگاہ رہو! میں تمہارے مابین دو خزانے چھوڑے جا رہا ہوں' اُن میں سے ایک اللہ کی کتاب ہے' وہی حبل اللہ ہے.....''

قرآن حکیم کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث مروی ہے' جس میں الفاظ آئے ہیں: ((هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِیْنُ)) ''یہ (قرآن) ہی اللہ کی مضبوط رسّی ہے''۔ یہ روایت سنن ترمذی اور سنن دارمی میں موجود ہے۔ مزید برآں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جو روایت رزین میں آئی ہے اس میں بھی یہی الفاظ ہیں: ((هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِیْنُ)) ''یہ (قرآن) ہی اللہ کی مضبوط رسی ہے''۔ سنن دارمی میں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ حَبْلُ اللّٰهِ وَالنُّوْرُ الْمُبِیْنُ)) ''یقیناً یہ قرآن حبل اللہ اور نورِ مبین ہے''۔

قرآن کو 'رسّی' کس اعتبار سے کہا گیا ہے' اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو بندہ اس رسّی کے ذریعے اللہ سے جڑتا ہے۔ یہ رسی ہمیں اللہ سے جوڑنے والی ہے۔ ''تعلق مع اللہ'' اور ''تقرب الی اللہ'' دونوں تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔ تعلق کے معنی ہیں لٹک جانا۔ ''علق'' لٹکی ہوئی شے کو کہتے ہیں۔ ''تعلق مع اللہ'' کا مفہوم ہوگا اللہ سے لٹک جانا' یعنی اللہ سے چمٹ جانا' اللہ کے ساتھ جڑ جانا۔ اسی طرح ''تقرب الی اللہ'' کا مطلب ہے اللہ سے قریب سے قریب تر ہونے کی کوشش کرنا۔ سلوک اور طریقت کا مقصد یہی ہے۔ تعلق مع اللہ میں اضافے اور تقرب الی اللہ کا مؤثر ترین اور سہل ترین ذریعہ قرآن حکیم ہے۔

اس اعتبار سے دو حدیثیں ملاحظہ کیجیے۔ ایک کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعود

ﷺ ہیں۔ حدیث کے الفاظ ہیں:((اَلْقُرْآنُ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَاءِ اِلَی الْاَرْضِ)) ''یہ قرآن اللہ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ہے''۔یہی الفاظ حضرت زید بن ارقم ﷺ سے مرفوعاً بھی روایت کیے گئے ہیں۔یعنی اگر اللہ سے جڑنا ہے' اللہ سے تعلق قائم کرنا ہے تو اس قرآن کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو' اس سے تم اللہ سے جڑ جاؤ گے' اللہ کا قرب حاصل کرلو گے۔

دوسری معجم کبیر طبرانی کی بڑی پیاری روایت ہے۔اس میں اِن الفاظ میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ حضور ﷺ اپنے حجرے سے برآمد ہوئے تو آپؐ نے مسجد کے گوشے میں دیکھا کہ کچھ صحابہ ﷺ قرآن کا مذاکرہ کر رہے تھے' قرآن کو سمجھ اور سمجھا رہے تھے۔حضور ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اور بڑا پیارا سوال کیا: ((اَلَسْتُمْ تَشْهَدُوْنَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاَنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ؟)) ''کیا تم اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے؟'' صحابہ ﷺ کا جواب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا: ''بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰهِ!'' یعنی ''کیوں نہیں اے اللہ کے رسول ﷺ' ہم اس کے گواہ ہیں! اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَاسْتَبْشِرُوْا فَاِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ طَرَفُهٗ بِاَیْدِیْکُمْ وَطَرَفُهٗ بِیَدِ اللّٰهِ)) ''پس تم خوشیاں مناؤ' اس لیے کہ یہ قرآن وہ شے ہے جس کا ایک سرا تمہارے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے''۔اِن احادیث مبارکہ سے ''حبل اللہ'' کا یہ تصور واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اللہ کے ساتھ جوڑنے والی شے ہے۔

ابھی ہم نے جس حدیث کا مطالعہ کیا اس میں قرآن حکیم کے لیے ''جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ'' کے الفاظ آئے ہیں' کہ یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے۔مستدرک حاکم اور مراسیل ابی داؤد میں حضرت ابوذر غفاری ﷺ سے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث نقل ہوئی ہے:((اِنَّکُمْ لَا تَرْجِعُوْنَ اِلَی اللّٰهِ بِشَیْءٍ اَفْضَلَ مِمَّا خَرَجَ مِنْهُ یَعْنِی الْقُرْآنَ)) یعنی تم لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اس کے یہاں تقرب اس چیز سے بڑھ کر کسی اور چیز سے حاصل نہیں کر سکتے جو خود اُسی (اللہ تعالیٰ) سے نکلی ہے' یعنی قرآن مجید۔درحقیقت قرآن چونکہ اللہ کا کلام ہے اور کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے' تو اس سے بڑھ کر قریب ہونے کا کوئی اور ذریعہ ہو ہی نہیں

سکتا۔ چنانچہ جب کوئی شخص قرآن پڑھتا ہے تو گویا وہ اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ تبع تابعین کے دَور کی شخصیت ہیں۔ انہوں نے اپنا معمول بنالیا تھا کہ سال میں چھ مہینے سرحدوں پر جہاد میں شریک ہوتے۔ اُس دَور میں دارالاسلام کی سرحدیں بڑھ رہی تھیں اور اس کے لیے جہاد جاری تھا۔ جبکہ چھ مہینے آپؒ گھر پر گزارتے اور اِس عرصے میں لوگوں سے ملنے جلنے سے حتی الامکان گریز کرتے۔ صرف نماز باجماعت کے لیے مسجد میں آتے' باقی وقت گھر پر ہی رہتے۔ کسی نے کہا کہ عبداللہ! آپ تنہائی پسند ہو گئے ہیں' تنہائی سے آپ کی طبیعت اکتاتی نہیں؟ انہوں نے فرمایا: ''کیا تم اُس شخص کو تنہا سمجھتے ہو جو اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہوتا ہے؟'' لوگ حیران ہوئے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ جب اس کی وضاحت طلب کی گئی تو فرمایا کہ دیکھو جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو قرآن پڑھتا ہوں یا حدیث پڑھتا ہوں۔ جب قرآن پڑھتا ہوں تو اللہ سے ہم کلام ہوتا ہوں اور جب حدیث پڑھتا ہوں تو رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہوتا ہوں۔ تم مجھے تنہا نہ سمجھو۔

دیوانۂ چمن کی سیریں نہیں ہیں تنہا
عالم ہے اِن گلوں میں' پھولوں میں بستیاں ہیں!

مسند احمد' ترمذی' ابوداؤد' نسائی' ابن ماجہ اور صحیح ابن حبان میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے یہ حدیث نبویؐ منقول ہے:

((يُقَالُ لِصَاحِبِ الْقُرْآنِ اقْرَأْ وَارْتَقِ وَرَتِّلْ كَمَا كُنْتَ تُرَتِّلُ فِي الدُّنْيَا فَإِنَّ مَنْزِلَكَ عِنْدَ آخِرِ آيَةٍ تَقْرَأُهَا))

''(قیامت کے دن) صاحب قرآن سے کہا جائے گا کہ قرآن شریف پڑھتا جا اور (جنت کے درجات پر) چڑھتا جا' اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھتا تھا۔ پس تیرا مقام وہی ہے جہاں آخری آیت پر پہنچے''۔

لیکن واضح رہے کہ صاحب قرآن سے مراد صرف حافظ قرآن یا ہمارے ہاں پائے جانے والے قاری نہیں ہیں' بلکہ وہ حافظ اور قاری مراد ہیں جو قرآن کے علم و حکمت سے بھی واقف ہیں' اس کو پڑھتے بھی ہیں اور اس پر عمل پیرا بھی ہیں۔ جنت میں اس قرآن کے ذریعے ان

کے درجات میں ترقی ہوتی چلی جائے گی اور ان کا آخری مقام وہاں معین ہوگا جہاں ان کا سرمایۂ قرآن ختم ہوگا۔ تو واقعہ یہ ہے کہ تقرب الی اللہ اور وصل الی اللہ کا مؤثر ترین ذریعہ قرآن حکیم ہی ہے۔ میں نے اسی لیے امام راغبؒ کے الفاظ کا حوالہ دیا تھا کہ ''حبل'' کا لفظ وصل کے لیے استعارۃً استعمال ہوتا ہے اور یہ ہر اُس شے کے لیے استعمال ہوگا جس کے ذریعے کسی شے کے ساتھ جڑا جائے۔ اس معنی میں حبل اللہ قرآن مجید ہے۔

اگر پیراشوٹ کی مثال سامنے رکھیں تو جملہ ایمانیات اس قرآن کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں جس طرح پیراشوٹ کی چھتری کی رسیاں نیچے آ کر ایک جگہ جڑ جاتی ہیں۔ جب پیراشوٹ کھلتا ہے تو اس کی چھتری کس قدر وسیع ہوتی ہے' لیکن اس کی ساری رسیاں ایک جگہ آ کر جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر ایمانیات کے جتنے بھی شعبے ہیں وہ سب کے سب قرآن کے ساتھ منسلک ہیں۔ چنانچہ قرآن پر یہ یقین مطلوب ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے' بلکہ اس کا منبع اور سرچشمہ وہی ہے جو میری روح کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ یہ کلام بھی ذاتِ باری تعالیٰ ہی سے صادر ہوا ہے اور میری روح بھی اللہ ہی کے امرِ کُن کا ظہور ہے۔ اس انداز سے قرآن پر یقین' اللہ تعالیٰ پر یقین اور قرآن لانے والے محمد رسول اللہ ﷺ پر یقین مطلوب ہے۔ (''حقیقت ایمان'' کے موضوع پر میری پانچ تقاریر میں یہ مضمون آ چکا ہے)۔

ایک ایمان تو تقلیدی ہے' یعنی غیر شعوری ایمان' کہ ایک یقین کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے' چاہے وہ علیٰ وجہ البصیرت نہ ہو' اور وہ بھی بہت بڑی دولت ہے' لیکن اس سے کہیں زیادہ قیمتی ایمان وہ ہے جو علیٰ وجہ البصیرت ہو۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ﴾ (یوسف:۱۰۸) ''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے کہ یہ میرا راستہ ہے' میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں سمجھ بوجھ کر اور جو میرے ساتھ ہیں (وہ بھی)''۔ علیٰ وجہ البصیرت ایمان یعنی شعوری ایمان' اکتسابی ایمان اور حقیقی ایمان کا واحد منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ مولانا ظفر علی خان بہت ہی سادہ الفاظ میں ایک بہت بڑی حقیقت بیان کر گئے ہیں ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکان فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

عاقل یعنی غور وفکر کرنے والے اور سوچ بچار کرنے والے کے لیے ایمان کا منبع وسرچشمہ صرف قرآنِ حکیم ہے۔

قرآن حکیم کے ''حبل اللہ'' ہونے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ اہل ایمان کو جوڑنے والی رسّی' ان کو باہم ایک دوسرے سے باندھ دینے والی شے' ان کو بنیانِ مرصوص بنانے والی چیز یہ قرآن ہے۔ اس لیے کہ قرآن حکیم میں جہاں اللہ کی رسّی کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کا حکم آیا ہے وہاں اس کے ساتھ ہی باہم متفرق ہونے سے روکا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ ''اور مضبوطی سے تھام لو اللہ کی رسّی کو سب مل جل کر اور تفرقہ مت ڈالو!'' اہل ایمان کو جوڑنے والی اور بنیانِ مرصوص بنانے والی رسی یہی قرآن حکیم ہے۔ اس لیے کہ انسانی اتحاد وہی مستحکم اور پائیدار ہوگا جو فکر ونظر کی ہم آہنگی کے ساتھ ہو۔ بہت سے اتحاد وقتی طور پر وجود میں آجاتے ہیں۔ جیسے کچھ سیاسی مصلحتیں ہیں تو اتحاد قائم کر لیا' کوئی دنیاوی مفادات ہیں تو ان کی بنا پر اتحاد قائم کر لیا۔ یہ اتحاد حقیقی نہیں ہوتے اور نہ ہی پائیدار اور مستحکم ہوتے ہیں۔ انسان حیوانِ عاقل ہے۔ یہ سوچتا ہے' غور کرتا ہے' اس کے نظریات ہیں' اس کے کچھ اہداف و مقاصد ہیں' کوئی نصب العین ہے۔ نظریات' مقاصد اور نصب العین کا بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ تو جب تک ان میں ہم آہنگی نہ ہو کوئی اتحاد پائیدار اور مستحکم نہیں ہوگا۔ اس اعتبار سے اللہ کی اس رسّی کو مضبوطی سے تھامو گے تو گویا دو رشتے قائم ہو گئے۔ ایک رشتہ اہل ایمان کا اللہ کے ساتھ اور ایک رشتہ اہل ایمان کا ایک دوسرے کے ساتھ۔ جیسے کُل شریعت کو تعبیر کیا جاتا ہے کہ شریعت نام ہے حقوق اللہ اور حقوق العباد کا۔ اللہ کے ساتھ جوڑنے والی سب سے بڑی عبادت نماز ہے اور بندوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے والی شے زکوٰۃ ہے۔ اسی طرح حبل اللہ ایک طرف اہل ایمان کو اللہ سے جوڑ رہی ہے اور دوسری طرف اہل ایمان کو آپس میں جوڑ رہی ہے۔ یہ انہیں بنیانِ مرصوص اور ''کَجَسَدٍ وَّاحِدٍ'' بنا دینے والی شے ہے۔ یہی وہ بات ہے جسے علامہ اقبال نے انتہائی خوبصورتی سے کہا ہے:۔

قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت

اس ضمن میں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت کیا ہے۔ یاد رکھیے کہ ثبوت دو قسم کے ہوتے ہیں' خارجی اور داخلی۔ خارجی ثبوت خود محمد رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمانا ہے کہ یہ کلام مجھ پر نازل ہوا۔ پھر آپ ﷺ کی شہادت بھی دو حیثیتوں سے ہے۔ آپ ﷺ کی شخصاً شہادت زیادہ نمایاں اُس وقت تھی جب کہ قرآن نازل ہوا اور حضور ﷺ خود موجود تھے۔ وہ لوگ بھی وہاں موجود تھے جنہوں نے آپ ﷺ کی چالیس سالہ زندگی کا مشاہدہ کیا تھا' جنہیں کاروباری شخصیت کی حیثیت سے آپؐ کے معاملات کا تجربہ تھا۔ جن کے سامنے آپ ﷺ کی صداقت' دیانت' امانت اور ایفائے عہد کا پورا نقشہ موجود تھا۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر جن کے سامنے چہرۂ محمدیؐ موجود تھا۔ سلیم الفطرت انسان آپ ﷺ کا روئے انور دیکھ کر پکار اٹھتا تھا کہ سُبْحَانَ اللّٰهِ مَا هٰذَا بِوَجْهِ كَذَّابٍ (اللہ پاک ہے' یہ چہرہ کسی جھوٹے کا ہو ہی نہیں سکتا)۔ تو حضور ﷺ کی شخصیت' آپؐ کی ذات اور آپؐ کی شہادت کہ یہ قرآن مجھ پر نازل ہوا' سب سے بڑا ثبوت تھا۔

اس اعتبار سے یاد رکھیے کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ اور قرآن باہم ایک دوسرے کے شاہد ہیں۔ قرآن محمد ﷺ کی رسالت پر گواہی دیتا ہے: ﴿يٰسٓ ① وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ② اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ③﴾ قرآن گواہی دے رہا ہے کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت ذاتِ محمدیؐ ہے۔ اس کا ایک پہلو تو وہ ہے کہ

نزولِ قرآن کے وقت رسول اللہ ﷺ کی ذات' آپؐ کی شخصیت' آپؐ کی سیرت و کردار' آپؐ کا اخلاق' آپؐ کا وجود' آپؐ کی شبیہ اور چہرہ سامنے تھا۔ دوسرا پہلو جو دائمی ہے اور

آج بھی ہے وہ حضور ﷺ کا وہ کارنامہ ہے جو تاریخ کی اَن مٹ شہادت ہے۔ آپ ایچ جی ویلز، ایم این رائے یا ڈاکٹر مائیکل ہارٹ سے پوچھیں کہ وہ کتنا عظیم کارنامہ ہے جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے سرانجام دیا۔ اور آپؐ خود کہہ رہے ہیں کہ میرا آلۂ انقلاب قرآن ہے، یہی میرا اسلحہ اور اصل طاقت ہے، یہی میری قوت کا سرچشمہ اور میری تاثیر کا منبع ہے۔ اس سے بڑی گواہی اور کیا ہوگی؟ یہ تو قرآن کے منزل من اللہ ہونے کی خارجی شہادت ہے۔ یعنی ''حضورؐ کی شخصیت''۔ شہادت کا یہ پہلو حضور ﷺ کے اپنے زمانے میں اور آپ ﷺ کی حیاتِ دنیاوی کے دوران زیادہ نمایاں تھا۔ اور جہاں تک آپؐ کے کارنامے کا تعلق ہے اس پر تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ دیکھیے مائیکل ہارٹ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ کہنے پر مجبور ہوا ہے:

"He was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels."

یعنی تاریخ انسانی میں صرف وہی واحد شخص ہیں جو سیکولر اور مذہبی دونوں میدانوں میں انتہائی کامیاب رہے اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ تو خارجی ثبوت گویا بتمام وکمال حاصل ہوگیا۔

قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا داخلی ثبوت یہ ہے کہ انسان کا دل گواہی دے۔ داخلی ثبوت انسان کا اپنا باطنی تجربہ ہوتا ہے۔ اگر ہزار آدمی کہیں چینی میٹھی ہے مگر آپ نے نہ چکھی ہو تو آپ کہیں گے کہ جب اتنے لوگ کہہ رہے ہیں میٹھی ہے تو ہوگی میٹھی۔ ظاہر ہے ایک ہزار آدمی مجھے کیوں دھوکہ دینا چاہیں گے، یقیناً میٹھی ہوگی۔ لیکن ''ہوگی'' سے آگے بات نہیں بڑھتی۔ البتہ جب انسان چینی کو چکھ لے اور اس کی اپنی حِسِّ ذائقہ بتا رہی ہو کہ یہ میٹھی ہے تو اب ''ہوگی'' نہیں ''ہے''۔ ''ہوگی'' اور ''ہے'' میں درحقیقت انسان کے ذاتی تجربے کا فرق ہے۔ افسوس یہ ہے کہ آج کی دنیا صرف خارجی تجربات کو جانتی ہے۔ ایک تجربہ اس سے کہیں زیادہ معتبر ہے اور وہ باطنی تجربہ ہے، یعنی کسی شے پر آپ کا دل گواہی دے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

تو عرب ہو یا عجم ہو تیرا لا الٰہ الّا
لغتِ غریب' جب تک تیرا دل نہ دے گواہی!

لا الٰہ الّا اللہ کے لیے اگر دل نے گواہی نہ دی تو انسان خواہ عربی النسل ہو' عربی زبان جانتا ہو' لیکن اس کے لیے یہ کلمہ لغتِ غریب ہی ہے' نامانوس سی بات ہے' اس کے اندر پیوست نہیں ہے' اس کو متاثر نہیں کرتی۔ قرآن انسان کی اپنی فطرت کو اپیل کرتا ہے اور انسان کو اپنے من میں جھانکنے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے اپنے من میں جھانکو' دیکھو تو سہی' غور تو کرو: اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ؟ کیا تمہیں اللہ کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے؟ اَئِنَّکُمْ لَتَشْھَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰہِ اٰلِھَۃً اُخْرٰی؟ کیا تم واقعتاً یہ گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ ہی میرے دل میں ہے!

علامہ ابن قیمؒ نے اس کی بڑی خوبصورت تعبیر کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جب قرآن پڑھتے ہیں تو یوں محسوس کرتے ہیں کہ وہ مصحف سے نہیں پڑھ رہے بلکہ قرآن اُن کے لوحِ قلب پر لکھا ہوا ہے' وہاں سے پڑھ رہے ہیں۔ گویا فطرتِ انسانی کو قرآن مجید کے ساتھ اتنی ہم آہنگی ہو جاتی ہے۔

ہمارے دَور کے ایک صوفی بزرگ کہا کرتے ہیں کہ روحِ انسانی اور قرآن حکیم ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ جیسے ایک گاؤں کے رہنے والے ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور باہم انسیت محسوس کرتے ہیں ایسا ہی معاملہ روحِ انسانی اور قرآن حکیم کا ہے۔ قرآن کو پڑھ کر اور سن کر روحِ انسانی محسوس کرتی ہے کہ اس کا منبع اور سرچشمہ وہی ہے جو میرا ہے۔ جہاں سے میں آئی ہوں یہ کلام بھی وہیں سے آیا ہے۔ یقیناً اس کلام کا منبع اور سرچشمہ وہی ہے جو میرے وجود' میری ہستی اور میری روح کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ یہ ہم آہنگی ہے جو اصل باطنی تجربہ بن جائے تب ہی یقین ہوتا ہے کہ یہ کلام واقعتاً اللہ کا ہے۔

(بیان القرآن جلد اوّل)

اسلام اور مغرب

''.....فطرت کی تسخیر شدہ قوتوں سے مسلح ہو کر مغرب جب مشرق پر حملہ آور ہوا تو دیکھتے ہی دیکھتے ایک سیلاب کے مانند پورے کرۂ ارضی پر چھا گیا اور مشرقی اقوام اور ان کی عظیم حکومتیں اور سلطنتیں اس سیلاب میں ریت کے کچے گھروندوں کی طرح بہتی چلی گئیں۔ اس سیلاب کا اوّلین شکار چونکہ مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ تھے جہاں مسلمان آباد تھے لہٰذا اس کی سخت ترین یورش اسلام اور اہل اسلام پر ہوئی اور چند ہی سالوں کے اندر اندر پورا عالم اسلام یورپ کے زیر نگین ہو گیا۔

عالمِ اسلام پر مغرب کا یہ استیلاء دو گونہ تھا۔ یعنی عسکری و سیاسی بھی اور ذہنی و فکری بھی۔ لیکن یورپ کی اوّلین اور نمایاں ترین یورش چونکہ سیاسی تھی لہٰذا عالم اسلام میں جو ردِ عمل اس کے خلاف پیدا ہوا اس میں بھی اولاً اسی کا احساس غالب نظر آتا ہے۔ ملت اسلامی کے اس تلخ احساس نے کہ یورپ نے کہیں براہ راست تسلط اور قبضے اور کہیں انتداب و تحفظ و حمایت کے پردے میں اسے اپنا محکوم بنا لیا ہے اور اسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اس کی وحدتِ ملّی کو پارہ پارہ کر دیا ہے' بار ہا دردانگیز نالوں کی صورت اختیار کی اور اپنے شاندار ماضی کی حسرت بھری یاد' اپنی ''عمرِ رفتہ'' اور عظمت و سطوتِ گزشتہ کے بازیافت کی شدید تمنا اور ''گردشِ ایام'' کو پیچھے کی طرف لوٹانے کی بے پناہ خواہش نے کبھی سید جمال الدین افغانی کی سیماب وش شخصیت کا روپ دھارا اور کبھی تحریک خلافت کی صورت اختیار کی لیکن حقائق نے ہر بار جذبات و خواہشات کا منہ چڑایا اور مغرب کی سیاسی بالادستی رفتہ رفتہ ایک تسلیم شدہ واقعہ کی صورت اختیار کرتی چلی گئی۔

اپنے سیاسی تسلط کو مستحکم کرتے ہی یورپ نے دنیائے اسلام میں اپنے افکار و نظریات کا پرچار اور اپنے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی تبلیغ.....یعنی ذہنی و فکری تسخیر کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ نگاہیں مغرب کی مادی ترقی سے پہلے ہی خیرہ ہو چکی تھیں۔ پھر زندہ قوموں میں ہمیشہ کچھ بنیادی انسانی اوصاف لازماً موجود ہوتے ہیں۔ کچھ ان کی بنا پر مرعوبیت میں اضافہ ہوا۔ نتیجتاً ایک مرعوب اور شکست خوردہ ذہنیت کے ساتھ مسلمانانِ عالم کے سوادِ اعظم نے مغربی افکار و نظریات کو جوں کا توں قبول کرنا اور حرزِ جاں بنانا شروع کر دیا.....خالص فلسفہ و عمرانیات کے میدان میں تو چونکہ خود مغرب میں بے شمار مکاتبِ فکر موجود تھے لہٰذا ان کے بارے میں تو پھر بھی کسی قدر قیل و قال اور رد و قدح یا کم از کم ترجیح و انتخاب کا معاملہ کیا گیا۔ لیکن سائنس چونکہ بالکل حتمی اور قطعی تھی اور اس کے نتائج بالکل محسوس و مشہود تھے اور اس میدان میں چون و چرا کی گنجائش موجود نہیں تھی۔ لہٰذا اس کا استقبال بالکل وحی آسمانی کی طرح ہوا اور اس کے نتیجے میں غیر شعوری طور پر ملحدانہ نقطۂ نظر اور مادہ پرستانہ طرزِ فکر رفتہ رفتہ عالمِ اسلام کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگوں کے ذہنوں میں سرایت کرتا چلا گیا۔ اور خدا کے بجائے کائنات' روح کے بجائے مادے اور حیاتِ اخروی کے بجائے حیاتِ دنیوی کی اہمیت پوری طرح امت مسلمہ' حتیٰ کہ اس کے خاصے دیندار اور مذہبی مزاج کے لوگوں کے نزدیک بھی مسلّم ہوتی چلی گئی۔''

کتاب ''اسلام کی نشأۃ ثانیہ''

روحِ قربانی

ہر چیز کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن۔ نماز کا ایک ظاہر ہے ـــــ قیام، رکوع، سجود اور قعدہ۔ انہیں آپ نماز کا خول اور ڈھانچہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کا ایک باطن بھی ہے ـــــ توجہ، رجوع الی اللہ، خشوع و خضوع، بارگاہ رب میں حضوری کا شعور و ادراک، محبت الٰہی ـــــ نماز کی اصل تو یہ چیزیں ہیں۔ اس کی روح اور جان تو یہی ہیں۔

شوق اگر نہ ہو ترا میری نماز کا امام! میرا سجود بھی حجاب میرا قیام بھی حجاب

اسی طرح جان لیجئے کہ جانور کو ذبح کرنا اور قربانی دینا ایک ظاہری عمل ہے۔ یہ ایک خول ہے۔ اس کا بھی ایک باطن ہے اور وہ ''تقویٰ'' ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے قربانی کے حکم کے ساتھ متنبہ کر دیا کہ:

''اللہ تک نہیں پہنچتا ان قربانیوں کا گوشت اور ان کا خون ـــــ ہاں اس تک رسائی ہے تمہارے تقویٰ کی۔'' (الحج)

اگر تقویٰ اور روحِ تقویٰ موجود نہیں، اگر یہ ارادہ اور عزم نہیں ہے کہ ہم اللہ کے دین کے لئے اپنی مالی و جانی قربانی کے لئے تیار ہیں تو اللہ کے یہاں کچھ بھی نہیں پہنچے گا۔ یعنی ہمارے نامۂ اعمال میں کسی اجر و ثواب کا اندراج نہیں ہوگا۔ کچھ گوشت ہم کھا لیں گے۔ اس کا کچھ حصہ دوست احباب کو بھیج دیں گے۔ کچھ غرباء میں تقسیم کر دیں گے۔ کھائیں بھی کوئی جماعت یا دارالعلوم والے لے جائیں گے۔ لیکن اللہ تک کچھ نہیں پہنچے گا اگر وہ روح موجود نہیں ہے ـــــ وہ روح کیا ہے؟ وہ تو اللہ کی طرف سے ڈالے گئے امتحان، آزمائش اور ابتلا میں استقامت اور کامیابی کا وہ تسلسل ہے جن سے سیدنا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پوری زندگی عبارت ہے۔

ہمارے لئے لمحۂ فکریہ یہ ہے کہ ہم اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکیں اور جائزہ لیں کہ کیا واقعتاً ہم اللہ کی راہ میں اپنے جذبات و احساسات کی قربانی دے سکتے ہیں! کیا واقعتاً ہم اپنی محبوب ترین اشیاء اللہ کی راہ میں قربان کر سکتے ہیں! کیا واقعتاً ہم اللہ کے دین کی خاطر اپنے وقت کا ایثار اور اپنے ذاتی مفادات کی قربانی دے سکتے ہیں! اپنے دنیوی تعلقات، اپنے رشتے اور اپنی محبتیں اللہ اور اُس کے دین کی خاطر قربان کر سکتے ہیں! اگر ہم یہ سب کر سکتے ہیں تو عید الاضحیٰ کے موقع پر یہ قربانی بڑی مبارک ہے ـــــ لیکن اگر ہم اللہ کے دین کے لئے کوئی ایثار کرنے اور قربانی دینے کے لئے تیار نہیں تو جانوروں کی یہ قربانی محض ایک خول اور ڈھانچہ ہے۔ جو روح سے تہی ہے۔

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

(کتاب ''عید الاضحیٰ اور فلسفۂ قربانی'' سے اقتباس)

ہمارے دین میں تقویٰ کا مقام

لفظ ''تقویٰ'' ہمارے دین کی اہم ترین اصطلاحات میں سے ایک اصطلاح ہے۔ اصطلاحات کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ کسی زبان کی اصطلاح کا ترجمہ و مفہوم کسی دوسری زبان میں ایک لفظ میں ادا کرنا ممکن نہیں۔ قرآن مجید کے اردو تراجم میں تقویٰ کا ترجمہ عام طور پر ''پرہیزگاری' ڈرنا اور بچنا'' کیا جاتا ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کسی لفظ سے بھی ان معانی و مفاہیم کے بیان کا حق ادا نہیں ہوتا' جو تقویٰ کی دینی اصطلاح میں شامل ہیں۔ اس لفظ کی شرح حضرت ابی بن کعب ؓ نے بڑی وضاحت و صراحت اور بہت ہی قابل فہم انداز میں فرمائی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم کی ایک مجلس میں امیر المؤمنین فاروقِ اعظم حضرت عمر بن خطاب ؓ نے لفظ ''تقویٰ'' کا مطلب دریافت فرمایا۔ اس کے جواب میں حضرت ابی بن کعبؓ نے یہ تشریح بیان کی:

> ''یا امیر المؤمنین! جب کسی شخص کو جنگل کی ایسی پگڈنڈی سے گزرنے کا اتفاق ہو جس کے دونوں اطراف میں خاردار جھاڑیاں ہوں تو ایسی پگڈنڈی پر گزرتے وقت وہ شخص لامحالہ اپنے کپڑوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر اس راستے کو یوں طے کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے کپڑے جھاڑیوں اور ان کے کانٹوں سے الجھنے نہ پائیں۔ اسی احتیاطی رویے کو عربی میں ''تقویٰ'' کہتے ہیں۔ (او کما قال)

فاروق اعظم ؓ نے اس تشریح و مفہوم کی تصویب و توثیق فرمائی اور حضرت ابی بن کعبؓ کو داد بھی دی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری دنیوی زندگی کی پگڈنڈی پر ہمارے دائیں اور بائیں یعنی دونوں اطراف میں شہوات' لذات اور معاصی کی خاردار جھاڑیاں موجود ہیں۔ اثم و عدوان کی ترغیبات و تحریصات کا کوئی شمار نہیں۔ ایک بندۂ مومن اللہ تعالیٰ کے غضب اور سزا کے خوف اور اس کے انعام' نگاہِ کرم' نظرِ ترحم اور جزا کے شوق سے نافرمانی کے ہر عمل سے بچتا ہوا اور دین کے تقاضوں اور مطالبوں کو ادا کرتا ہوا جب زندگی گزارتا ہے تو اس رویے اور طرزِ عمل کا نام ''تقویٰ'' ہے اور اسی کو اختیار کرنے کی قرآن مجید میں دعوت و تاکید کی گئی ہے۔ اور خطبۂ نکاح کے موقع پر جو آیات پڑھی جاتی ہیں ان میں اسی تقویٰ کو اختیار کرنے کی ہدایت و حکم کو مرکزی مقام حاصل ہے۔

حقیقتِ موت

ذرا ٹھہرو! حیات کی عظمت کے ساتھ ساتھ موت کی حقیقت بھی دیکھ لو۔ یہ زندگی کا ایک 'وقفہ' ہی نہیں، سلسلۂ حیات کی ایک کڑی اور زندگی ہی کی ایک شکل ہے، بالکل نیند سے مشابہ، اب ذرا تلاوت کرو آیۂ کریمہ: ﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا﴾ (سورۃ الزمر)

''اللہ کھینچ لیتا ہے جانیں جب وقت ہو اُن کے مرنے کا اور جو نہیں مرے اُن کو کھینچ لیتا ہے اُن کی نیند میں۔''

اور گوشِ حقیقت نیوش سے سُنو نبی اکرم ﷺ کے الفاظ: ((وَاللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ)) ''خدا کی قسم! تم لازماً مر جاؤ گے جیسے تم سو جاتے ہو۔ پھر یقیناً اُٹھا لیے جاؤ گے جیسے تم نیند سے بیدار ہوتے ہو۔''

اور یاد کرو آپ کی وہ دعا جو آپ کی ہر صبح کا معمول تھی:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحْيَانِيْ بَعْدَمَا اَمَاتَنِيْ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ)) ''تعریف ہے اللہ کی جس نے مجھے زندگی عطا فرمائی، اس کے بعد کہ مجھ پر موت طاری فرما دی تھی۔''

شاید حقیقت کی کوئی جھلک دیکھ لو!

اللہ اکبر! کیا ''ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ'' کا گھُپ اندھیرا طاری ہے اِن ذہنوں پر جو موت اور زندگی کو عدم اور وجود کے ہم معنی سمجھ بیٹھے ہیں!

حقائق کے اس طرح درجہ بدرجہ اور ''طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ'' انکشاف کے بعد اب ذرا محسوسات کی دنیا سے ''لب بہ بند و چشم بند و گوش بند!'' ہو کر وجدان کی لامتناہی فضا میں چشمِ تخیل کو وا کرو اور ''تسلسلِ حیاتِ انسانی'' کا مشاہدہ کرنے کی کوشش کرو۔ اگر کر پائے تو ایک عجیب سا کیف محسوس کرو گے اور سرور و مستی سے ہم کنار ہو گے اور کیا عجب کہ تمہارے منہ سے نکل جائے۔ سُبْحَانِيْ مَا اَعْظَمَ شَانِيْ تو یہی حقیقت کا ادراک ہے! ع

لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

''بَدءُ الاِسلام'' میں اسلام کی دو عظیم ترین حقیقتیں

قرآن حکیم اور جہاد فی سبیل اللہ

''واقعہ یہ ہے کہ ''بدء الاسلام'' میں دین کی اصل اساسی اور بنیادی حقیقتیں دو ہی تھیں۔ ایک قرآن حکیم جسے نبی اکرم ﷺ کی انقلابی جدوجہد کے ضمن میں 'آلہ انقلاب' کی حیثیت حاصل ہے' بقول مولانا حالی: ؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا اور اِک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

اور دوسرے جہاد فی سبیل اللہ' جو جامع عنوان ہے آپ ﷺ کی اس جدوجہد کے مختلف مدارج و مراحل کا۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ قرآن مجید ہی کی گرج اور کڑک تھی جس نے نیند کے ماتوں کو جگایا اور خوابِ خرگوش کے مزے لوٹنے والوں کو بیدار کیا۔ چنانچہ ﴿وَالْعَصْرِ ۝١ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝٢﴾ اور ﴿اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝١﴾ کی چونکا دینے والی صدائیں اور ﴿اَلْقَارِعَةُ ۝١ مَا الْقَارِعَةُ ۝٢ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝٣﴾ اور ﴿اَلْحَآقَّةُ ۝١ مَا الْحَآقَّةُ ۝٢ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ۝٣﴾ کی بیدار کن ندائیں ہی تھیں جنہوں نے پورے عرب میں ہلچل مچا دی اور ﴿عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ ۝١ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ ۝٢ الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝٣﴾ کی کیفیت پیدا کر دی۔ بقول مولانا حالی: ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادیؐ عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

پھر — اسی کی آیاتِ بینات تھیں جنہوں نے ﴿هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖٓ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ﴾ (الحدید:۹) کے مصداق

انسانوں کو شرک' الحاد' مادہ پرستی' حبِ عاجلہ اور حیوانیتِ محضہ کے ﴿ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ ایسے مہیب اور ہولناک اندھیروں سے نکال کر ایمان اور یقین کی روشنی سے بہرہ ور فرمایا۔ چنانچہ وہ ایک طرف عرفانِ الٰہی اور محبتِ خداوندی سے سرشار یعنی مست بادۂ الست ہو گئے اور دوسری طرف دنیا و مافیہا ان کی نگاہوں میں مچھر کے پر سے بھی حقیر تر ہو گئے اور وہ کلیتاً طالبِ عقبیٰ بن گئے۔

مزید برآں ——— وہی تھا جو ﴿مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ بھی بن کر آیا اور ﴿شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ بھی! چنانچہ اسی کے ذریعے لوگوں کا تزکیہ نفس بھی ہوا اور تصفیہ قلب و تجلیہ رُوح بھی!

گویا انذار ہو یا تبشیر' تبلیغ ہو یا تذکیر' موعظت ہو یا نصیحت' تعلیم ہو یا تربیت' تزکیہ ہو یا تصفیہ' تجلیہ ہو یا تنویر ——— الغرض تطہیر ہو یا تعمیر محمد رسول اللہ ﷺ کا پورا عمل دعوت و اصلاح قرآن مجید ہی کے گرد گھومتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں ایک نہ دو پورے چار مقامات پر آنحضور ﷺ کے منہج انقلاب کو جن اساسی اصطلاحات کے ذریعے واضح کیا گیا ہے ان کا اوّل و آخر خود قرآن مجید ہی ہے۔ بعجوائے الفاظِ قرآنی:

﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (الجمعۃ:۲)

''سناتا ہے انہیں اُس کی آیات اور پاک کرتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے انہیں کتاب اور حکمت۔''

قرآن کا کارنامہ' ایک جملے میں بیان کیجیے' تو یہ ہے کہ اس نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے دلوں میں ایمان پیدا کر دیا اور توحید' معاد اور رسالت پر یقین محکم کی کیفیت پیدا کر دی۔ لیکن اس سے اس ہمہ گیر تبدیلی کا اندازہ نہیں ہوتا جو قرآن حکیم کے بدولت ان کی زندگیوں میں برپا ہو گئی تھی' اس لیے کہ قرآن نے اُنؓ کا فکر بدلا' سوچ بدلی' نقطۂ نظر بدلا' اقدار بدلیں' عزائم بدلے' امنگیں بدلیں' شوق بدلے' دلچسپیاں بدلیں' خوف بدلے' امیدیں بدلیں' اخلاق بدلے' کردار بدلے' خلوت بدلی' جلوت بدلی' انفرادیت بدلی' اجتماعیت بدلی' دن بدلا' رات بدلی حتیٰ کہ ﴿تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ

الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ﴾ کے مصداق آسمان بدلا' زمین بدلی' الغرض پوری کائنات بدل کر رکھ دی —— اور اس پوری تبدیلی کا ذریعہ اور آلہ ہیں قرآن حکیم کی آیاتِ بینات! بقول علامہ اقبالؒ:

بندۂ مؤمن ز آیاتِ خداست ایں جہاں اندر برِ اوچوں قباست!
چوں کہن گردد جہانے در برش می دہد قرآں جہانے دیگرش!

تبدیلی اگر حقیقی اور واقعی ہو تو اس کی کوکھ سے لازماً تصادم اور کشمکش جنم لیتے ہیں جن کے مراحل تبدیلی کی نوعیت اور مقدار کی نسبت سے کم و بیش ہو سکتے ہیں۔ ایمان نے جو تبدیلی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں پیدا کی اُس نے جس تصادم اور کشمکش کو جنم دیا اُس کے جملہ مدارج و مراحل کا جامع عنوان ہے ''جہاد فی سبیل اللہ''!

اس تصادم اور کشمکش کا اوّلین ظہور انسانوں کی اپنی شخصیت کے داخلی میدانِ کارزار میں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ''مجاہدہ مع النفس'' کو ''افضل الجہاد'' قرار دیا گیا[1]۔ پھر جب ایمان اشخاص کے باطن میں اس طرح راسخ اور مستولی ہو گیا کہ ریب اور تشکک کے کانٹے نکل گئے تو اب اُسی جہاد و مجاہدہ کا ظہور عالم خارجی میں ظالموں' سرکشوں اور خدا کے باغیوں سے کشمکش اور تصادم کی صورت میں ہوا' جس کا مقصد قرار پایا ''تکبیر ربّ''[2] یعنی اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اقرار و اعلان اور اس کی حاکمیتِ مطلقہ کا بالفعل قیام و نفاذ تا کہ ''اُس کی مرضی جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے' زمین پر بھی ہو''[3] —— اور اس کی آخری منزل ہے ''قتال فی سبیل اللہ'' جس کا منتہائے مقصود معین ہوا ان الفاظ میں کہ:

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال:۳۹)

''اور جنگ کرتے رہو ان سے یہاں تک کہ 'فتنہ' بالکل فرو ہو جائے اور اطاعت کلیتًا اللہ ہی کی ہونے لگے!''

ایمان و یقین اور جہاد و قتال کا یہی وہ لزومِ باہمی ہے جس کو نہایت واضح اور واشگاف الفاظ میں بیان کیا گیا قرآن حکیم کی اس آیہ مبارکہ میں:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا

بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾ (الحجرات)

''مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر پھر شک میں نہ پڑے اور جہاد کرتے رہے اللہ کی راہ میں اور کھپاتے رہے اس میں اپنے اموال اور اپنی جانیں۔ حقیقت میں یہی ہیں سچے!''

واضح رہے کہ اس آیہ مبارکہ کے اوّل و آخر حصر کا اسلوب بھی ہے اور آیہ ماقبل میں ''حقیقی ایمان'' اور ''قانونی اسلام'' کے مابین فرق و امتیاز کا مضمون بھی۔ گویا مؤمن صادق کی جامع و مانع تعریف قرآن حکیم کی کسی ایک آیت میں مطلوب ہو تو وہ یہی آیت ہے۔

الغرض قرآن کے اصل حاصل ہیں ایمان اور یقین' اور ان کا لازمی نتیجہ ہیں جہاد اور قتال۔ ان میں سے ایمان و یقین اصلاً ایک معنوی حقیقت اور داخلی کیفیت کا نام ہیں' چنانچہ عالم خارجی میں اسلام کی دو عظیم ترین اور نمایاں ترین حقیقتیں ہیں قرآن اور جہاد۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں ایمانِ حقیقی کی مستقل علامتوں (symbols) کی حیثیت رکھتے ہیں اور مردِ مؤمن کی شخصیت کا جو ہیولیٰ تخیل اور تصور میں ابھرتا ہے اُس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لازمی و لابدی ہیں!

نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور خلافتِ راشدہ کے دوران اسلام کی ''نشاۃِ اولیٰ'' یا غلبۂ دین حق کا دورِ اوّل بلاشائبہ ریب و شک' نتیجہ تھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تعلق قرآن اور جذبۂ جہاد کا۔ لیکن یہ بھی ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں کہ جیسے ہی اسلام نے ایک مملکت اور سلطنت کی صورت اختیار کی ان دونوں کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی۔ اور ایسا ہونا ایک حد تک منطقی اور فطری بھی تھا۔ اس لیے کہ ایک طرف تو کسی مملکت یا سلطنت میں اوّلین و اہم ترین مسئلہ شہریت کا ہوتا ہے جو ایک خالص قانونی مسئلہ ہے جس میں تمام تر بحث انسان کے ''ظاہر'' سے ہوتی ہے' باطن سے کوئی سروکار ہی نہیں ہوتا گویا بقول علامہ اقبال ع ''بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے!'' —— مزید برآں اس کا اصل موضوع نظم و نسق اور امن و امان کا ہوتا ہے جس کے اعتبار سے بنیادی اہمیت قانون

اور ضابطے کو حاصل ہوتی ہے نہ مکارمِ اخلاق یا مواعظِ حسنہ کو۔ حتیٰ کہ اس اعتبار سے قصاص عفو پر مقدم ہو جاتا ہے ——— اور دوسری طرف سلطنتوں اور مملکتوں کو خواہ وہ اصولی اور نظریاتی ہی ہوں اصل سروکار اپنی حفاظت و مدافعت سے ہوتا ہے' اصولوں اور نظریات کی تبلیغ واشاعت ہوتی بھی ہے تو ثانوی درجے میں اور حکومتوں کی مصلحتوں کے تابع رہ کر!

یہی وجہ ہے کہ جب اسلام مملکت اور سلطنت کے دور میں داخل ہوا تو اصل زور (emphasis) ایمان کے بجائے اسلام پر' یقین کے بجائے اقرار اور شہادت پر اور باطن سے بڑھ کر ظاہر پر ہو گیا۔ نتیجتاً قرآن حکیم کے بھی منبع ایمان اور سرچشمہ یقین ہونے کی حیثیت مؤخر اور نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی اور کتابِ قانون اور یکے از ادلہ اربعہ [1] ہونے کی حیثیت مقدم اور مرکزِ توجہ بنتی چلی گئی۔ اور پھر جیسے جیسے مملکت اور سلطنت کے تقاضے پھیلتے گئے اور قانون کی عملداری وسیع ہوتی گئی قرآن مجید تو ''چار میں کے ایک'' کی حیثیت میں پس منظر میں گم [2] ہوتا چلا گیا اور توجہات حدیث اور فقہ پر مرتکز ہو کر رہ گئیں [3]۔ ستم بالائے ستم یہ کہ علم اور حکمت کے میدان میں جو خلا اس طرح پیدا ہوا اسے پر کرنے کے لیے مصر و یونان کی جانب سے فلسفہ و منطق کی آندھیاں آئیں۔ نتیجتاً پورا عالم اسلام ارسطو کی منطق اور نوافلاطونی تصوف کی آماجگاہ بن کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ فلسفہ و اصولِ اخلاق کے لیے بھی مسلمانوں کو اغیار کے سامنے کاسہ گدائی پیش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا! [1] اور رفتہ رفتہ صورت یہ ہو گئی کہ قرآن نہ منبع ایمان رہا نہ سرچشمہ یقین اور نہ مخزنِ اخلاق رہا نہ معدنِ حکمت ——— بلکہ صرف ایک ایسی ''کتابِ مقدس'' بن کر رہ گیا جس کے الفاظ یا تو حصولِ برکت اور ایصالِ ثواب کا ذریعہ بن سکتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کے کام آ سکتے ہیں [2] اور اس طرح آنحضور ﷺ کی وہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی کہ ایک زمانہ وہ آئے گا کہ:

((لَا يَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْآنِ اِلَّا رَسْمُهٗ))

(مشکوٰۃ: کتاب العلم)

''اسلام میں سے سوائے اس کے نام کے اور کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے سوائے صورتِ الفاظ کے اور کچھ نہ بچے گا۔''

بعینہٖ یہی معاملہ ''جہاد'' کے ساتھ بھی ہوا' جب اصل زور ایمان پر نہ رہا بلکہ اسلام پر ہو گیا تو جہاد بھی جو ایمانِ حقیقی کا رُکنِ رکین تھا خود بخود نگاہوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا اور ساری توجہ ارکانِ اسلام پر مرتکز ہو گئی جن کی فہرست میں جہاد سرے سے شامل ہی نہیں ہے۔ گویا جہاد پر ظلم قرآن سے بھی بڑھ کر ہوا۔ اس لیے کہ قرآن تو خواہ ''چار میں کے ایک'' کی حیثیت ہی سے سہی بہر حال شریعت کے اصولِ اربعہ میں شامل تو ہے' جہاد تو نہ صرف یہ کہ اسلام کے ارکانِ خمسہ میں شامل نہیں بلکہ نظامِ فقہ میں بھی اس کی حیثیت فرضِ عین کی نہیں صرف فرضِ کفایہ کی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جہاد کا تصور بھی مسخ ہو گیا اور اس شجرۂ طیبہ کی شاخوں کو جڑ اور تنے سے جدا کر کے ہر ایک کو مختلف رنگ دے دیا گیا۔ چنانچہ ایک طرف جہاد مع النفس کا رخ اعمال اور معاملات کی منجدھار سے پرے ہی پرے اذکار و اوراد اور نفسیاتی ریاضتوں اور ورزشوں کی راہِ یسیر (short cut) کی جانب موڑ دیا گیا اور دوسری طرف جہاد کو قتال کے ہم معنی قرار دے کر اس کا مقصد مملکت کی سرحدوں کے تحفظ و دفاع اور بس چلے تو توسیع کے سوا کچھ نہ رہا۔ رہا شرک و ظلم' کفر و فسق اور زور و منکر کی ہر صورت کے ساتھ مسلسل کشمکش اور تصادم اور حق و صداقت کے پرچار' نیکی اور راستبازی کی ترویج' کلمہ توحید کی نشر و اشاعت اور دینِ حق کے غلبہ و اقامت کے لیے پیہم جدوجہد اور اس کے لیے سمع و طاعت کے اصول پر مبنی نظامِ جماعت کے قیام کا معاملہ —— گویا فی الجملہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی منظم سعی جو ہر مؤمن کے لیے فرضِ عین کا درجہ رکھتی ہے تو وہ یا تو سرے سے خارج از بحث ہو گئی یا زیادہ سے زیادہ ایک اضافی نیکی قرار پا کر رہ گئی اور اس سے بالا ہی بالا اور ورے ہی ورے اسلام و ایمان اور تقویٰ و احسان کے جملہ مراحل طے پانے لگے!

اللہ اللہ! کوئی فرق سا فرق ہے اور تفاوت سا تفاوت! ع ''ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا!'' کے مصداق کجا وہ کیفیت کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جذبۂ جہاد سے سرشار' بیک

زبان‘ رجز یہ انداز میں یہ شعر پڑھ رہے ہیں:

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا
عَلَی الْجِھَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا

کجا یہ حال کہ چودھویں صدی ہجری کے ایک متنبّی اور اس کی ذُریتِ صلبی و معنوی نے تو جہاد بالسیف کو باقاعدہ منسوخ ہی قرار دے دیا۔ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا حال بھی عملاً کچھ زیادہ مختلف نہیں ع

’’کہ رہوارِ یقین ما بصحرائے گماں گم شد!‘‘

(میثاق‘ دسمبر ۲۰۱۰ء)

’’قرآن مجید میں جن انبیاء و رُسل علیہم السلام اور جن اقوام و ملل کا ذکر ہے وہ بطورِ تذکیر اور بطورِ عبرت ہے۔ قرآن تاریخ یا جغرافیہ کی کتاب نہیں ہے کہ جس میں تمام معلومات جمع کر دی گئی ہوں۔ اس ضمن میں میری رائے ہے کہ تمدن کی ترقی کے ساتھ علم‘ جستجو‘ تحقیق اور معلومات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا آ رہا ہے اور ہوتا چلا جائے گا۔ لہٰذا اس معاملے میں اگر ہمارے متقدمین علماء‘ محققین اور مفسرین کی آراء موجودہ تحقیقات و معلومات اور فراہم شدہ data سے مطابقت نہ رکھتی ہوں تو یہ بالکل فطری بات ہے‘ اس سے متوحش اور تشویش میں مبتلا ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ اِن شاء اللہ جوں جوں تحقیقات و معلومات کا دائرہ وسیع ہوگا اس کے نتیجہ میں قرآن مجید کی حقانیت مزید مبرہن ہوتی چلی جائے گی‘ قرآن میں جو اشارات ہیں وہ کھلتے چلے جائیں گے اور جو اجمال ہے وہ واضح ہوتا چلا جائے گا۔‘‘

(میثاق دسمبر 2007ء)

وقت کی اہم ترین ضرورت

آج دینی جدوجہد کے ضمن میں ہماری سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ طریق انقلاب واضح ہو جائے۔ آج مسلمانوں میں جذبے کی کمی نہیں ہے۔ ہزاروں لوگ جانیں دے رہے ہیں۔ اپنے جسموں سے بم باندھ کر اپنے جسموں کو اڑا رہے ہیں۔ کشمیر کے اندر جو جذبہ ابھرا اسے پوری دنیا نے دیکھ لیا۔ کشمیریوں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ تو لڑنے والی قوم ہے ہی نہیں' اب اس کے اندر جان پیدا ہو چکی ہے۔ پاکستان سے جا کر کتنے لوگوں نے وہاں پر جامِ شہادت نوش کر لیا۔ لیکن اسلامی انقلاب کا طریق کار یہ نہیں ہے۔ اس سے کہیں کامیابی نہیں ہوگی۔ اس طریقے سے آپ صرف اپنا غصہ نکال سکتے ہیں۔ اسی طرح الیکشن سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا اور اسلامی انقلاب کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ آپ کا خلوص اپنی جگہ' لیکن یہ طریقہ غلط ہے۔ اسلامی انقلاب کے لئے طریق محمدیؐ کو اختیار کرنا ہوگا۔ قرآن تو کہتا ہے: ﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (الانعام:117) ''اگر تم زمین میں رہنے والوں کی اکثریت کی پیروی کرو گے تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے گمراہ کر کے چھوڑیں گے''۔ الیکشن تو صرف اکثریت اقلیت کا مسئلہ ہے۔ کیا آیت اللہ خمینی الیکشن کے ذریعے ایران میں برسرِ اقتدار آ سکتے تھے؟ ہرگز نہیں! خدا کے لئے اپنے آپ کو دھوکہ دینا چھوڑ دو۔ آج پوری امت عذابِ الٰہی سے صرف اس صورت میں نکل سکتی ہے کہ کم از کم کسی ایک ملک میں اللہ کے دین کو قائم کر کے پوری دنیا کو دعوت دے سکے کہ آؤ دیکھو' یہ ہے اسلام! اس کی برکتیں دیکھو۔ اس کی سعادتیں دیکھو—— یہاں کی مساوات اور یہاں کا بھائی چارہ دیکھو—— یہاں کی آزادی دیکھو—— یہاں کا امن و امان دیکھو!! اگر ہم یہ نہ کر سکے تو پھر اللہ کا عذاب سخت سے سخت تر ہوگا۔

(رسولِ انقلاب کا طریقِ انقلاب)

حاکمیت اور خلافت میں فرق

''حاکمیت اور خلافت میں فرق سمجھ لیجیے۔ حاکمیت سے مراد قانون سازی کا مطلق اختیار اور ہر معاملے میں آخری فیصلہ کا حق ہے۔ یہ اختیار جس ذات کے ہاتھ میں ہوگا وہی حاکم ہوگا۔ جبکہ خلافت ایک محدود حد تک نیابت کا نام ہے۔ یعنی کسی اور کی حاکمیت کے تحت اور اس کی ہدایت کے مطابق کسی عمل کا اختیار ہونا۔ خلیفہ وہ ہے جو کسی کی ملک میں اُس کے تفویض کردہ اختیارات اُس کی ہدایت کے مطابق استعمال کرے۔ نوعِ انسانی نے تمدّنی ارتقاء کا طویل سفر طے کیا ہے۔ اس ارتقاء کے ساتھ ساتھ انسانی حاکمیت اور خلافت میں بھی ارتقاء ہوا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے آباء و اَجداد غاروں میں رہتے تھے۔ کسی جگہ کوئی سیاسی' معاشی اور معاشرتی نظام نہیں تھا۔ اس کے بعد قبیلے بن گئے۔ قبائل میں اختیار قبیلے کے سردار کے پاس ہوتا تھا' اور سب کو اس کی بات ماننی پڑتی تھی' قبیلے کی ریت پر عمل کرنا پڑتا تھا۔ گویا جوں جوں انسان مہذب ہوا اور نظام تشکیل پاتے گئے' پابندیاں بڑھتی چلی گئیں۔ اس کے بعد جب ایک ہی جگہ چار پانچ قبیلے آ کر آباد ہوئے تو شہری ریاستیں (City States) وجود میں آ گئیں۔ چند قبیلوں کے ساتھ رہنے سے مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ ایک قبیلے کے دوسرے قبیلے کے ساتھ معاملات کیسے طے ہوں گے؟ اب یہاں سے دستور بننا شروع ہوئے' تاکہ آپس میں رہنے سہنے کے کچھ قواعد وضوابط اور معاملات کرنے کے اصول طے کیے جائیں۔ لیکن سب سے اہم سوال یہ تھا کہ یہ اصول کون طے کرے گا' کس کے پاس اختیار ہوگا' کس کی بات حرفِ آخر کے طور پر مانی جائے گی۔ یہ وہ دور ہے جب انسان بادشاہت کے تصور سے آشنا ہوا' یعنی انسانیت ایک سیڑھی آگے چڑھ گئی۔ چنانچہ دنیا میں سلطنتیں وجود میں آئیں اور بڑی بڑی بادشاہتیں قائم ہوئیں۔ گویا ابتدائی مراحل (primary stages) سے گزر کر انسان

بادشاہت تک پہنچ گیا۔ بادشاہتیں دو طرح کی تھیں۔ ایک وہ جن میں بادشاہ اللہ کے خلیفہ کے طور پر مملکت کا نظام چلاتا' اور دوسری وہ تھی جس میں وہ حاکمیت اعلیٰ کا مدعی ہوتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں پہلی اسلامی بادشاہت تھی اور دوسری کافرانہ۔

اسلامی بادشاہت کی ایک مثال حضرت داؤد علیہ السلام کی حکومت ہے' جنہیں قرآن نے خلیفہ کہا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ﴾ (ص:۲۹) یعنی ''اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے''۔ بظاہر تو وہ ایک بادشاہ تھے' کیونکہ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے سیدنا سلیمان علیہ السلام بادشاہ بنے اور بعد میں وہ سلطنت سیدنا سلیمانؑ کے دو بیٹوں میں تقسیم ہوگئی۔ گویا یہ خاندانی نظام حکومت تھا' جس میں باپ کے بعد بیٹا برسراقتدار آ رہا تھا' لیکن یہ بادشاہت خلافت تھی۔ سیدنا داؤد علیہ السلام نبی تھے۔ وہ اختیارِ کلی اور حاکمیت اعلیٰ کے مدعی بن کر نہیں بیٹھ گئے تھے' بلکہ ہر لحہ اللہ سے رہنمائی لے کر اس کے احکام کا نفاذ کر رہے تھے۔ یہی معاملہ ان کے بیٹے سیدنا سلیمان علیہ السلام کا تھا کہ وہ بھی وحی الٰہی کی روشنی میں امورِ سلطنت انجام دیتے رہے۔ تو گویا یہ ''اسلامی بادشاہت یا خلافت'' تھی۔ یہ لفظ ذہن نشین کر لیجیے تاکہ آئندہ بات سمجھ میں آ سکے۔

اس کے برعکس نمرود اور فرعون کی بادشاہتیں کافرانہ بادشاہتیں تھیں' کیونکہ وہ حاکمیت اور خدائی حقوق کے دعوے دار تھے۔ یعنی ہم جو چاہیں کریں گے' لوگوں پر ہمارا حکم چلے گا۔ فرعون نے یہ دعویٰ کیا: ﴿يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝۵۱﴾ (الزخرف) ''لوگو' کیا مصر کی بادشاہت میری نہیں ہے' اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟ کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا؟'' یعنی مصر کا مالک میں ہوں' آب پاشی کا نظام میرے زیر انتظام ہے' دریائے نیل پر میری حکومت ہے' میں جسے چاہوں پانی دوں اور جس کا چاہوں پانی بند کر دوں' کیونکہ حکم میرا ہی چلے گا۔ فرعون کا یہ دعویٰ دعوائے حاکمیت ہے جو کفر اور شرک ہے۔ اور یہی دعویٰ نمرود کا تھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے اللہ رب العزت کا تعارف کرواتے ہوئے

فرمایا: ﴿رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ﴾ ''میرا رب وہ ہے جو زندگی اور موت دیتا ہے'' تو اس نے جواب دیا'' ﴿اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ﴾ ''میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں''— جس کا ثبوت اُس کج فہم نے اس طرح دیا کہ جیل سے دو قیدی منگوائے' ایک کی گردن اڑا دی اور دوسرے کو آزاد کر دیا۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ﴾ ''اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے' تو اسے مغرب سے طلوع کر کے دکھا دے!'' ﴿فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ﴾ ''تو وہ کافر (نمرود) مبہوت ہو کر رہ گیا''۔ (البقرۃ:۲۵۸) فرعون اور نمرود دونوں کی بادشاہتیں کافرانہ اور مشرکانہ تھیں' جبکہ سیدنا داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی بادشاہت ایک اسلامی بادشاہت تھی' کیونکہ وہ حکم الٰہی کے تحت چل رہی تھی' اور یہی اسلامی خلافت ہے۔''

(میثاق' اگست ۲۰۰۹ء)

''برے سے برے گروہ کے اندر بھی کہیں نہ کہیں کوئی اچھے افراد لازماً ہوتے ہیں۔ داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کا تذکرہ بھی کرتا رہے کہ ان میں اچھے لوگ بھی ہیں' تاکہ ایسے لوگوں کے دلوں کے اندر نرمی پیدا ہو۔ اسی طرح فرد کا معاملہ ہے کہ برے سے برے آدمی کے اندر کوئی اچھائی بھی موجود ہوتی ہے۔ آپ اگر اُسے حق کی دعوت دے رہے ہیں تو اس میں جو اچھائی ہے اس کو مانیے' تاکہ اسے معلوم ہو کہ اسے مجھ سے کوئی دشمنی نہیں ہے' میری جو بات واقعی اچھی ہے اس کو یہ تسلیم کر رہا ہے' لیکن جو بات غلط ہے اس کو رد کر رہا ہے۔ اس طرح اس کے دل میں کشادگی پیدا ہو گی اور وہ آپ کی بات سننے پر آمادہ ہو گا۔''

(میثاق مارچ 2009ء)

اسلامی تاریخ میں بیعت کا مقام

''.....امت مسلمہ کی 13 سو سالہ تاریخ میں جماعت سازی کے لیے صرف بیعت ہی کی اساس ملتی ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد جو نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہوا اس کی بنیاد بیعت ہی تھی۔ پھر جب صحابہؓ نے محسوس کیا کہ خلافت کا ادارہ رفتہ رفتہ ملوکیت میں تبدیل ہو رہا ہے اور انہوں نے اس زوال کو روکنے کے لیے جدوجہد کی تو اس میں بھی بیعت کا طریقہ ہی اختیار کیا گیا۔ چنانچہ حضرت حسین بن علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ دونوں کی جدوجہد بیعت کی اساس پر ہوئی۔ اس کے بعد جب ملوکیت نے اپنے پنجے پوری طرح گاڑ لیے تب بھی خلفاء (اصل میں ملوک) اپنی حکومت کو بیعت کی بنیاد پر استوار کرتے رہے۔

اصولی طور پر تو اسلام میں مذہب و سیاست کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے' لیکن عملاً ہم دیکھتے ہیں کہ عہد ملوکیت میں یہ تقسیم نمایاں ہونے لگی تھی۔ نتیجتاً بیعت کا ادارہ بھی دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ بادشاہ عوام سے سیاسی اطاعت کا وعدہ بیعت کے ذریعے لیتے تھے' لیکن ساتھ ہی اسلامی معاشرے میں افراد کے تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن کے لیے صوفیاء کرام بھی لوگوں سے روحانی اور اخلاقی اطاعت کا وعدہ لینے لگے' اور یہ شے بیعتِ ارشاد کہلائی۔''

''.....تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ گزشتہ صدی میں مسلمانوں کو غیر ملکی استعمار سے نجات دلانے کے لیے جتنی بھی عسکری تحریکیں چلیں' ان سب کی بنیاد بیعت ہی تھی۔ چنانچہ ہندوستان میں سید احمد بریلوی کی تحریکِ شہیدین' لیبیا میں محمد بن علی السنوسی کی سنوسی تحریک' اور سوڈان میں محمد احمد المہدی کی تحریک' سب میں نظم کی بنیاد بیعت تھی۔ موجودہ صدی میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جب 1913ء میں اپنی جماعت یعنی حزب اللہ قائم کی' تو بیعت ہی کو اس کی اساس کے طور پر اختیار کیا۔ اسی طرح الاخوان المسلمون کے بانی ارکان نے شیخ حسن البناء شہید کے ہاتھ پر بیعت کی تھی' جو مرشد عام کہلاتے تھے۔''

''.....غرضیکہ امت کی 13 سو سالہ تاریخ کی گواہی ہمارے سامنے موجود ہے کہ جہاں بھی کسی منظم جدوجہد کے لیے جماعت سازی کی ضرورت پیش آئی وہاں ہمیشہ بیعت ہی کے طریقے کو اختیار کیا گیا۔ خواہ معاملہ حکومت بنانے کا ہو' یا اسلامی اصولوں کو نظامِ حکومت میں دوبارہ رائج کرنے کا ہو' تزکیۂ نفوس اور اصلاحِ باطن کا مسئلہ ہو' یا مسلمانوں کے علاقوں کو غیر مسلموں سے آزاد کرانے کی جدوجہد ہو' ہر بار افراد کو جمع کرنے اور منظم کرنے کے لیے صرف بیعت کا طریقہ اختیار کیا گیا۔''

(اسلامی نظم جماعت میں بیعت کی اہمیت)

عریضہ بنام علماءِ کرام

محترم و مکرم جناب ______________

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

مزاج گرامی!

جناب کے علم میں ہے کہ راقم الحروف اللہ کی کتابِ حکیم کا ایک ادنیٰ طالب علم اور اس کے دین متین کا ایک حقیر خادم ہے۔ اُس نے ایک انجمن ''مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور'' کے نام سے ۱۹۷۲ء میں قائم کی تھی جس کا وہ تاحیات صدر ہے۔ اور ایک دینی جماعت ''تنظیم اسلامی'' کے نام سے ۱۹۷۵ء میں قائم کی تھی جس کا وہ امیر ہے!

انجمن کے جملہ وابستگان اور تنظیم کے تمام شرکاء' ظاہر ہے کہ' راقم ہی کے دروسِ قرآن' اور تحریروں اور تقریروں سے متاثر ہو کر راقم کے معاون و مددگار بنے ہیں — لیکن 'الحمد للہ' کہ میرا مزاج ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اپنے رفقاء و معاونین کو صرف اپنے ہی فہم و فکر کے حصار میں محصور نہ رکھوں' بلکہ وسیع تر حلقے سے ذہنی و فکری استفادے کی تلقین بھی کروں اور اس کے مواقع بھی پیدا کروں — چنانچہ انجمن کے زیر اہتمام جو سالانہ ''قرآن کانفرنسوں'' اور ''محاضراتِ قرآنی'' کے انعقاد کا سلسلہ جاری رہا ہے اور اُن میں جملہ مکاتب فکر کے علماء کرام اور اصحابِ علم و فضل حصہ لیتے رہے ہیں تو اس سے دوسرے مقاصد کے ساتھ ساتھ یہ مقصد بھی پیش نظر رہا ہے کہ وابستگانِ انجمن اور رفقاءِ تنظیم کا ذہنی افق وسیع ہو اور وہ جس راہ پر چلیں' علیٰ وجہ البصیرت' چلیں!

اس سال ''محاضراتِ قرآنی'' کے ضمن میں راقم نے طے کیا ہے کہ اصحابِ علم و فضل کو اپنے دینی فکر' بالخصوص ''تصورِ فرائض دینی'' پر تنقید کی دعوت دے تاکہ اگر انہیں اس میں کوئی غلطی نظر آئے تو اُس کی نشاندہی فرمائیں' بصورت دیگر تائید و تصویب سے نوازیں' — اس مقصد کے لیے راقم نے اپنی دینی سوچ' خصوصاً اپنے تصورِ فرائض دینی کا ایک ''خلاصہ'' مرتب کیا ہے جو جناب کی خدمت میں اس عریضے کے ساتھ ارسال ہے!

جیسے کہ جناب منسلکہ اوراق میں ملاحظہ فرمالیں گے کہ راقم کا تصور فرائض دینی چھ عنوانات کے ذیل میں مندرج ہے۔ تین اساسی فرائض' اور تین ان کے لوازم' ——— ادھر محاضرات بھی ان شاءاللہ چھ یوم جاری رہیں گے۔ بنابریں مناسب تقسیم یہ رہے گی کہ روزانہ ایک ایک عنوان زیر بحث آئے' چنانچہ اگر جناب ان میں سے کسی ایک عنوان پر اظہار خیال فرمانا چاہیں تو اگر دنوں کی ترتیب کے لحاظ سے پروگرام بنالیں تو انسب ہوگا' اگر بحیثیت مجموعی پورے تصور فرائض پر گفتگو کرنی مقصود ہو تو وہ کسی بھی دن کی جاسکے گی۔ بہرحال اس ضمن میں کوئی چیز بھی ''شرط'' کے درجے میں نہیں ہے!

اسی طرح ''ان شاءاللہ العزیز' سوائے ایک وقت کی پابندی کے اور کوئی پابندی کسی مقرر پر نہیں ہوگی اور آزادانہ اظہارِ خیال کا پورا موقع ہوگا ——— اس ضمن میں اس بات کی وضاحت بھی مناسب ہے کہ ان اجتماعات میں راقم خود بھی سراپا گوش رہے گا اور امکانی حد تک ''استفادے'' کی کوشش کرے گا اور صورت ہرگز کسی بحث مباحثے کی نہیں بنے گی۔

آخر میں جناب سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ اپنی گوناگوں مصروفیات اور تمام تر مشاغل کے باوجود اس کام کے لیے ضرور وقت نکالیں۔ اس لیے کہ کسی دینی خدمت و تحریک کی بروقت رہنمائی' خصوصاً جبکہ اُس کا محرک و داعی خود اس کے لیے مستدعی ہو ایک اہم دینی فریضہ ہے! ——— بصورت دیگر میں اپنے آپ کو یہ کہنے میں حق بجانب سمجھتا ہوں کہ میری جانب سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں آپ پر ایک حجت قائم ہو جائے گی کہ میں نے تو رہنمائی چاہی تھی' جناب ہی نے توجہ نہ فرمائی۔ فقط والسلام مع الاکرام۔

رہنمائی کا طالب

خاکسار **اسرار احمد** عفی عنہ

لاہور۔ ۱۲ر فروری ۸۵ء

(نوٹ: یہ عریضہ کم وبیش یک صد علماء کرام کی خدمت میں ارسال کیا گیا)

(کتاب: جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی)

میرے تصورِ فرائض دینی کا خلاصہ

۞ تمہید: انسانی شخصیت کے دو رخ ہیں: ایک علم دوسرے عمل۔ اسلام میں علم صحیح کا مظہر اتم ''ایمان'' ہے جبکہ عمل صحیح کی اساس ''تصورِ فرائض'' پر قائم ہے۔ ''ایمان'' انسان کو علم حقیقت ہی عطا نہیں فرماتا صحیح محرکِ عمل بھی دیتا ہے۔ اس اعتبار سے اوّلین اہمیت اسی کی ہے' چنانچہ ایمان کی ماہیت' اس کی تفاصیل' اس کے درجات' اس کے حصول کے ذرائع اور اس کے لوازم و ثمرات اہم ترین موضوعات ہیں' لیکن موجودہ محاضرات میں اصل بحث ان پر نہیں بلکہ ''تصورِ فرائض دینی'' پر ہے!

۞ راقم کے نزدیک ایک مسلمان کے ''اساسی دینی فرائض'' تین ہیں:

(۱) ایک یہ کہ وہ خود صحیح معنی میں اللہ کا بندہ بنے!

☆ اس کے لیے چار اساسی اصطلاحات ہیں: اسلام' اطاعت خدا و رسولؐ' تقویٰ اور عبادت۔

☆ یہ کیفیات انسان میں ہمہ تن' ہمہ وقت اور ہمہ وجوہ مطلوب ہیں نہ کہ جزوی یا جزوقتی —— اِلّا یہ کہ کبھی غفلت کے باعث یا جذبات کی رو میں بہہ کر یا ماحول کے اثرات سے مغلوب ہو کر کوئی غلط حرکت سرزد ہو جائے' تو اس پر فوری توبہ اللہ کے یہاں لازماً مقبول ہو گی (النساء: ۱۷) —— اس کے برعکس اگر جان بوجھ کر کوئی ایک ''معصیت'' بھی مستقل طور پر اختیار کر لی گئی اور اس پر توبہ کی بروقت توفیق نہ ملی تو اس سے نہ صرف تمام نیکیوں کے ضائع چلے جانے بلکہ جہنم میں داخلے' حتیٰ کہ ''خلود فی النار'' تک کا اندیشہ ہے (البقرۃ: ۸۱) اِلّا یہ کہ حقیقی اور واقعی ''اضطرار'' ہو!!

(۲) دوسرے یہ کہ دوسروں کو حتی المقدور اسلام کی تبلیغ کرے اور دین کی دعوت دے!

☆ اس کے لیے یوں تو بے شمار اصطلاحات ہیں جیسے انذار' تبشیر' تذکیر' وعظ' نصیحت' وصیت' تعلیم' تبیین' تلقین۔

☆ لیکن اہم تر اصطلاحات چار ہی ہیں: تبلیغ' دعوت' امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور شہادت علی الناس۔

☆ یہ خود انسان کی اپنی شرافت ومروت کا تقاضا بھی ہے اور ابنائے نوع کی ہمدردی و خیر خواہی کا تقاضا بھی' لیکن سب سے بڑھ کر یہ سید المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ پر ختم نبوت کا منطقی نتیجہ ہے کہ اب تا قیامِ قیامت تمام انسانوں پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب سے اتمامِ حجت یعنی ''شہادت علی الناس'' کی ذمہ داری بحیثیت مجموعی اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے کندھوں پر ہے!

(۳) تیسرے یہ کہ وہ اللہ کے کلمے کی سربلندی اور اس کے دین حق کے بالفعل قیام اور غلبے کے لیے تن' من' دھن سے کوشاں ہو۔

☆ اس کے لیے قرآن حکیم کی چار اساسی اصطلاحات ہیں: تکبیر رب' اقامت دین' اظہار دین الحق علی الدین کلہٖ اور لیکون الدین کلہ للّٰہ

☆ حدیث نبویؐ میں ایک پانچویں اصطلاح وارد ہوئی ہے: لِتَکُوْنَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا ——— اور

☆ تین عام فہم تعبیرات ہیں: قیامِ حکومت الٰہیہ' نفاذِ نظامِ اسلامی اور اسلامی انقلاب!

متذکرہ بالا تین فرائض کی باہمی نسبت اور ان کے ایمان اور ارکانِ اسلام کے ساتھ ربط وتعلق ایک ایسی سہ منزلہ عمارت کی مثال سے خوب واضح ہو جاتا ہے جس کی ——— (i) ایک زیر زمین بنیاد ہے جو نظر نہیں آتی لیکن پوری عمارت کی مضبوطی اور پائیداری کا دارومدار اسی پر ہے۔ (ii) اسی بنیاد کا ایک حصہ زمین سے باہر ہے جو نظر آتا ہے جسے عرفِ عام میں ''کرسی'' اور انگریزی میں plinth کہتے ہیں۔ (iii) پہلی منزل پر صرف چار ستون ہیں' دیواریں تعمیر نہیں کی گئیں۔ ظاہر ہے کہ اُوپر کی پوری تعمیر کا وزن ان ہی کے ذریعے بنیاد تک پہنچتا ہے۔ (iv) ان ستونوں پر پہلی چھت قائم ہے (v) دوسری چھت بھی اگرچہ ان ستونوں ہی پر قائم ہے لیکن دیواروں کی تعمیر کے باعث ستون نظر نہیں آتے (vi) اس کے اوپر تیسری اور آخری چھت ہے اور اس کا بھی معاملہ یہی ہے ———!

اس مثال میں:

(i) زیر زمین بنیاد ——— ایمان کا ''تصدیق بالقلب'' والا حصہ یعنی یقین قلبی ہے!

(ب) بنیاد کا نظر آنے والا حصہ ——''اقرار بالّلسان'' ——یعنی کلمۂ شہادت ہے!

(ج) چار ستون چار عبادات کی نمائندگی کرتے ہیں یعنی نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج۔

(د) پہلی چھت اسلام' اطاعت' تقویٰ اور عبادت کی نمائندگی کرتی ہے۔

(ہ) دوسری چھت —تبلیغ' دعوت' امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور شہادت علی الناس سے عبارت ہے ——اور

(و) تیسری اور آخری چھت تکبیرِ رب' اقامت دین' اظہارِ دین' اعلاءِ کلمۃ اللہ یا قیامِ حکومت الٰہیہ کی مظہر ہے! واللہ اعلم!

اسلامی نظام کیسے آئے گا!

''حقیقی اور واقعی اسلامی نظام کے نفاذ کے ضمن میں میرا نظریہ یہ ہے کہ یہ اوپر سے نیچے تھوپنے والا معاملہ نہیں ہے' یعنی اگر صاحب اقتدار طبقہ چاہے کہ وہ اسلام کو نافذ کر دے تو ایسا اقدام مستحکم اور پائیدار نہیں ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ عملی سیاست سے صرفِ نظر کرتے ہوئے خالصتاً نُصح و خیر خواہی کے جذبے اور رضائے الٰہی کے نصب العین کو اختیار کر کے ایک مؤثر تحریک برپا ہو اور وہ معاشرے میں عبادتِ ربّ کی دعوت پر اپنی تمام توانائیوں اور توجہات کو مرکوز رکھے' لوگوں میں بحیثیت مسلمان جینے اور مرنے کا جذبۂ صادق پیدا کرے' ان کو حقیقی طور پر اللہ کا بندہ بننے کی نصیحت و وصیت کرے اور ان کے دلوں میں ایمان حقیقی کے بیج کی آبیاری کرے' ان کو اس مقصد کے لیے تیار کرے کہ وہ اپنے اپنے گھروں میں اور خود اپنے اوپر اپنی انفرادی زندگی کے دائرہ عمل میں اسلام کو نافذ کریں تاکہ پھر ملک میں اجتماعی سطح پر صحیح اسلامی نظام نافذ ہو سکے۔ یہ تحریک جتنی جتنی مضبوط جڑیں پکڑتی رہے گی اُسی تناسب سے پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ اور اس کے استحکام کے امکانات روشن ہوتے چلے جائیں گے۔''

(کتاب: اسلام میں عورت کا مقام)

مواخات کی اہمیت

''مہاجرین کو مدینہ کی آبادی میں مدغم اور ضم (Integrate) کرنا، تاکہ وہ اس معاشرہ میں علیحدہ طبقہ کی حیثیت سے نہ رہ جائیں بلکہ اس کا ایک جزوِ لاینفک بن جائیں۔ چنانچہ مہاجرین میں جو اہم لوگ تھے ان کے بالکل سگے بھائیوں کی طرح انصار کے ساتھ رشتے کرا دیئے گئے۔ مواخات کا یہ اقدام داخلی استحکام کے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ مواخات کا یہ معاملہ سیرت مطہرہ کے ابواب میں ایک نہایت اہم باب ہے اور معلوم تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس کے نتیجے میں انصار نے مہاجرین کے لیے اپنے گھر اور دوکانیں تقسیم کر دیں۔ ایک انصاری صحابیؓ کے بارے میں یہاں تک آتا ہے کہ ان کی دو بیویاں تھیں۔ وہ اپنے مہاجر بھائی کو گھر میں لے گئے۔ چونکہ اُس وقت تک حجاب کا حکم نہیں آیا تھا لہٰذا انہوں نے پیشکش کی کہ ان دونوں میں سے جو آپ کو پسند ہو میں اسے طلاق دیتا ہوں، آپ اس سے نکاح کر لیں۔ اس لیے کہ میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ میرے گھر میں دو بیویاں ہوں اور میرے بھائی کا گھر آباد نہ ہو۔

یہ مؤاخات بھی نہایت انقلابی اہمیت کا حامل اِقدام ہے۔ اس لیے کہ انسان کی سرشت کے اندر جو کمزوریاں ہیں اس میں طبقاتی تفاوت و امتیاز اور کشمکش بہت خوفناک ہوتی ہے۔ اوس و خزرج میں قبائلی و طبقاتی کشمکش اور عصبیت پہلے سے موجود تھی۔ لیکن اسلام اور پھر رسول اللہ ﷺ کے بنفسِ نفیس ورودِ سعید نے اس کو ختم کیا۔ لیکن اس کے باوجود کچھ عرصہ بعد ہی منافقین اور یہود کسی نہ کسی بہانہ سے اس چنگاری کو بھڑکانے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ اگر مہاجرین اور انصار کا اس طرح ادغام و انضمام نہ کر دیا گیا ہوتا اور ان کے مابین مواخات قائم نہ کر دی گئی ہوتی تو ہو سکتا تھا کہ بہت سی داخلی مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ منافقین اور یہود نے اس کی موقع بموقع کوششیں کیں، لیکن نبی اکرم ﷺ کی فراست، تدبر، معاملہ فہمی اور حکمت نے ایسی تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا۔''

قیام اللیل کی اہمیت

''غور کا مقام ہے، محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں کیا کہ لوگوں کو نکال کر کہیں اور لے جائیں اور وہاں تربیت دیں، بلکہ یہ کیا ہے کہ جو شخص جہاں ہے، وہیں تربیت پائے اور وہ شخص وہیں کھڑے ہو کر کہے کہ میں ایک اللہ کو مانتا ہوں، میں جناب محمد ﷺ کو رسول اللہ تسلیم کر چکا ہوں اور آپؐ کے نقش قدم اور آپؐ کی سنت پر چلنے کا فیصلہ کر چکا ہوں، میں آخرت کے محاسبہ کا یقین رکھتا ہوں۔ اس پر کشمکش شروع ہو جائے گی۔ اپنے گھر میں کشمکش ہوگی۔ اہل وعیال اور رشتہ داروں سے کشمکش ہوگی۔ آج آپ ذرا کسی رسم کو چھوڑ کر دیکھئے، آپ کی برادری آپ کا حقہ پانی بند کر دے گی۔ ذرا آپ زمانے کے جو چلن ہیں، جو رواج ہیں ان کو چھوڑ دیجئے، آپ کو یہ نظر آ جائے گا کہ آپ کے بچوں کے لئے رشتے نہیں ملیں گے، آپ کی بچیوں کے لئے کہیں سے پیغام نہیں آئیں گے۔ یہ ہے اصل میں تربیت۔ صحابہ کرامؓ نے ماریں کھا کر تربیت حاصل کی تھی۔ اُس دور سعید اور ہمارے دور میں جو فرق ہے وہ پیش نظر رہنا ضروری ہے۔ وہاں کلمہ طیبہ پڑھنے پر مار پڑتی تھی۔ جس نے کہا: اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ اسے ماریں پڑنا شروع ہو جاتی تھیں۔ یہاں تو آپ ہزار دانے کی تسبیح لے کر بیٹھ جائیں اور اس پر کلمہ طیبہ کا ورد کرتے رہیں، کوئی مخالفت نہیں ہوگی، کوئی مار نہیں پڑے گی، بلکہ ایسے شخص کے احترام و توقیر میں اضافہ ہوگا کہ یہ شخص بڑا اللہ والا ہے۔ آپ راتوں کو جاگئے، قرآن کی تلاوت کو معمولات میں شامل کیجئے، نفلی روزوں کا اہتمام کیجئے، اس پر آپ کو کوئی مار نہیں پڑے گی، بلکہ اگر لوگوں کے علم میں بھی یہ بات آ جائے تو آپ کے تقویٰ اور تدین کی دھوم ہوگی۔

آج کے دور میں کشمکش جو شروع ہوگی وہ اس سے ہوگی کہ ''میرے نزدیک از روئے

شریعت یہ کام غلط ہے، میں یہ نہیں کروں گا۔'' بس آپ نے جوں ہی یہ کیا وہیں کشمکش شروع ہوگئی۔ آج جو کشمکش ہے وہ شریعت پر عمل کرنے کی کشمکش ہے۔ اُس مکی دور میں شریعت نہیں تھی، صرف کلمۂ شہادت پر مار پڑتی تھی۔ لیکن یہ طے ہے کہ جب تک مار نہ پڑے، کشمکش نہ ہو، تربیت نہیں ہوتی۔ وہ تربیت خانقاہی تربیت ہے جس میں مار نہیں پڑتی۔ ایک شخص ایک گوشہ میں بیٹھا اوراد و وظائف کی تسبیحات پڑھ رہا ہے تو اس کا بھی فائدہ ضرور ہوگا، لیکن اس کا ہدف وہ نہیں ہے جو تربیت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا ہے۔ وہ تربیت انقلابی تربیت نہیں ہوگی، خانقاہی تربیت ہوگی۔ اگرچہ اس تربیت سے اچھا مسلمان وجود میں آئے گا، اسے روحانی ترفع حاصل ہوگا، وہ نیک ہوگا، صالح ہوگا، نماز میں اس کا جی لگے گا، ذکر اللہ میں اسے لذت حاصل ہوگی۔ یہ سب کچھ اسے حاصل ہو جائے گا لیکن وہ مرد میدان کبھی نہیں بنے گا، وہ باطل سے پنجہ آزمائی کبھی نہیں کر سکے گا۔ باطل اور طاغوت کو وہ کبھی نہیں للکار سکے گا۔ جبکہ یہاں وہ لوگ درکار ہیں جو میدان میں آئیں، باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے چیلنج کریں۔ اس کے لئے ضرورت ہے اُس تربیت کی جس میں ماریں پڑ رہی ہوں، جس میں گھر والوں اور ماحول کے ساتھ شدید کشمکش سے سابقہ پیش آیا ہو۔ اکبر الٰہ آبادی کا شعر ہے کہ ؎

تُو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
اِن خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر!

محمد رسول اللہ ﷺ کے جان نثار ساتھی فی الواقع آگ میں جلے تھے۔ حضرت خباب بن الارتؓ کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا گیا تھا۔ اب جو شخصیت اِس طرح پک گئی، پختہ ہوگئی، جس نے صبر و مصابرت کا یہ مورچہ سر کر لیا وہ کیا میدان میں کبھی پیٹھ دکھائے گی؟ یہ ہے انقلابی تربیت جس پر جب آپ عمل شروع کرتے ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ ''یہ ہے میرا راستہ جس پر میں چلوں گا، چاہے والدین کو ناپسند ہو، چاہے اہل و عیال کو ناپسند ہو، چاہے رشتہ داروں کو ناپسند ہو'' معاشرے کے ساتھ آپ کی کشمکش شروع ہو جائے گی۔ وہ شخص جو رشوت لے رہا ہے اور گھر والے عیش کر رہے ہیں وہ آج طے کر کے دیکھے کہ میں

رشوت نہیں لوں گا تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ سب سے پہلی لڑائی گھر میں ہوگی۔ اس لئے کہ جو دو دو پراٹھے کھاتے تھے اگر ان کو سوکھی روٹی پر گزارا کرنا پڑے تو سب سے پہلے دشمن خود اپنے گھر والے ہوں گے۔ جب تک اس قسم کی کشمکش در کشمکش نہیں ہوتی، اُس وقت تک وہ تربیت نہیں ہوگی جو اسلامی انقلاب کے لئے درکار ہے۔ کوئی شخص چالیس دن کے چلے کے لئے اپنے وطن سے دور تبلیغ کے لئے نکل جاتا ہے، وہاں اسے کوئی نہیں جانتا، اس کی عبادت اور نوافل دیکھ کر لوگ متاثر ہوں گے، مگر اپنے وطن میں وعظ و تبلیغ کرنا مشکل ہے کیونکہ لوگ آئینہ سامنے رکھ دیں گے کہ تم عملی زندگی میں رشوت اور سود سے پرہیز تو کرتے نہیں۔ پس اصل تربیت اپنے مقام اور ماحول میں ہوتی ہے جس طرح محمد رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی فرمائی۔''

معاشرتی بے راہ روی کا تجزیہ اور تشخیص

''موجودہ مسلم معاشرے کے متعلق میرا تجزیہ اور میری تشخیص یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں جو اعتقادی اور عملی گمراہیاں اور بے راہ روی پوری طرح مسلط ہے اس کا اصل سبب صدیوں کے بتدریج انحطاط و اضمحلال اور خاص طور پر انگریزوں کے دورِ غلامی اور خدا ناآشنا مغربی افکار و نظریات اور تہذیب کے ذہنی استیلاء کی وجہ سے ہمارے ایمان میں ضعف کا پیدا ہو جانا اور دین کی حقیقی تعلیم و حکمت سے دور ہو جانا ہے۔ یہی ضعف ایمان اور دین سے بُعد ہی ہماری تمام خرابیوں کی اصل جڑ ہے اور اسی جڑ سے خرابیوں کی بے شمار شاخیں پھوٹی ہوئی ہیں۔ ان شاخوں سے اُلجھنے اور ان سے کشتی لڑنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اصل میں ہدف اس جڑ کو بنانا

ہوگا۔ چنانچہ میں انہی اجتماعاتِ جمعہ میں اپنا یہ موقف آپ کے سامنے بیان کر چکا ہوں کہ میری جو عملی جدوجہد ہے اور میری جتنی حقیر توانائیاں اور قوتیں' صلاحیتیں اور اوقات ہیں وہ دو کاموں میں صرف ہو رہے ہیں۔

پہلا کام یہ ہے کہ قرآن حکیم کے پیغام کی زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے اور اعلیٰ علمی سطح پر نشر و اشاعت کرنے کی ہر امکانی کوشش کرنا۔ اسے آپ دعوتِ رجوع الی القرآن کہہ لیں یا تعلیم و تعلم قرآن کہہ لیں۔ بہرحال میری ان مساعی میں پیش نظر یہ ہے کہ قرآن مجید ہی دراصل ایمان کا حقیقی منبع اور سرچشمہ ہے۔ ایمان کے ضعف اور اضمحلال کا اگر ازالہ ہو سکتا ہے تو اسی قرآن کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے مرکزی انجمن خدام القرآن قائم ہوئی ہے۔

پھر جب حقیقی ایمان پیدا ہو جائے اور اپنے حقیقی دینی فرائض کا احساس ابھرے تو جدوجہد کی دوسری سطح یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو منظم کیا جائے' تاکہ جماعتی شکل اختیار کر کے یہ لوگ کوشش کریں کہ معاشرے میں دعوتِ عبادتِ ربّ وسیع پیمانے اور محکم بنیادوں پر برپا ہو۔ اس کے لیے تنظیم اسلامی کا قیام عمل میں آیا ہے' جو ابھی ایک بہت ہی مختصر قافلہ ہے' لیکن بہرحال میری توانائیاں اس میں بھی لگ رہی ہیں —— تو یہ دو اصل کام ہیں جن میں مَیں ہمہ تن و ہمہ وقت لگا ہوا ہوں۔ باقی میرے دوسرے سارے کام ضمنی ہیں۔ اگر مجلس شوریٰ میں میری شمولیت ہے تو یہ ایک ضمنی مصروفیت ہے' بنیادی نہیں ہے۔ اس کی گواہی ہر وہ شخص دے گا جو مجھ سے کسی درجے میں بھی واقف ہو۔ سولہ سال سے تو مَیں لاہور ہی میں ہوں' اور میرا حسن ظن ہے کہ یہاں ان سولہ سالوں میں قرآن حکیم کے پیغام کی نشر و اشاعت میں میری حقیر مساعی سے لاہور کا تعلیم یافتہ طبقہ بخوبی واقف ہوگا۔

(کتاب: اسلام میں عورت کا مقام)

خطبۂ نکاح کی اہمیت

''جہاں تک نکاح کی تقریب کے مساجد میں انعقاد کا معاملہ ہے وہ ایسی مشکل بات نہیں ہے۔ اکثر لوگ اس پر جلد ہی راضی ہو جاتے ہیں اس لیے کہ بات بڑی واضح ہے۔ چنانچہ بہت سے مواقع پر جب دو باتیں (جن کا ذکر آگے آئے گا) اس ضمن میں کہی گئیں تو واقعہ یہ ہے کہ جملہ حاضرین کی پیشانیاں عرقِ ندامت سے نم ہو گئیں اور ان کے چہروں پر حقیقی تأثر کے اثرات نمایاں ہو گئے۔ ایک یہ کہ جب تاجدارِ عالم اور محبوبِ ربّ العالمین ﷺ کی لختِ جگر اور دخترِ نیک اختر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح مسجد میں ہوا تو ہم میں سے کون ہے جو اپنے آپ کو آنحضور ﷺ سے زیادہ باعزت یا اپنی بیٹی کو سَیِّدَۃُ نِسَاءِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ سے افضل سمجھتا ہو اور اسے مسجد میں نکاح پڑھوانے سے عار محسوس ہو؟ اور دوسرے یہ کہ ہمیں شرم آنی چاہیے کہ عیسائیوں نے اس کے باوجود کہ ان کا اپنے مذہب سے لگاؤ نہ ہونے کے برابر ہے' تاحال کلیسا کا درجہ اس قدر بلند رکھا ہے کہ لڑکا اور لڑکی دونوں نکاح کے لیے وہاں حاضر ہوتے ہیں اور ہمارا یہ حال ہے کہ ہم نے مسجد کا مقام اس درجے گرا دیا کہ وہاں نکاح پڑھوانے کو عار جانتے ہیں' حالانکہ شریعت نے واضح راہ کھول دی ہے کہ لڑکی کی طرف سے اس کا وکیل دو گواہوں کی موجودگی میں نکاح خواں کو اجازتِ ''ایجاب'' دیتا ہے۔ اس طرح جب لڑکی کا خود مجلسِ نکاح میں موجود ہونا ضروری نہیں تو آخر اس کے گھر پر اس تقریب کا انعقاد کیوں ضروری سمجھ لیا گیا ہے؟ راقم کے خیال میں یہ دونوں دلیلیں اتنی قوی اور مؤثر ہیں کہ اگر ان کو عام کر دیا جائے تو اکثر لوگ تقریب نکاح کے مسجد میں انعقاد پر برضا و رغبت آمادہ ہو جائیں گے۔ ویسے دو مزید دلیلیں جو یقیناً قابلِ لحاظ ہیں' یہ ہیں کہ اوّلاً نکاح کے بعد جو دعائے خیر دولہا اور دلہن کے لیے کی

جاتی ہے اس کا بہترین ماحول مسجد میں ہوتا ہے نہ کہ شادی والے گھر کی ہنگامہ خیز فضا میں۔ اللہ کے کسی گھر میں کسی نماز کے معاً بعد یہ تقریب منعقد ہو اور اس کے بعد اس پاکیزہ ماحول میں نئے گھر کی آبادی اور خوشحالی اور دین و ایمان کی سلامتی اور باہمی الفت و محبت کی دعا کی جائے تو امید واثق ہے کہ اس کی تاثیر کم از کم دو چند ہو جائے گی' اور ثانیاً یہ کہ اس سے شامیانوں' قناتوں' قالینوں' صوفوں اور کرسیوں اور رنگا رنگ قسم کی آرائشوں پر صرف ہونے والا پیسہ بچ جائے گا جسے کسی اور نیک کام کے لیے صرف کیا جا سکتا ہے۔

نکاح کے موقع پر دعوتِ طعام سے احتراز کا معاملہ البتہ ذرا کڑوی گولی ہے جو آسانی سے حلق سے نہیں اُترتی' لیکن ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ پہلے معاملے سے بھی زیادہ صاف اور واضح ہے۔

اس سلسلے کی ایک دلیل تو خالص دینی اور مذہبی ہے' یعنی یہ کہ ہمارے نبی کریم ﷺ نے ہمیں زندگی کے ہر گوشے سے متعلق مفصل ہدایات دے دی ہیں' یہاں تک کہ ہم فخر سے کہتے ہیں کہ ہمارے نبی ﷺ نے ہمیں استنجا اور طہارت تک کی بھی مفصل تعلیم دی ہے' تو کیا کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شادی بیاہ ایسے معاملات میں حضور ﷺ کی جانب سے' معاذ اللہ' کوئی کوتاہی رہ گئی ہے جس کی تلافی کی کوشش ہمیں خود کرنی ہے؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہو اور یقیناً نفی ہی میں ہے تو ہمیں سوچنا چاہیے کہ جب آنحضور ﷺ نے شادی کے ضمن میں دعوتِ ولیمہ کی تاکید فرمائی اور اس کی اس لازمی برائی کا ذکر کرنے کے باوجود کہ ((بِئْسَ الطَّعَامُ طَعَامُ الْوَلِيْمَةِ يُدْعٰى اِلَيْهِ الْاَغْنِيَاءُ وَيُتْرَكُ الْمَسَاكِيْنُ)) (یعنی وہ دعوتِ ولیمہ بھی کیا ہی بری دعوت ہے جس میں صاحب حیثیت لوگوں کو بلایا جاتا ہے اور مسکینوں سے صرفِ نظر کر لیا جاتا ہے) یہ مثبت حکم بھی دیا کہ ((اِذَا دُعِيَ اَحَدُكُمْ اِلَى الْوَلِيْمَةِ فَلْيَاْتِهَا)) (جب تم میں سے کسی کو ولیمے میں بلایا جائے تو وہ ضرور جائے) ساتھ ہی مزید تہدید بھی فرمائی کہ ((فَمَنْ لَّمْ يَاْتِ الدَّعْوَةَ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ)) (یعنی جو دعوت میں (بلا عذر) شریک نہ ہوگا اس نے گویا اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کا ارتکاب کیا)۔ واضح رہے کہ یہ تمام حدیثیں ''مسلم شریف'' سے ماخوذ ہیں۔

پس اگر نکاح کے موقع پر لڑکی والوں کے یہاں بھی دعوتِ طعام کوئی اچھا کام ہوتا اور اس میں کوئی بھی خیر کا پہلو موجود ہوتا تو کیا اللہ کے رسول ﷺ ہمیں اس کا حکم نہ دیتے؟ یا کم از

کم درجۂ استحباب ہی میں اس کا ذکر نہ فرماتے؟ اور جب اس کا کوئی ذکر ہمیں کسی حدیث میں نہیں ملتا تو کیا یہ ایک خواہ مخواہ کی بدعت نہیں؟ اور کیا یہ اُن اِصر اور اَغلال کے قبیل کی چیز نہیں جن کے بوجھ سے انسانوں کی گردنوں کا آزاد کرانا مقاصد نبوت میں شامل ہے۔

دوسری دلیل وہ ہے جو ہر صاحب عقل سلیم کو اپیل کرے گی' یعنی یہ کہ شادی کا موقع لڑکی والوں کے لیے ویسا کھلی خوشی کا موقع نہیں ہوتا جیسا لڑکے والوں کے لیے ہوتا ہے۔ لڑکے کے لیے یہ خانہ آبادی کا موقع ہوتا ہے اور لڑکے والے گھر میں ایک فرد کا اضافہ ہو رہا ہوتا ہے' لہٰذا اصل خوشی وہاں ہوتی ہے (یہی وجہ ہے کہ شارع علیہ السلام نے دعوتِ عرس کا حکم لڑکے ہی کو دیا)۔ لڑکی کے والدین کو اس کی شادی کے موقع پر اگرچہ اس پہلو سے ایک احساس اطمینان ضرور ہوتا ہے کہ ایک اہم فرض ادا ہو گیا اور ذمہ داری کا ایک بھاری بوجھ کاندھے سے اُتر گیا' لیکن صحیح معنوں میں ان کے یا لڑکی کے بھائی بہنوں کے لیے یہ خوشی کا موقع ہرگز نہیں ہوتا' بلکہ عام مشاہدہ یہ ہے کہ لڑکی کی رخصتی کے وقت سب اہل خانہ اشکبار ہوتے ہیں۔ گھر کا ایک فرد' ماں باپ کی لاڈلی اور ناز و نعم سے پلی ہوئی بچی' بہنوں اور بھائیوں کی پیاری ماں جائی کا گھر سے رخصت ہونا ظاہر ہے کہ ہرگز خوشی کی بات نہیں۔ اس پر مستزاد ہیں مستقبل کے اندیشے جو ہر طرح کے حزم و احتیاط کے باوجود بہرحال بالکل ختم کسی طرح نہیں ہو سکتے کہ کیا معلوم نباہ ہو یا نہ ہو اور بیل منڈھے چڑھے یا نہ چڑھے۔ ان حالات میں اس گھر پر اور ان ہی گھر والوں کے ہاتھوں قورمے اور تنجن اڑانا یقیناً بڑی ہی دناءتِ طبع اور سفلہ مزاجی کا معاملہ ہے۔ ایک غیرت مند اور باہمت انسان کے لیے یہ چیز' الا آنکہ ذہن ادھر منتقل نہ ہوا ہو' بڑی ہی قابل حذر ہے۔

اب اگر یہ دونوں باتیں اظہر من الشمس ہیں: یعنی نکاح کی تقریب مسجد میں ہو اور اس موقع پر دعوتِ طعام کو پروگرام سے خارج (eliminate) کر دیا جائے تو خود بخود بارات کا پورا تصور ہی ختم ہو جاتا ہے' اور واقعہ یہ ہے کہ یہ ہے ہی ختم کیے جانے کے لائق' بلکہ صد لائق! خدا کا شکر ہے کہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی احادیث کے پورے ذخیرے' یہاں تک کہ جتنی عربی راقم کو آتی ہے' کم از کم اس کی پوری لغت میں کوئی لفظ ایسا موجود نہیں ہے جس کا ترجمہ لفظ ''بارات'' کیا جا سکے۔ اور جس طرح یہ لفظ خالص عجمی ہے اسی طرح اس کا پورا تصور بھی خالص عجمی ہے اور اس کا وہ نقشہ تو خالص ہندوانہ ہے جو ہمارے ذہنوں میں شادی بیاہ کے لوازم کی حیثیت سے رچ بس گیا ہے کہ ایک جتھے کی

صورت میں جمع ہو کر اور باقاعدہ ''چڑھائی'' کے انداز میں لڑکی والے کے گھر جانا اور پھر لڑکی کا ڈولا لے کر ''فاتحانہ'' انداز سے لوٹنا' جس کی بیخ کنی لازماً کی جانی چاہیے۔

بارات کا متذکرہ بالا تصور نہ صرف یہ کہ خالص عجمی ہی نہیں خالص ہندوانہ ہے' بلکہ ذرا غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ بڑی کم ظرفی کا مظاہرہ بھی لیے ہوئے ہے۔ بڑی شان و شوکت کے ساتھ دندناتے ہوئے جانا اور لڑکی والوں پر پورا رعب جھاڑتے ہوئے بطرز استحقاق پلاؤ زردہ اڑانا اور پھر فاتحانہ شان میں ''مالِ غنیمت'' سے لدے پھندے واپس آنا! حیرت ہے کہ کیوں لوگوں کو محسوس نہیں ہوتا کہ ان چیزوں کی اس دین سے کسی طور پر کوئی مناسبت نہیں ہو سکتی جو ہر معاملے میں شرافت و مروّت' وقار و متانت اور دوسروں کے جذبات کے پاس ولحاظ کی تعلیم دیتا ہے۔

بہر حال شادی بیاہ کے سلسلے میں یہ وہ ناپاک تثلیث (unholy trio) ہے جو مل جل کر ایک وحدت بن گئی ہے' یعنی عیسائیوں کے قول کے مطابق توحید بھی ہے اور تثلیث بھی (تین میں ایک اور ایک میں تین) اور بہتر یہی ہے کہ تینوں کی جڑوں پر بیک وقت ضرب کاری لگائی جائے' ورنہ اگر کسی ایک کی بیخ کنی پر اکتفا ہوئی تو باقی دونوں فوراً اس تیسری کو بھی از سر نو زندہ کر لیں گے۔ اس سلسلے میں بعض لوگوں کا یہ خیال بالکل درست نہیں ہے کہ رفتہ رفتہ اور تدریجاً اصلاح کی طرف قدم بڑھائے جائیں۔ ایسے معاملات میں ایک ہی بار بڑا اقدام مفید بھی رہتا ہے اور پائیدار بھی!''

مجھے خوب اندازہ تھا کہ لوگ ان باتوں کو عقلی اور منطقی اعتبار ہی سے نہیں دلی طور پر بھی تسلیم کر لیں گے' لیکن جب موقع آئے گا تو ''مجبوریوں'' کا ایک کوہ گراں ان کے سامنے آن کھڑا ہو گا اور وہ مجھے بھی ہر طرح مجبور کریں گے کہ ان تقاریب میں شرکت کروں۔ لہٰذا پیش بندی کے طور پر راقم نے اپنی ذات کی حد تک تین پختہ فیصلے کر کے ان کا ''میثاق'' کے صفحات میں اعلان بھی کر دیا اور جامع مسجد خضراء سمن آباد کے اجتماع جمعہ میں بھی۔ وہ تین فیصلے یہ تھے کہ :

(۱) راقم الحروف آئندہ نہ کسی بارات میں شامل ہو گا۔

(۲) نہ نکاح کے موقع پر لڑکی والوں کے ہاں کسی دعوتِ طعام میں شریک ہو گا۔

(۳) نہ کسی ایسی تقریب نکاح میں شرکت کرے گا جو مسجد میں منعقد نہ ہو۔

مجھے اعتراف ہے کہ اس معاملے میں کسی قدر شدت کی صورت پیدا ہوئی' لیکن میں پوری طرح مطمئن ہوں کہ اس کے بغیر معاملہ کسی طرح ٹس سے مس نہ ہوتا۔ الحمدللہ کہ میرے رفقاء و احباب میں بہت سے لوگوں نے اس معاملے میں میرا پورا ساتھ دیا جس کے نتیجے میں اس اصلاحی کوشش نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ بہت سے دوسرے احباب جو پورا ساتھ نہ دے سکے ان کے ساتھ میں نے ایک درمیانی صورت اختیار کر لی کہ نکاح کا انعقاد انہوں نے مسجد میں کر لیا جس میں میری شرکت ہوگئی۔ بعدازاں کسی دعوتِ طعام کا اہتمام انہوں نے کیا جس میں میری عدم شرکت کو انہوں نے خندہ پیشانی سے گوارا کر لیا اور ان کی ''مجبوریوں'' کے پیش نظر میں نے بھی ان پر نکیر نہ کی۔

قریبی عزیزوں اور رشتہ داروں کے حلقے میں البتہ مجھے زیادہ سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے نتیجے میں شکر رنجیاں بھی ہوئیں' تعلقات کا انقطاع بھی ہوا اور بعض بچپن کی منگنیاں بھی ٹوٹیں' لیکن الحمدللہ والمنۃ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ان تمام چیزوں کو برداشت کرنے کی ہمت عطا فرمائی اور میرے پائے ثبات میں لغزش نہ آنے دی۔

اس معاملے میں میرے لیے سب سے کڑا امتحان اپنی سب سے بڑی بچی کی شادی کے موقع پر پیش آیا۔ مجھے خوب اندازہ تھا کہ اس موقع پر خواہ میں اپنی طے کردہ ساری پابندیاں پوری طرح نباہ لوں' لیکن اگر رخصتی کے موقع پر میں نے دولہا اور ان کے چند عزیزوں کی تواضع صرف ٹھنڈے یا گرم مشروب سے بھی کر دی تو بات کا بتنگڑ بن جائے گا اور سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی توفیق و تائید سے میں نے ایک اور انقلابی قدم اٹھایا' یعنی یہ کہ بچی کو بھی جمعہ کو مسجد دارالسلام باغ جناح لے گیا۔ نماز جمعہ کے بعد نکاح پڑھایا اور اللہ ہی کے گھر سے اس کی رخصتی عمل میں آ گئی۔ اس طرح میرے گھر پر دو چار افراد کا بھی اس صورت میں آنا نہ ہوا جس پر کھینچ تان کر کے بھی ''بارات'' کے لفظ کا اطلاق کیا جا سکتا!

اس کے بعد بڑے بچے کی شادی کا مرحلہ آیا تو ایک طرف تو اس کے لیے جو ''بارات'' کراچی گئی وہ کل ڈھائی افراد پر مشتمل تھی' یعنی دولہا' اس کی والدہ اور سب سے چھوٹا بھائی (راقم خود اُن دنوں دعوتی و تنظیمی سلسلے میں پہلے ہی سے کراچی میں تھا)۔ دولہا کے دو حقیقی بھائی اور کوئی حقیقی بہن بھی اس ''بارات'' میں شامل نہ تھی۔ پھر یہ کہ جس جمعہ کو نماز جمعہ کے متصلاً بعد

عقد نکاح ہونا تھا' اسی صبح کوئٹہ سے یہ لوگ کراچی پہنچے اور اسی شام دلہن کو لے کر لاہور واپس ہو گئے۔ دوسری طرف رفیق مکرم قاضی عبدالقادر صاحب نے (جن کی بچی سے عقد نکاح ہونا تھا) راقم کی قائم کردہ مثال پر پورا عمل کر کے دکھایا اور اپنے قریب ترین اعزہ و اقارب کو بھی گھر پر مدعو نہیں کیا بلکہ مسجد ہی سے بچی کو رخصت کر دیا۔

اس کے بعد بحمداللہ سالِ رواں کے دوران راقم اپنی مزید دو بچیوں کی ذمہ داری سے اسی طور سے سبکدوش ہو چکا ہے۔

اسی سلسلہ کی آخری یعنی حالیہ تقریب میں جس کے حوالے سے گفتگو کا آغاز ہوا تھا' راقم نے ایک نہایت مختصر خطاب کیا تھا جس کے بارے میں جناب م ش نے ازراہ ذرہ نوازی یہ فرمایا ہے کہ ''میں نے ڈاکٹر صاحب کے ہزاروں کی تعداد میں مواعظ حسنہ میں شرکت کی ہے لیکن اس موقع پر میری روح نے ان کی تقریر دل پذیر سے جو اثرات قبول کیے وہ انمٹ تھے''۔ اس میں راقم نے ایک تو آنحضور ﷺ کی اسی شان مبارکہ کے حوالے سے جو ﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ﴾ کے الفاظ قرآنی میں بیان ہوئی ہے' حاضرین کو جرأت مندانہ اقدام کی ترغیب دلائی تھی اور دوسرے سورۃ الانشراح کی آیات مبارکہ ﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝﴾ کے حوالے سے تَحْدِيْثًا لِّلنِّعْمَة عرض کیا تھا کہ اپنی ان مساعی کے ضمن میں جس اخروی اجر و ثواب کا امیدوار میں ہوں اس کا تو میں محتاج ہوں ہی ﴿رَبِّ اِنِّىْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ۝﴾ (القصص) اس دنیا میں جو نقد انعام مجھے ملا ہے وہ' وہ آسانی اور سہولت ہے جس کے ساتھ میں تابڑ توڑ انداز میں اپنی ان پہاڑ ایسی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو گیا ہوں جن کا تصور بھی ہمارے معاشرے میں بہت سے لوگوں پر لرزہ طاری کر دیتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج جب میں غور کرتا ہوں تو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ اگر مجھے اپنی ان ذمہ داریوں کو زمانے کے دستور و معیار کے مطابق نبھانا ہوتا تو میرے لیے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہتا کہ جسم و جان کی ساری توانائیاں صرف پیسہ کمانے کے لیے نچوڑ دیتا۔ نتیجتاً اللہ کے دین اور اس کی کتاب عزیز کی کسی خدمت کے لیے نہ میرے پاس کوئی وقت بچتا نہ قوت و صلاحیت۔ یہ سراسر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب ایک جانب مجھے اس فیصلے کی توفیق ارزانی فرمائی کہ میرے جسم و جان کی تمام توانائیاں اور صلاحیتیں اللہ کے دین متین اور بالخصوص اس کی کتاب عزیز کی

خدمت کے لیے وقف رہیں گی تو دوسری جانب میری توجہ اتباع سنت کے اس رخ کی طرف بھی مبذول کردی اور مجھے شادی بیاہ کے ''اِصر'' اور ''اَغلال'' کے خلاف جہاد کا بیڑا اٹھانے کی توفیق بھی مرحمت فرمادی۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج میں خود اپنے ذاتی حالات میں اللہ تعالیٰ کے عظیم وعدوں' یعنی ﴿وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝٨﴾ (الاعلیٰ) اور ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝٧﴾ (الّیل) کی صداقت وحقانیت کا مشاہدہ کررہا ہوں کہ تین سال کے اندر اندر اپنے چار بچوں کی ذمہ داریوں سے اس طرح سبکدوش ہوگیا ہوں کہ کسی بار یا گرانی کا احساس تک نہیں ہوا۔ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّة !!

جہاں تک ''جہیز'' کا تعلق ہے میرے نزدیک یہ بھی سراسر غیر اسلامی اور خالص ہندوانہ ذہنیت کا مظہر ہے۔ تاہم ابتداءً میں نے اس کے ضمن میں صرف ''عدم نمائش'' پر زور دیا تھا۔ اب اللہ ہمت دے اور رفقاء واحباب کمر ہمت کس لیں تو اس ضمن میں بھی مزید پیش قدمی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں میرا اپنا جو معاملہ رہا ہے اس موقع پر اسے بیان کردینے میں بھی ان شاء اللہ کوئی حرج نہیں ہوگا اور وہ یہ کہ اگرچہ میری پہلی دو بچیاں بھی جو کچھ لے کر میرے گھر سے رخصت ہوئیں اس پر بھی موجودہ زمانے کے کسی بھی معیار کے مطابق ''جہیز'' کا اطلاق نہیں ہوسکتا' تاہم حالیہ شادی میں یہ معاملہ بھی بحمداللہ قدرِ مطلوب سے بہت قریب پہنچ گیا ہے۔ یعنی میری یہ بچی صرف ایک اٹیچی بھر کپڑے اور سوا دو تولے کا طلائی زیور لے کر میرے گھر سے رخصت ہوئی ہے۔

(کتاب: ایک اصلاحی تحریک مع خطبۂ نکاح)

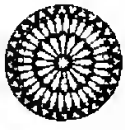

ہماری بہنوں کے لیے لمحۂ فکریہ

اس موقع پر میں عرض کروں گا کہ ہماری ان بہنوں کو جو مغربی تہذیب سے مرعوب ہیں اور اس کی نقالی اور کورانہ پیروی ہی کو اپنے حق میں مفید گمان کرتی ہیں' ٹھنڈے دل سے اور سنجیدگی سے سوچنا چاہئے کہ جوانی کے بعد بڑھاپے کا بھی ایک دور آنے والا ہے۔ اگر مغربی تہذیب سے شیفتگی اور دلدادگی ہوگئی ہے تو ان کو یورپ اور امریکہ جا کر دیکھنا چاہیے کہ وہاں بڑھاپے میں والدین کا حشر کیا ہوتا ہے۔ وہاں ان کی کسمپرسی کا کیا عالم ہے! وہاں جانے کے وسائل نہ ہوں تو ایسا لٹریچر موجود ہے جس کے مطالعے سے اس ذہنی کرب واذیت کی تصویر اُن کے سامنے آجائے گی جس سے اُس معاشرے کے والدین کو سابقہ پیش آتا ہے اور جس سے ان کا بڑھاپا دوچار ہوتا ہے۔ ان کے سامنے یہ تلخ حقیقت آ جائے گی کہ والدین کی تکریم وعزت' ان کی فرمانبرداری اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی کوئی رمق بھی اس معاشرے میں موجود نہیں ہے اور والدین کی رائے' پسند اور ان کی مرضی کو اس معاشرے میں پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دی جاتی۔ بیٹا اور بیٹی سینہ تان کر اپنے روز وشب کے بے راہ روی کے مشاغل پر بحث وتمحیص (argue) کرتے ہیں۔ وہاں کوئی باپ یا ماں اپنی اولاد کے بے مہابہ معاشقوں (courtships) اور آزادانہ اختلاط پر کوئی نکیر نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی گرفت کریں گے تو منہ کی کھائیں گے۔

پھر ایک دور وہ بھی آتا ہے کہ والدین اولاد کی شکل دیکھنے کے لیے ترستے اور تڑپتے رہتے ہیں اور ان کا بڑھاپا اس حسرت میں گزرتا ہے کہ اولاد کبھی آ کر ان سے مل ہی لے۔ بوڑھے والدین' خاص طور پر بوڑھی ماں کے لیے یہ بات سوہان روح ہے کہ ان کی اولاد بات کرنا تو درکنار صورت دکھانے کی بھی روادار نہیں اور احساس تنہائی اس آخری عمر میں ان کی جان کا لاگو بنا رہتا ہے۔ ٹھیک ہے کہ وہاں ایسے بوڑھوں کے لیے جن کا گزر اوقات کے لیے

ذاتی طور پر کوئی انتظام نہ ہو' حکومت کی سطح پر ہوسٹلوں کا اہتمام کیا گیا ہے' ان کے لیے علیحدہ ادارے قائم کر دیئے گئے ہیں جہاں ان کی دل بستگی کے لیے indoor تفریحات مہیا کی جاتی ہیں' ریڈیو اور ٹیلی ویژن فراہم کیے جاتے ہیں' لیکن ان تفریحات سے لطف اندوز ہونا شئے دگر ہے اور اپنے بیٹے یا بیٹی کو دیکھنا' اس سے باتیں کرنا بالکل دوسری بات ہے۔ اس کے لیے وہ ترستے اور تڑپتے رہتے ہیں۔ کم وبیش یہی حال یہاں کے خوش حال گھرانوں کے بوڑھے والدین کا ہے۔ کمیت کا فرق ہو تو ہو' کیفیت و نوعیت میں کوئی فرق نہیں —— اگر اس تہذیب کو اختیار کرنا ہے تو پھر ان نتائج کے لیے تیار رہنا چاہئے جو وہاں نکل چکے ہیں اور یہاں بھی نکل کر رہیں گے۔ وہاں جو نتائج نکلے ہیں ان کا وہاں جا کر بچشم سر مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ کوئی محض نظری اور خیالی باتیں نہیں ہیں' بلکہ حقائق ہیں جن کی تصدیق (verification) مشکل نہیں ہے۔

اسی ''مساواتِ مرد و زن'' کے نظریئے کا ایک دلگداز (pathetic) منظر آپ کو وہاں یہ نظر آئے گا کہ بسوں' ٹرام گاڑیوں اور ٹرینوں میں بوڑھی عورتیں کھڑے ہو کر سفر کرتی ہیں اور ان کے لیے کوئی ہٹا کٹا جوان بھی سیٹ چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اگر ''مساوات'' ہے تو ٹھیک ہے' جو پہلے آ گیا اور سیٹ پر قابض ہو گیا تو آخر وہ کس بنیاد پر کسی عورت کے لیے' خواہ وہ بوڑھی ہی کیوں نہ ہو' اپنی سیٹ چھوڑے! —— ہاں اگر کوئی فلرٹ قسم کی نوجوان خاتون ہو تو شاید وہ اس کو اپنی سیٹ دے دے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کے پیچھے انسانی ہمدردی نہیں ہو گی' بلکہ شیطانی جذبہ کارفرما ہو گا۔ ہماری جو بہنیں مغرب سے درآمد شدہ باطل نظریۂ مساواتِ مرد و زن کی چمک دمک سے خیرہ ہو کر' اس کی علمبردار بن کر سڑکوں پر مظاہرہ کرنے نکل آئی ہیں ان کو اس فاسد نظریئے کے ان نتائج کے لیے بھی تیار رہنا چاہئے۔

علامہ اقبال مرحوم نے اس مغربی تہذیب کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اس دور اور اُس دور میں نصف صدی سے بھی زیادہ طویل عرصہ حائل ہے۔ اِس وقت تو یہ تہذیب کہیں زیادہ ''ترقی یافتہ اور آزاد خیال'' ہے۔ اپنے دور کی تہذیب کی عکاسی علامہ مرحوم نے اپنے اشعار میں کی ہے اور ملت اسلامیہ کو اس سے حذر اور اجتناب کا پیغام دیا ہے۔ خاص طور پر مسلمان عورت کے لیے اقبال کے اشعار میں جو پیغام ہے اسے عالم اسلام کے جید مفکر و عالم مولانا سید

ابوالحسن علی ندوی نے اپنی تالیف ''نقوش اقبال'' میں پیش کیا ہے[1]۔ مغربی تہذیب کے بارے میں علامہ مرحوم کہتے ہیں ۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

اپنے ایک لیکچر میں انہوں نے اس کے لیے

"The Dazzling Exterior of the Western Civilization"

یعنی ''مغربی تہذیب کا چکا چوند ظاہر'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔''

(کتاب: اسلام میں عورت کا مقام)

خطبۂ نکاح کی حکمت

''پس خطبۂ نکاح بھی درحقیقت تذکیر کے لیے ہے۔ یہ تذکیر خاص طور پر اس شخص (یعنی دولہا) کے لیے بھی ہے جو اپنی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز کر رہا ہوتا ہے اور بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ اس کے کاندھوں پر آ رہا ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایک خاندان کا اضافہ ہو رہا ہوتا ہے۔ معاشرے کے لیے خاندان کا ادارہ بمنزلہ ایک اکائی ہوتا ہے۔ معاشرہ دراصل نام ہی بہت سے خاندانوں کے مجموعے کا ہے۔ اگر خاندان کا ادارہ درست اور مستحکم بنیادوں پر استوار ہو اور اس کو اس نہج پر منظم کیا جائے جو ہمارے دین میں مطلوب ہے تو اس طرح لامحالہ معاشرہ صالح خطوط پر پروان چڑھے گا۔ خاندان کی جو کیفیات ہوتی ہیں درحقیقت ان ہی کا عکس معاشرے پر پڑتا ہے۔ کسی معاشرے میں صالح خاندانوں کی اکثریت ہو گی تو معاشرہ بھی مجموعی طور پر اعلیٰ اقدار اور صالحیت کا حامل ہو گا۔ اس کے برعکس اگر خاندانوں کی اکثریت میں بگاڑ ہو، وہ صحیح خطوط پر استوار نہ ہوں تو لازماً مجموعی طور پر معاشرہ بھی بگڑا ہوا معاشرہ ہو گا۔ لیکن چونکہ دولہا جس کو تذکیر و نصیحت اصلاً مقصود ہے، عربی سے نابلد اور شرکاء بھی جو اس تذکیر سے مستفید ہونے چاہئیں، عربی سے ناواقف ہوتے ہیں، چنانچہ نتیجہ یہ ہے کہ خطبۂ نکاح بھی محض ایک ''رسم'' بن کر رہ گیا ہے۔ (ع ''رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی!'')''

(کتاب: ایک اصلاحی تحریک مع خطبۂ نکاح)

قرآن مجید سے بے اعتنائی کا اصل سبب؟

قرآن کے مُنزل من اللہ ہونے کا اقرار تو ہم کرتے ہیں لیکن اگر ہم اپنے دلوں کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہمارے قلوب قرآن پر یقین سے خالی ہیں اور ریب اور شک نے ہمارے دلوں میں ڈیرا ڈالا ہوا ہے۔ ہماری اس کیفیت کا نقشہ قرآن مجید نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

﴿وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْرِثُوا الْکِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ﴾ (الشوریٰ:14)

''اور جو لوگ وارث ہوئے کتابِ الٰہی کے ان کے بعد وہ اس کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہیں۔''

یہی وجہ ہے کہ نہ ہمارے دلوں میں اس کی کوئی عظمت ہے، نہ اس کو پڑھنے پر ہماری طبیعت آمادہ ہوتی ہے، نہ اس پر غور وفکر کی کوئی رغبت ہم اپنے اندر پاتے ہیں اور نہ ہی اسے زندگی کا واقعی لائحہ عمل بنانے کا خیال کبھی ہمیں آتا ہے۔ اس پوری صورت حال کا اصل سبب ایمان اور یقین کی کمی ہے۔ اور جب تک اسے دور نہ کیا جائے کسی وعظ ونصیحت سے کوئی پائیدار نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا۔

لہٰذا ہم میں سے ہر ایک کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے دل کو اچھی طرح ٹٹولے اور دیکھے کہ وہ قرآن مجید کو بس ایک متوارث مذہبی عقیدے (Dogma) کی بنا پر ایک ایسی مقدس آسمانی کتاب سمجھتا ہے جس کا زندگی اور اس کے جملہ معاملات سے کوئی تعلق نہ ہو، یا اسے یقین ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے جو اس کے لیے نازل ہوا ہے کہ لوگ اس سے ہدایت پائیں اور اسے اپنی زندگیوں کا لائحہ عمل بنائیں--- اگر دوسری بات ہے تو فھو المطلوب اور اگر پہلا معاملہ ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ ہماری ایک عظیم اکثریت کے ساتھ یہی صورت ہے، تو پھر سب سے پہلے ایمان کی اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرنی ہوگی، اس لیے کہ قرآن مجید کے تمام حقوق کی ادائیگی کا مکمل انحصار اسی پر ہے۔

(مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق)

مساوی شہریت کا فریب

''عہدِ حاضر کے پُرفریب افکار و نظریات میں سے ایک ''مساوی شہری'' ہونے کا یہ تصور ایسا دلفریب ہے کہ اس کے مقابلے میں کوئی اور تصور نگاہوں میں جچتا ہی نہیں۔ لیکن یہ بات لازمی ہے کہ اگر آپ نظامِ خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں تو مخلوط قومیت کی نفی کرنا ہوگی۔ اس موقع پر یہ بات بھی نوٹ کرنی چاہیے کہ ''جداگانہ قومیت'' ہی پاکستان کی ماں ہے۔ اسی نظریہ کے بطن سے پاکستان نے جنم لیا ہے۔ پاکستان وطنی قومیت کی نفی کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا۔ مسلم لیگ کا کانگریس کے ساتھ جھگڑا ہی یہ تھا کہ مسلمان جداگانہ قومیت رکھتے ہیں' جب کہ کانگریس کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان میں بسنے والے تمام افراد' خواہ وہ ہندو' مسلم' سکھ' عیسائی اور پارسی ہوں' سب ایک قوم ہیں' جبکہ ہم نے کہا کہ ہم اس بات کو صحیح نہیں مانتے' ہماری قومیت ہمارے مذہب کے ساتھ وابستہ ہے۔

اسلامی تعلیمات کی رو سے اسلامی ریاست میں غیر مسلم کی حیثیت ذِمی کی ہے۔ بدقسمتی سے مغرب نے ہمارے ساتھ بہت بڑا داؤ کھیلا ہے۔ چنانچہ ہماری ہر وہ چیز جو اسے پسند نہیں تھی اسے گالی بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس کا مزید الم ناک پہلو یہ ہے کہ اس گالی کو مغرب نے اتنا اچھالا کہ اپنے بھی کہنے لگے کہ ہم کب ایسا کہتے ہیں' ہم پر تو یہ خواہ مخواہ کی تہمت ہے۔ حالانکہ ''ذمی'' کوئی قابل مذمت اصطلاح نہیں' یہ تو درحقیقت لفظ ''ذِمہ'' سے بنا ہوا ہے' اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ اسلامی ریاست یا نظامِ خلافت غیر مسلموں کی جان' مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہے۔''

(کتاب: خلافت کی حقیقت)

جماعتی زندگی مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے ضروری ہے

''اس سب کے باوجود جہاں تک ایک جماعتی زندگی کا تعلق ہے' اس کے بارے میں میرا احساس یہ ہے کہ جس طرح یہ مردوں کے لیے ضروری ہے اسی طرح خواتین کے لیے بھی ضروری ہے۔ اس لیے کہ جماعتی زندگی میں ایک برکت ہے۔ اس سے نیکی و بھلائی کا ماحول پیدا ہوتا ہے اور دوسرے ساتھیوں کو اچھے کاموں اور نیکیوں میں آگے بڑھتے دیکھ کر اپنا حوصلہ بھی بڑھتا ہے۔ جب آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کے کسی رفیق یا رفیقہ نے اپنے گھر میں ہونے والے کسی غلط کام کو ترک کر دیا ہے یا ترک کروا دیا ہے تو آپ میں بھی ایسا کرنے کا جذبہ اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ جماعتی زندگی کی برکتوں اور فوائد سے عورتوں کو بھی محروم نہیں رکھا گیا۔ اس کے لیے سورۃ التوبہ کی آیت ۷۱ کا مطالعہ کیجیے۔ فرمایا:

﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝﴾

''مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے روکتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں' زکوٰۃ ادا کرتے ہیں' اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ ہیں کہ جن پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے گا' یقیناً اللہ تعالیٰ زبردست اور حکمت والا ہے۔''

اور یہ جماعتی ماحول کی برکات ہی کا مظہر ہے کہ حضور ﷺ نے خواتین سے بھی

بیعت لی۔ نتیجتاً خواتین میں بھی یہ احساس پیدا ہو گیا کہ ہم ایک اجتماعیت میں شریک ہیں' ہمارا کسی کے ساتھ کوئی ربط و تعلق ہے' ہمیں ان کے احکامات سن کر ان پر عمل کرنا ہے' نیکی کے کام بجالانے ہیں' کیونکہ ہم نے قول و قرار کیا ہے۔ اس سے خود احتسابی کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اب اگر ہم یہ کام نہیں کر رہے تو گویا اپنے عہد کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔

چنانچہ ہم نے بھی تنظیم اسلامی میں خواتین کا ایک حلقہ رکھا ہے اور ہمارے ہاں ان کی بیعت کا سلسلہ بھی موجود ہے۔ ہماری تمام تر خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ ہم تمام معاملات میں کتاب و سنت سے اور اسوۂ رسول ﷺ کی عملی مثالوں سے حتی الامکان قریب ترین رہنے کی کوشش کریں۔ جس طرح حضور ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل h سے ایک مرتبہ فرمایا تھا: ''میرے قریب آ جاؤ''۔ پھر فرمایا: ''میرے اور قریب آ جاؤ!'' تو اسی طرح ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ حضور ﷺ کا جو طریقہ و اسوہ تھا اس سے قریب سے قریب تر رہنے کی امکانی کوشش جاری رکھیں۔ لہٰذا ہم نے اقامتِ دین اور اسلامی انقلاب کی جدوجہد کے لیے جو تنظیم اسلامی قائم کی ہے اس میں جہاں تک منکرات سے اجتناب اور اقامتِ دین اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے جہاد و انفاق کے ضمن میں سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۱ کے مطابق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ''بیع'' کا معاملہ ہے اس میں تو مردوں اور عورتوں سب کو شامل کیا گیا ہے' البتہ ''سمع و طاعت فی المعروف'' کے نظم کی پوری شدت کے ساتھ پابندی کی ''بیعت'' جس کے الفاظ متفق علیہ حدیث سے ماخوذ ہیں' صرف مردوں کے لیے رکھی گئی ہے' جبکہ خواتین کے لیے بیعت کے وہی الفاظ اختیار کیے گئے ہیں جو سورۃ الممتحنۃ کی آیت ۱۲ میں وارد ہوئے' اور جن میں نبی اکرم ﷺ کی اطاعت کا ذکر اوّلاً تو ''سمع و طاعت'' کے مثبت اسلوب میں نہیں بلکہ صرف اس منفی انداز میں ہے کہ ''آپؐ کی نافرمانی نہیں کریں گی'' اور ثانیاً' یہاں خود نبیؐ کی اطاعت کے ضمن میں بھی ''معروف'' کی قید کا اضافہ غمازی کر رہا ہے کہ جس قسم کا چاق و چوبند نظم مردوں سے مطلوب ہے خواتین کا معاملہ اس درجہ کا نہیں۔ البتہ خواتین کی تنظیم میں

شمولیت اور بیعت اس لیے ضروری ہے کہ اس سے ان میں ایک تنظیم اور اجتماعیت کا شعور اور مسئولیت و ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے' جو فی نفسہٖ مطلوب ہے' تاہم جیسا کہ میں تفصیل سے عرض کر چکا ہوں' اقامتِ دین کی جدوجہد میں ان کی ذمہ داریاں مردوں کی ذمہ داریوں سے بہت مختلف ہیں اور فرائض دینی کی اس تیسری بلند ترین منزل پر ان پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں' وہ بالواسطہ ہیں۔ وہ اگر اس سطح کی جدوجہد میں اپنے آپ پر خواہ مخواہ ایسی ذمہ داریاں عائد کر لیتی ہیں جن کا اللہ نے انہیں مکلّف نہیں ٹھہرایا تو اس سے اندیشہ ہے کہ بجائے خیر کے کوئی شر پیدا ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس طرزِ عمل سے محفوظ رکھے اور ان ذمہ داریوں کو کما حقہٗ ادا کرنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے جو اس نے ہم پر عائد کی ہیں!'' (کتاب: مسلمان خواتین کے دینی فرائض)

''نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت صرف تبلیغ نہیں ہے بلکہ غلبۂ دین حق ہے۔ ان دونوں باتوں میں زمین آسمان کا فرق موجود ہے۔ اگر فقط تبلیغ کرنی ہوتی تو شاید حضور ﷺ کبھی ہاتھ میں تلوار نہ لیتے۔ لیکن غلبۂ دین حق کے لیے ہاتھ میں تلوار لیے بغیر چارہ نہیں۔ اسی حقیقت کے منکشف ہونے سے تو ساری بات کھلتی ہے۔ تبلیغ تو بدھ مت کے بھکشو بھی کرتے ہیں۔ آخر یہ عیسائی مشنری والے بھی تو تبلیغ میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ مگر یہ تبلیغ جس سطح پر کر رہے ہیں اس میں کسی تصادم کی ضرورت نہیں پیش آتی' اس لیے کہ محض تبلیغ کے کچھ اور تقاضے ہوتے ہیں' جب کہ غلبۂ دین کے کچھ اور تقاضے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت ہی غلبۂ دین حق ہے۔ اسی لیے فرما دیا کہ یہ مشرکوں کو بہت ہی ناگوار ہوگا۔'' (کتاب: خلافت کی حقیقت)

انقلابِ نبویؐ پر یہودیت کا حملہ

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت پہلے دس سال تک اُسی دورِ فاروقی کی سی شان کا حامل رہا۔ لیکن اب اس پر یہود کی طرف سے بڑا زبردست وار ہوا۔ یہود نے اس کے لیے جو سازش تیار کی وہ اپنے نقطۂ عروج کو پہنچی ہوئی سازش ہے۔ دنیا گواہ ہے کہ یہودیوں کی سازشوں نے بڑی بڑی سلطنتیں اُلٹ کر رکھ دیں۔ علامہ اقبال کا مشاہدہ ہے کہ ع ''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!'' ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا صدر ہر وقت خائف رہتا ہے کہ کہیں یہودی ناراض نہ ہو جائیں' ورنہ کوئی نہ کوئی سکینڈل شروع ہو جائے گا۔ یمن کا ایک یہودی عبداللہ بن سبا اسلام کا لبادہ اوڑھ کر آیا اور اس نے اپنی سازش کا جال پوری سلطنت میں پھیلا دیا۔ تاریخ اپنے آپ کو دوہرا رہی ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ پال (Paul) ساری عمر حضرت مسیح علیہ السلام کی مخالفت کرتا رہا' مگر پھر اُس نے ایسا داؤ کھیلا کہ عیسائیت کا لبادہ اوڑھ کر اس کی جڑ کاٹ دی۔ اُس نے توحید کی جڑ کاٹی' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو الوہیت میں شریک کر دیا اور اس طرح عیسائیت میں انسان پرستی کو داخل کر دیا۔ واقعۂ صلیب پر ایسی جذباتی فضا پیدا کی کہ دینِ حق کہیں کا کہیں رہ گیا اور عیسائیت کی بنیاد تثلیث اور مظلومیتِ مسیح پر قائم ہوگئی۔ یہ مثال اس لیے پیش کر دی گئی ہے کہ مبادا آپ کو یہ خیال ہو کہ ایک یہودی عبداللہ بن سبا اتنا بڑا کام کیونکر کر سکتا ہے؟ آپ دیکھ لیجیے' کیا پال اکیلا نہ تھا؟ مگر اس نے مسیحیت کا نقشہ ہی تبدیل کر دیا۔ معلوم ہوا کہ ایک غیر معمولی ذہنی صلاحیت رکھنے والا آدمی اکیلا ہی بہت کچھ کر سکتا ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن سبا نے اسلام کا لبادہ اوڑھا اور خلافتِ راشدہ کے خاتمے اور مسلمانوں کو باہم لڑانے کے منصوبے پر کام شروع کر دیا۔ کانا پھوسی کی ایک مہم شروع ہوگئی کہ حکومت و سلطنت تو آنحضور ﷺ کے خاندان' یعنی آپؐ کے اہل بیت' بیٹی کی نسل یا داماد کا حق تھا'

یہ کسی اور کے پاس کیسے چلی گئی؟

قبائلی عصبیت کے بارے میں یاد رکھیے کہ یہ دورِ نبویؐ میں بالکل ختم نہیں ہو گئی تھی۔ چنانچہ ایسے واقعات موجود ہیں کہ کبھی انصار و مہاجرین کے درمیان تلواریں کھنچ جاتی تھیں اور کبھی اوس و خزرج کے درمیان۔ یہ تو آنحضورﷺ کا وجودِ مسعود تھا جس کی وجہ سے بات آگے نہیں بڑھتی تھی۔ قبائلی عصبیت کی چنگاری دب تو گئی تھی مگر موجود ضرور تھی' اور سازشی ذہن کی ذہانت و فطانت یہی ہے کہ دیکھے کہ چنگاری کہاں دبی ہوئی ہے جسے پھونک مار کر بھڑکا دیا جائے۔ چنانچہ اس چیز کو اٹھانا تھا کہ کہانیاں کھڑی ہو گئیں' فلسفے جنم لینے لگے۔ حضرت عثمانؓ پر ذاتی طور پر تہمتیں تراشی گئیں' قصے مشہور ہو گئے۔ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ دوسرے کے بارے میں اچھی بات مشکل سے مانتا ہے' مگر بُری بات کو فوراً قبول کر لیتا ہے۔ جیسے آنحضورﷺ کے زمانے میں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر بڑی گھٹیا تہمت لگی' اور قرآن گواہ ہے کہ بعض مؤمنین صادقین بھی اس میں ملوث ہو گئے۔ یہ انسان کی فطری کمزوریاں ہیں۔ بہرحال اب تو وقت کے دریا میں بہت سا پانی گزر چکا تھا۔ رسول اللہﷺ کے انتقال کو لگ بھگ پچیس سال ہونے کو آئے تھے' ربع صدی بیت گئی تھی' کبار صحابہؓ کی بڑی تعداد اُٹھ گئی تھی۔ چنانچہ اب تو افواہوں کے لیے پہلے کے مقابلے میں میدان کہیں زیادہ ہموار تھا۔ افواہوں کی مہم اس طرح چلائی گئی کہ اگر شام میں ہیں تو مصر کے گورنر کی برائی ہو رہی ہے' اور حجاز میں ہیں تو شام کے گورنر کی برائی ہو رہی ہے۔ اس طرح ہر جگہ حضرت عثمانؓ کی برائی ہو رہی ہے کہ انہوں نے گورنروں کی تقرری میں دیانت داری سے کام نہیں لیا۔ یہ ہے اصل بنیاد الفتنة الکبریٰ کی۔ یہ ہے وہ محرک جس نے تاریخِ اسلامی کے پہلے عظیم فتنے کی بنیاد ڈالی۔ اور یہ عجیب تاریخی حقیقت ہے کہ فتنہ پردازی کے لیے شیعانِ علیؓ کے نام کا لبادہ اوڑھا گیا اور اس کے لیے ایران کی زمین بہت زرخیز ثابت ہوئی۔

مَیں نے عرض کیا تھا کہ مذہب کی سطح پر انقلابِ نبویؐ سے سب سے زیادہ متأثر اور زخم خوردہ (aggrieved) یہودیت تھی' سبائیت اسی کا شاخسانہ ہے۔ جبکہ مملکت کی سطح

پر سب سے زیادہ زخم خوردہ ایرانی قوم تھی' جو بڑی نسل پرست قوم تھی۔ چنانچہ پہلا وار ایرانیوں نے کیا' حضرت عمرؓ شہید ہو گئے اور دوسرا وار یہودیت نے کیا' حضرت عثمانؓ کی شہادت ہوگئی۔ اور پھر ان دونوں فتنوں نے ایک مشترکہ شکل اختیار کر لی' جس کا مرکز ایران بن گیا۔ اتفاقی طور پر نہیں' بلکہ یہاں اس کو سازگار ماحول مل گیا کہ اس کی جڑیں اس سرزمین میں نیچے اتر سکیں جہاں یہ دونوں رشتہ داریاں (affinities) جمع ہو سکیں۔''

(میثاق' ستمبر ۲۰۰۷ء)

مناقشاتِ صحابہؓ کے بارے میں معتدل رائے

''اس ضمن میں معتدل رائے یہی ہے کہ صحابہ کرامؓ کے مابین جو مناقشات ہوئے ان میں کسی کی بدنیتی کا کوئی دخل نہیں۔ صرف غیروں کا ڈالا ہوا پیچ تھا جو اِس عیاری کے ساتھ ڈالا گیا کہ انتہائی خلوص کے باوجود حل نہیں ہوا۔ لیکن الزام نہ حضرت عثمانؓ پر آتا ہے' نہ حضرت علیؓ پر' نہ حضرت معاویہؓ پر' نہ حضرت عمرو بن العاصؓ پر اور نہ حضرت عائشہ صدیقہؓ پر' کیونکہ ''اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْلٌ!'' پیچیدگیاں واقعتاً پڑی ہیں مگر ڈالی اغیار نے ہیں' اور اس طرح ڈالی ہیں کہ ان کا حل ممکن نہ ہوا۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے باہمی اختلاف کے بارے میں اہل سنت کا تقریباً اجماع ہے کہ غلطی حضرت معاویہؓ کی تھی' لیکن غلطی اور شے ہے' بدنیتی اور شے ہے' ان دونوں کو ایک دوسرے سے بالکل جدا رکھیں۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ نبی کے سوا معصوم کوئی نہیں ہوتا' غیر نبی سے خطا ہو سکتی ہے' غلطی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ غلطی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے

بھی ہوسکتی ہے' حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ سے بھی ہوسکتی ہے اور حضرت معاویہؓ سے بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن اجتہادی غلطی پر بھی اجر ملتا ہے۔ آپ نے نیک نیتی سے ایک فیصلہ کیا' اگرچہ غلط ہوگیا' مگر اس میں نیت کے اخلاص پر بھی اجر ہے۔ یہ ہے اہل سنت کا موقف!

اس اعتبار سے اہل سنت اور اہل تشیع کے موقف میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان کے نزدیک حضرت علیؓ حق پر تھے اور معصوم تھے' اور جو معصوم کے مقابلے میں آیا اس کا تو اسلام بھی معتبر نہیں۔ اہل سنت کے نزدیک حضرت علیؓ معصوم نہیں' خطا ان سے بھی ہوسکتی تھی۔ اس اعتبار سے اگر کوئی کہتا ہے کہ خطا حضرت معاویہؓ کی تھی' اگرچہ بدنیتی نہ تھی' تو یہ بات درست ہے۔ اور اگر کسی کا یہ خیال ہو کہ نہیں' غلطی حضرت علیؓ کی تھی تو وہ حالات و واقعات اور دلائل و براہین کی بنیاد پر کہہ سکتا ہے۔ کیونکہ معصومیت نہ اِدھر حائل ہے نہ اُدھر۔ پھر یہ بھی مدنظر رہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان تھا کہ معاویہ! پہلے تم بیعت کرو' پھر مَیں قاتلین عثمانؓ سے قصاص لوں گا' جبکہ حضرت معاویہؓ کے سامنے زمینی حقائق تھے' ان کو نظر آ رہا تھا کہ قاتلینِ عثمانؓ اِس وقت حضرت علیؓ پر چھائے ہوئے ہیں' جوں ہی مَیں نے بیعت کی ان کے ہاتھوں میری گردن سلامت نہیں رہے گی' آگے قاتلینِ عثمانؓ گرفت میں آتے ہیں یا نہیں' اس کا کچھ پتا نہیں! تو یہ ہے وہ چکر جس نے سب کو حیران و سرگرداں کر دیا تھا۔ لہٰذا اس کا الزام نہ حضرت عثمانؓ کو دیجیے' نہ حضرت علیؓ کو اور نہ ہی حضرت معاویہؓ کو۔ یہ تو اغیار کا پیدا کردہ ایک چکر اور پھندا تھا جس نے اُمت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا' جس سے اُمت آج تک آزاد نہیں ہوسکی۔''

(میثاق' ستمبر ۲۰۰۷ء)

اسلام میں زکوٰۃ کا نظام اور اس کی برکات

''اسلام کے قانونی معاشی نظام میں یہ management زکوٰۃ کے نظام کے ذریعے سے قائم ہوتی ہے۔ یعنی اسلام نے یہی شے اس سے بہتر انداز میں عطا کی ہے۔ اسلام نے ایک حد قائم کر دی کہ جو اس حد سے آگے نکل جائیں وہ دینے والے (doners) ہیں اور جو اس حد سے پیچھے رہ جائیں وہ لینے والے (recipients) ہیں۔ دینے والوں کو haves اور لینے والوں کو have-nots شمار کریں یا وین کی اصطلاح میں ان کو بالترتیب ''صاحبِ نصاب'' اور ''مسکین'' (غریب) شمار کریں۔ حضور ﷺ نے زکوٰۃ کے بارے میں فرمایا: ((تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَاءِ هِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَاءِ هِمْ)) ''وہ (زکوٰۃ) مسلمانوں کے مالداروں سے وصول کی جائے گی اور غرباء میں تقسیم کی جائے گی''۔ معاشرے میں معاشی اعتبار سے پیدا ہونے والی ناہمواری کو کم کرنے کے لیے اسلام نے زکوٰۃ کا مکمل نظام قائم کیا ہے۔ اس میں نصاب کی حد مقرر کی گئی ہے اور پھر اس میں مقداریں ہیں۔ یوں سمجھئے کہ چودہ سو برس قبل معاشی فرق و تفاوت کو کم کرنے کی ضرورت اسلام نے زکوٰۃ کے نظام سے پوری کر دی تھی۔ اس لیے کہ اسلام میں بھی آزاد معیشت ہے اور جہاں بھی آزادی ہوگی وہاں کچھ نہ کچھ فرق ضرور آئے گا۔ اس فرق کو زکوٰۃ اور عشر کے نظام کے ذریعے کم کیا گیا ہے۔ اسلام کے نظامِ معیشت کے ''اندرونی انضباط'' اور سرمایہ وارانہ نظام کے اندرونی انضباط (internally management) میں بہت فرق ہے۔ ایک فرق یہ ہے کہ صاحب نصاب اور مسکین کی تقسیم الل ٹپ (arbitrary) نہیں ہے۔ اسے آپ اپنے اختیار سے آگے پیچھے نہیں کر سکتے۔ ''فقیر'' کے لفظ سے ذرا مغالطہ ہو جاتا ہے کہ فقیر شاید وہی ہے جو ہاتھ پھیلا رہا ہو، مانگ رہا ہو اور جسے فاقہ آ رہا ہو۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ اسلام میں نصاب کی ایک

لائن کھینچ دی گئی ہے کہ جس کے پاس ساڑھے سات تولے سونا یا باون تولے چاندی ہے وہ اس لائن سے اوپر ہے اور زکوٰۃ کا ادا کنندہ ہے اور جس کے پاس اتنا سونا یا چاندی نہیں ہے وہ اس لائن سے نیچے ہے اور زکوٰۃ کا وصول کنندہ ہے۔ اسی طرح اونٹ' گھوڑے اور بھیڑ بکریوں کا نصاب ہے۔ اب جو اس سے اوپر ہیں وہ غنی ہیں' اور جو نیچے رہ گئے ہیں وہ فقیر ہیں۔

ان دونوں نظاموں میں دوسرا اور اہم ترین فرق یہ ہے کہ اسلام کی اخلاقی تعلیم جہاں انفاق یعنی خرچ کرنے پر زور دیتی ہے وہاں اس کا ایک تکمیلی جزو (counter part) یہ ہے کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور سوال کرنے کو انتہائی مذموم اور صدقات کو ''اَوْسَاخُ النَّاسِ'' (لوگوں کا میل کچیل) قرار دے کر نہ صرف لوگوں کو ترغیب دی ہے بلکہ غیرت انسانی کو بھی جھنجھوڑا گیا ہے کہ زکوٰۃ و صدقات کو مت قبول کرو۔

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اُس نے یہ ہے میری خدائی کی زکوٰۃ!

ایک غیرتِ فقر بھی ہے کہ محنت اور کوشش کر کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو' روکھا سوکھا کھاؤ مگر سوال مت کرو اور لوگوں کے ہاتھوں کی میل کچیل سے اپنے پیٹ مت بھرو۔ ہم نے اس طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ یہ اصل فرق ہے جس کی وجہ سے آج سیکنڈے نیوین سوشلزم اپنی بربادی تک پہنچ گیا ہے۔ اس لیے کہ جب بنیادی ضروریاتِ زندگی بغیر محنت کے حاصل ہو رہی ہوں تو کام کا محرک (incentive) کیوں رہے گا؟ انسان کو حیرت ہو سکتی ہے کہ ویلفیئر کا ایسا نظام ہے تو ان کی آمدنی کیا ہے؟ یہ ملک کیسے چل رہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ملک اس لیے قائم چلے آ رہے ہیں کہ وہ اپنے دفاع پر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کر رہے۔ جب جرمنی نے وہاں قدم جمانے چاہے تھے تو انہوں نے بالکل کھلم کھلا کہہ دیا تھا کہ آیئے اور ہمارا ملک سنبھالیے۔ ان کا پورے کا پورا ڈیفنس امریکہ کے ہاتھ میں ہے۔ امریکہ پوری تھرڈ ورلڈ کا پیسہ چوس رہا ہے اور اس کے بل بوتے پر وہ اپنی اکانومی کی بساط بچھائے بیٹھا ہے۔ ان ممالک میں اگر دفاع کے اوپر اس طرح کا خرچ ہونے لگے جس طرح باقی ممالک میں ہوتا ہے تو ان کا ویلفیئر سٹیٹ کا نظام کبھی بھی

چل نہیں سکتا۔

اسلام نے معاشرے میں مالی فرق و تفاوت کو کم کرنے کے لیے ایک طرف زکوٰۃ کا نظام رائج کیا ہے تو دوسری طرف لوگوں کو اس سے دور رہنے کی تلقین کی ہے۔ ایک طرف قرآن نے فرمایا: ﴿وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿٢٤﴾ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿٢٥﴾﴾ (المعارج) ''ان کے مالوں میں معین حق ہے سائل کے لیے بھی اور محرومین کے لیے بھی''۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَاَمَّا السَّاۗىِٕلَ فَلَا تَنْهَرْ ﴿١٠﴾﴾ (الضحی) ''کسی سائل کو مت دھتکارو، مت جھڑکو'' —— کہیں باقاعدہ ایک مد معین کی جاتی ہے: ﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰي حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّاۗىِٕلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ﴾ (البقرۃ: ۱۷۷) ''اور اُس نے دیا مال اس کی محبت کے باوجود قرابت داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں اور مانگنے والوں کو اور گردنوں کے چھڑانے میں''۔ اس سے ایک اشتباہ ہوتا ہے کہ شاید اسلام مانگنے اور سوال کرنے کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔

یہاں اسلام کی تعلیمات کے دوسرے پہلو کو بھی سامنے رکھیں کہ اسلام میں سوال کرنے کی انتہائی مذمت ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلٰى))(۱) ''دینے والا ہاتھ بہتر ہے لینے والے ہاتھ سے''۔ بہتر بنو کہتر کیوں بنتے ہو؟ اور دوسری طرف ان صدقات کو لوگوں کا میل کچیل قرار دیا۔

ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھیے تو معلوم ہوگا کہ اسلام میں سوال کرنے کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے وہ واقعات سنے ہوں گے کہ اسلامی تاریخ میں وہ وقت آ گیا تھا جس میں خوشحالی کی ایک انتہا کا نقشہ نظر آتا ہے کہ لوگ اموالِ زکوٰۃ لیے پھرتے تھے اور لینے والا کوئی نہیں تھا۔ اس میں ایک اشکال یہ ہو جاتا ہے کہ خلافت راشدہ میں تو حکومتی سطح پر مال کی زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی تو یہ لوگ کیسے زکوٰۃ کا مال لیے پھرتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دورِ خلافت راشدہ میں اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ خود دینی ہوتی تھی جبکہ اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ کی وصولی ریاست اور حکومت کی سطح پر ہوتی تھی۔ اب لوگ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ دینے کے لیے پھر رہے ہوتے اور لینے والا کوئی نہ ملتا۔ اس میں یقیناً ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جس تیزی سے فتوحات ہوئیں اور مالِ غنیمت آیا اس سے

عمومی خوشحالی پیدا ہوگئی' تو اب کون ہے جو اس کو قبول کرنے والا ہو؟ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ ان پر اخلاقی تعلیمات کا بھی کافی اثر تھا۔ پھر اس معاملے میں مزید زور پیدا کرنے کے لیے نبی اکرم ﷺ نے اپنی ذات اور اپنے خاندان کے لیے زکوٰۃ اور صدقات کو حرام قرار دے دیا' البتہ ہدیہ کو جائز قرار دیا۔ یہ وہ بنیادی بات اور بنیادی پہچان تھی جو ایک عیسائی راہب نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو بتائی تھی کہ نبی آخر الزماں ﷺ کی ایک پہچان یہ ہوگی کہ وہ صدقہ قبول نہیں فرمائیں گے' البتہ ہدیہ قبول کرلیں گے۔

اس تمام گفتگو سے یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ اسلام نے مترفین اور محرومین کے مابین مالی فرق و تفاوت کو کم کرنے کی غرض سے اپنے معاشی نظام کی management کے لیے زکوٰۃ اور عشر وغیرہ کا اہتمام کیا ہے۔ اس کو آپ اجتماعی (collective) انشورنس بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی کی بنیاد پر اسلامی ریاست اپنے شہریوں کی بنیادی ضروریات کی کفیل ہے۔ اس کو آپ subsistance allowance کہہ لیں' unemployment allowance کہہ لیں یا ویلفیئر کہہ لیں' کہ بنیادی ضروریات کی ذمہ دار ریاست ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست فی الحقیقت ایک ویلفیئر سٹیٹ کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو ''کفالتِ عامہ'' کی ذمہ داری جس حد تک قبول کرتی ہے اس کا کسی قدر اندازہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے کیا جا سکتا ہے کہ ''اگر دجلہ و فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر گیا تو قیامت کے روز اس کی ذمہ داری بھی عمر پر ہوگی۔''

یہاں یہ بھی نوٹ کرلیں کہ اگر کوئی شخص اپنی عزتِ نفس اپنی ہتھیلی پر رکھ کر تمہارے سامنے پیش کر دے' تمہارے سامنے دست سوال دراز کرے اور پھر بھی تم اس کو ٹھکرا دو تو یہ تمہاری شرافت اور مروّت کے منافی ہے۔ کچھ دے سکتے ہو تو ضرور دو۔ بعض احادیث میں یہاں تک الفاظ آئے ہیں کہ سائل کو دو چاہے وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آیا ہو۔ تمہیں کیا معلوم اس کے کیا حالات ہیں، اگر نہیں دے سکتے تو اچھے انداز میں رخصت کر دو لیکن دھتکارنے کی' جھڑکنے کی اجازت نہیں ہے''۔

(میثاق' جنوری ۲۰۱۱ء)

انقلابی کارکنوں کی تربیت

''حضرت سید احمد بریلوی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے ان ساتھیوں کی بھرپور تربیت کی تھی جن کو ساتھ لے کر وہ سرحد کے علاقہ میں پہنچے تھے۔ لیکن ان کی اصل جدوجہد پشاور اور مردان کے اضلاع سے شروع ہوئی تھی..... وہاں جا کر اقدام سے پہلے وہاں کے مقامی باشندوں کی تربیت کی بھی ضرورت تھی۔ یا تو وہاں کے تمام خوانین اور رعایا سید صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو قطعی طور پر اپنا امیر تسلیم کر لیتے اور ان کے ہاتھ پر بیعت و سمع طاعت اور جہاد کر لیتے، تب بھی کوئی مضبوط اساس قائم ہو جاتی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ البتہ ایک یا دو قبیلوں کے خوانین نے بیعت کر لی تھی جو کافی نہیں تھی۔ ہوا یہ کہ مقامی لوگوں کی تربیت سے پہلے اور وہاں اپنے آپ کو مستحکم (Consolidate) کرنے سے پہلے، ایک طرف سکھوں کے ساتھ جنگ کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ دوسری طرف اسلامی شریعت کی حدود و تعزیرات نافذ کر دی گئیں، جو مقامی لوگوں کے لیے بڑی شاق تھیں۔ اس لیے کہ وہ لوگ ایک مدت سے دین کے صحیح و حقیقی علم سے ناواقف تھے، اور اگرچہ وہ مسلمان تھے لیکن ان میں سے اکثر حقیقی ایمان کے لذت آشنا نہیں تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی اکثریت نے سید صاحب کے خلاف سازشیں کیں، آپ کو زہر دیا گیا، مجاہدین کے کیمپوں پر شب خون مارا گیا اور بے شمار مجاہدین کو شہید کر دیا گیا۔ آپؑ کے خلاف مخبری کی گئی اور سکھوں کو مجاہدین کے لشکر کی نقل و حرکت اور اس کی قوت و وسائل کی خبریں پہنچائی گئیں۔ الغرض مقامی لوگوں کی اکثریت کی ناپختہ سیرت و کردار اور عدم تربیت کے باعث یہ عظیم اسلامی تحریک دُنیوی اعتبار سے ناکام ہو گئی۔''

پرویز مشرف سے میری ملاقات

''صدر پرویز مشرف نے ۱۶ ستمبر ۲۰۰۱ء کی صبح صحافیوں کی ایک کانفرنس بلائی تھی اور تیسرے پہر علماء اور مشائخ کی۔ اس کانفرنس میں' میں نے ان سے صاف کہا کہ اگر آپ نے اس وقت افغانستان کے خلاف امریکہ کی مدد کی تو یہ عدل وانصاف کے مسلمہ اصولوں کی خلاف ورزی ہوگی' کیونکہ ابھی کوئی جرم ثابت نہیں ہوا ہے' نہ طالبان کا اور نہ اسامہ بن لادن کا' تو پھر سزا کیسی؟ دوسرے یہ کہ اگر آپ نے امریکہ کا ساتھ دیا تو ہماری غیرت کا جنازہ نکل جائے گا' کیونکہ ہم نے طالبان کی پشت پناہی کی تھی اور ان کو مدد دی تھی۔ آج بھی ان کے سفیر ملاضعیف اس کانفرنس میں ہمارے ساتھ موجود ہیں۔ اب اگر ہم صرف ایک دھمکی پر بتاشے کی طرح بیٹھ گئے تو پاکستان کی عزت وغیرت ختم ہو کر رہ جائے گی۔ ع 'حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے''۔ تیسری بات یہ کہ اگر آپ ایک مسلمان حکومت کے خلاف کافر حکومت کا ساتھ دیں گے تو یہ اللہ اور اللہ کے دین کے خلاف بغاوت ہوگی۔ چوتھی بات یہ کہ آپ بتا رہے ہیں کہ اس سے ہمیں بہت فائدے حاصل ہوں گے' کشمیر کا مسئلہ حل ہو جائے گا' ہمارے ایٹمی پروگرام کو حفاظت مل جائے گی' جبکہ یہ کچھ نہیں ہوگا' یہ تو صرف وقتی طور پر آپ کو سنہری چاند نظر آ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پھر آپ کی باری بھی آ کر رہے گی' کیونکہ اس کے پیچھے یہودی ہیں''۔

(میثاق نومبر ۲۰۰۹ء)

دنیا کا واحد جامع ترین انقلاب

''آنحضور ﷺ کا برپا کیا ہوا انقلاب دو اعتبارات سے دنیا کے بڑے بڑے انقلابات سے انتہائی ممیّز ہے۔ ایک تو جامعیت کے پہلو سے۔ اس لیے کہ دنیا میں جتنے بڑے بڑے انقلابات کا شہرہ ہے وہ سب کے سب جزوی انقلابات تھے۔ انقلابِ فرانس کے نتیجے میں صرف ہیئتِ حاکمہ یا طرزِ حکومت بدلا ہے' اخلاق نہیں بدلے' نظریات نہیں بدلے' کردار نہیں بدلا' تہذیب وتمدن اور معاشرت کا نقشہ نہیں بدلا' مذہب نہیں بدلا' عقائد نہیں بدلے' صرف ایک انتظامی ڈھانچہ بدلا ہے۔ ظاہر ہے طرزِ حکومت کی تبدیلی محض ایک جزوی انقلاب ہے۔ اسی طرح بالشویک ریوولیوشن اگرچہ اپنے اثرات کے اعتبار سے اور اپنی وسعت کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا انقلاب شمار ہوتا ہے' لیکن یہاں بھی تجزیہ کیجیے تو ثابت ہوگا کہ وہ بھی جزوی انقلاب ہے۔ نظریات میں بنیادی طور پر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ پہلے سے موجود مادّہ پرستی (Materialism) نے ایک قدم آگے بڑھا کر جدلی مادیت (Dialectical Materialism) کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہ گویا مادیت کا اگلا قدم ہے۔ انقلاب کہتے ہیں تبدیلی کو' لیکن یہاں تبدیلی کوئی نہیں آئی۔ مادیت کی جگہ روحانیت کا آغاز ہو تو وہ انقلاب ہوگا۔ مادیت ہی کے راستے پر آپ ایک قدم اور آگے بڑھ گئے تو اس میں انقلاب کا کوئی پہلو نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہاں کیا چیز بدلی؟ بس ایک کوشش کی گئی کہ کسی ملک کے وسائل پیداوار اور ذرائع پیداوار کو اجتماعی ملکیت میں لا کر ایسا انتظام کیا جائے کہ وہاں کے رہنے والے سب کے سب اس سے متمتع ہوں۔ اس مقصد میں کتنی کامیابی ہوئی اور جو ہوئی وہ کس cost پر ہوئی' اس کو چھوڑیے۔ اِس وقت اس انقلاب کا حوالہ صرف اس اعتبار سے دیا گیا ہے کہ وہ بھی ایک جزوی انقلاب تھا۔

اس پس منظر میں اب نبی اکرم ﷺ کے انقلاب کو دیکھئے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ

یہاں آپ کو خوردبین لگا کر ڈھونڈنا پڑے گا کہ کیا چیز نہیں بدلی! عقائد بدلے' اخلاق بدلے' انفرادی زندگی بدلی' ہیئت اجتماعیہ کا نقشہ بدلا۔ ایک قوم جس میں لکھے پڑھے لوگ گنتی کے تھے وہ قوم علوم وفنون کی موجد اور نوعِ انسانی کی معلم بن گئی۔ وہ قوم جس میں کوئی تنظیم نہ تھی' ایسی منظم ہوئی کہ نہ صرف میدانِ جنگ میں اُس کی تنظیم بے مثال قرار پائی' بلکہ وہ عبادت بھی کر رہی ہے تو ایک امام کے پیچھے صف بستہ ہوکر۔ گویا زمین بدل گئی' آسمان بدل گیا۔ کوئی چیز ایسی نہیں جسے آپ کہہ سکیں کہ وہی رہ گئی جو پہلے تھی۔ یہ ہے ہمہ گیر انقلاب کہ پوری انسانی تاریخ میں اس کا کوئی متوازی نہیں' اس کی کوئی نظیر نہیں۔

ایک دوسری خصوصیت کے اعتبار سے بھی اس انقلاب کی پوری انسانی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ دنیا میں جو انقلابات واقع ہوتے ہیں تو انقلاب کا فکر دینے والا کوئی اور ہوتا ہے اور اس انقلاب کو برپا کرنے والے کچھ اور لوگ ہوتے ہیں۔ انسانوں میں بالعموم جامعیت نہیں پائی جاتی۔ جس شخص کی فکر اور سوچ کی قوتیں زیادہ فعال (developed) ہوتی ہیں اس میں قوتِ عمل کم ہوتی ہے اور جس کے قوائے عملیہ زیادہ چاق وچوبند ہوتے ہیں عام طور پر اس کی سوچ کی قوتیں اتنی بیدار نہیں ہوتیں۔ لہٰذا انقلابات کا معاملہ ایسا ہی نظر آتا ہے کہ مفکر کوئی اور ہوتا ہے اور عملی راہنما کوئی اور بنتا ہے۔ چنانچہ انقلابِ فرانس کی پشت پر فکر تو والٹیئر' روسو اور دوسرے مفکرین کا تھا' لیکن انقلاب بالفعل کچھ اوباش لوگوں کے ہاتھوں آیا۔ ان مفکرین کا اس کی عملی رہنمائی میں ذرہ برابر بھی دخل نہیں۔ اسی طرح بالشویک انقلاب کا مفکر کارل مارکس (۱۸۱۸ء تا ۱۸۸۳ء) تھا' لیکن اس کی زندگی میں کسی ایک گاؤں میں بھی انقلاب کا سوال پیدا نہیں ہوا۔ یہ تو اس کی موت کے کئی سال بعد ایک بالکل دوسرے ملک میں ایک فعال شخص لینن (۱۸۷۰ء تا ۱۹۲۴ء) کے ہاتھ میں وہ فلسفہ آیا اور اس نے اس کی بنیاد پر انقلاب برپا کر دیا۔

اس پس منظر اور اس context میں نبی اکرم ﷺ کی جدوجہد کا جائزہ لیجیے۔ فردِ واحد سے دعوت کا آغاز ہوا اور کل تیئیس برس میں انقلاب برپا ہوگیا۔ (واضح رہے کہ یہ تیئیس برس قمری حساب سے ہیں' جو شمسی حساب سے بائیس برس بنتے ہیں۔) ایک عرصۂ

زندگی (life span) میں ایک انقلابی جدوجہد کا تمام مراحل سے گزر کر کامیابی سے ہمکنار ہو جانا' اس کی کوئی دوسری مثال تاریخ کے دامن میں موجود نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی دُنیوی زندگی بڑی مختصر رہی ہے' محض اکسٹھ برس۔ ہم جو تریسٹھ برس کہتے ہیں وہ قمری اعتبار سے ہیں' جو دراصل اکسٹھ یا ساڑھے اکسٹھ برس بنتے ہیں۔ ان میں سے قبل بعثت کے چالیس سال نکال دیجیے تو کل ساڑھے اکیس' بائیس برس ہیں' جن میں ایک عظیم انقلاب تمام مراحل طے کر کے پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ پوری نسل انسانی کی تاریخ میں اس کے آس پاس تو کیا' اس کے عشرِ عشیر کی بھی مثال نہیں ملتی۔

اب آیئے اس بات کی طرف جو اس انقلابی جدوجہد کا اہم ترین پہلو ہے' اور جس کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں' کہ یہ پوری جدوجہد زمین پر ہوئی ہے' قدم بقدم چل کر ہوئی ہے' خالص انسانی سطح (human level) پر ہوئی ہے' اور دنیا میں اللہ تعالیٰ کے قواعد وضوابط اور اسباب وعلل کا جو سلسلہ چل رہا ہے' ان کے تحت ہوئی ہے۔ اور اس کو یوں سمجھئے کہ یہ بھی درحقیقت اتمامِ حجت کا ایک پہلو ہے۔ وہ نظام قائم کر کے دکھا دینا اتمامِ حجت ہے پوری نوعِ انسانی پر' اور اس کو ایک عام انسانی جدوجہد کی سطح پر' تمام موانع ومشکلات کے باوجود قائم کر کے دکھانا' ابتدائی دور میں ناکامیوں کا طرح طرح سے سامنا کر کے اور مصائب ومشکلات کو جھیل کر قائم کر کے دکھانا' یہ درحقیقت حجت ہے مجھ پر' آپ پر اور پوری اُمت محمد (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) پر۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہم یہ کہہ سکتے تھے کہ نبی اکرم ﷺ نے تو یہ کام کر دیا' اس لیے کہ آپؐ کو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خصوصیات حاصل تھیں کہ آپؐ کے تو پاؤں میں کانٹا بھی نہیں چبھا' آپؐ کی تو نکسیر تک نہیں پھوٹی' آپؐ کے لیے تو کہیں کوئی دقت اور مشکل پیش آئی ہی نہیں' جبکہ ہمارا معاملہ اور ہے۔ ہم سے یہ مطالبہ کیسے کیا جا سکتا ہے کہ ہم بھی اللہ کے دین کو قائم کریں جیسے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے قائم کیا۔ چنانچہ یہ اتمامِ حجت ہے اُمتِ محمد ﷺ پر۔''

(میثاق اپریل 2007ء)

عورت کا اصل دائرہ کار

''اب آیئے ستر وحجاب اور اسلام میں عورت کے اصل مقام کے مسائل کی طرف۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کے متعلق میری آراء اور میرے نظریات پر' جو دراصل میرے نہیں بلکہ قرآن وسنت کے احکام ہی سے ماخوذ ومستنبط ہیں' اخبارات ورسائل میں میرے خلاف ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ دورِ حاضر کی کچھ عالمہ وفاضلہ اور مفسراتِ قرآن فرمارہی ہیں کہ ''ڈاکٹر اسرار اسلام سے ناواقف ہے' وہ رجعت پسند اور قدامت پسند ہے۔ وہ دقیانوسی نظریات وخیالات رکھتا ہے''۔ اور مطالبہ کررہی ہیں کہ اسے مجلس شوریٰ سے نکالو' اس کا ٹی وی پروگرام ''الہدیٰ'' بند کرو[1] وہ عورتوں کے حقوق غصب کرنا چاہتا ہے' وہ آزادیٔ نسواں کا دشمن ہے۔

ان سب باتوں کے جواب میں' میں اپنی اُن بہنوں سے عرض کروں گا کہ میں نے کبھی عالم دین ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ میں نے اپنے متعلق جب کچھ کہا ہے تو یہی کہ میں قرآن مجید کا محض ایک ادنیٰ طالب علم اور سنت رسولؐ کا ادنیٰ درجے ہی میں سہی ایک والہ وشیفتہ ہوں— رہا رجعت پسندی اور قدامت پسندی کا سوال! تو مجھے اپنی اس رجعت وقدامت پسندی پر فخر ہے کہ میرے لیے اصل معیار حق وباطل وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے جس پر آج سے سوا چودہ سو سال قبل وہ معاشرہ وجود میں آیا تھا جس سے زیادہ صالح معاشرہ اس سینۂ گیتی کے اوپر اور فلک نیلی فام کے نیچے کبھی قائم نہیں ہوا اور جس کی برکات کا کچھ پرتَو اب بھی عالم میں موجود ہے اور جس کی کامل برکات سے بہرہ مند ہونے کے لیے بنی نوع انسان کا اجتماعی ذہن لاشعوری طور پر ہنوز پیاسا' جویا اور متلاشی ہے۔ بقول علامہ اقبال

ہر کجا بینی جہانِ رنگ وبو
زاں کہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ ؐ اُو را بہاست!!
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ؐ است''

(کتاب: اسلام میں عورت کا مقام)

ستر وحجاب سے متعلق ڈاکٹر صاحب کا دعویٰ

البتہ میں قرآن وسنت کے اپنے حقیر مطالعے کی بنیاد پر پورے وثوق' اعتماد اور دعوے سے عرض کروں گا کہ ستر وحجاب کے مکمل قوانین وضوابط قرآن وسنت نے مقرر کیے ہیں' اس مسئلے سے متعلق احکام بڑی تفصیل سے دیئے ہیں' بہت واضح طور پر دیئے ہیں' ان میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ پھر یہ کہ قرآن وحدیث نے عورت کا اصل مقام اس کا گھر قرار دیا ہے۔ میں یہ بھی عرض کرتا ہوں کہ جو شخص کسی درجے میں بھی کتاب وسنت سے تھوڑی سی واقفیت رکھتا ہو اور اس کے دل میں کچھ خوف وخشیت الٰہی بھی موجود ہو وہ میرے اس دعوے کو چیلنج نہیں کر سکتا عورت کے دائرہ کار اور ستر وحجاب کی شرعی حدود کی بحث میں حصہ لینے والے مرد اور خواتین خود کو مسلمان کہتے ہیں' لیکن ان کا رویہ یہ ہے کہ وہ قرآن وسنت کا اتباع اور اسلام کی پیروی کرنے کے بجائے اپنی خواہشات ونظریات کے پیچھے چلنا چاہتے ہیں' لیکن ظاہر یہ کرتے ہیں کہ ان سے زیادہ اسلام کو سمجھنے والا اور اس کا شیدائی کوئی نہیں اور انہیں قرآن وسنت سے انکار نہیں ہے' انہیں انکار ہے تو ''دین ملا'' یا ڈاکٹر اسرار جیسے ''رجعت پسند وقدامت پسند'' لوگوں کے نظریات وافکار سے ہے۔ میں اپنی ان تمام بہنوں سے جو یہاں میری بات سننے تشریف لائی ہیں اور آپ تمام حضرات سے درخواست کروں گا کہ پہلے سے قائم شدہ نظریات وتصورات سے اپنے ذہن کو خالی کر کے قرآن وسنت کی تعلیمات پر معروضی طور پر غور فرمائیے۔ ان شاء اللہ آپ کے سامنے واضح طور پر یہ بات آجائے گی کہ از روئے قرآن وسنت ستر وحجاب کے احکام کیا ہیں اور عورت کا اصل مقام کیا ہے!!

(کتاب: اسلام میں عورت کا مقام)

خواتین کا کھیتوں، کھلیانوں اور دفاتر میں کام کی نوعیت کا اختلاف

دیہات میں عورتیں جو کام کرتی ہیں اس کو خواتین کے دفتروں میں کام کرنے کے جواز کے لیے بڑے زور وشور سے آج کل بطور دلیل پیش کیا جا رہا ہے۔ دیہات کی معاشرت اور شہروں کی معاشرت میں جو فرق وتفاوت ہے اس کو ہمارے بھائی اور بہنیں نظر انداز کر رہی ہیں۔ جب بحث برائے بحث اور ضد برائے ضد کی صورتِ حال پیدا ہو جائے تو ایسی صورت میں اظہر من الشمس جیسی چیزیں بھی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ اس ضمن میں ان میں سے میں عرض کروں گا کہ غور کریں کہ جو خواتین دیہاتوں میں کام کرتی ہیں کیا وہ نامحرموں کے ساتھ کام کرتی ہیں؟ اگر وہ کھیت پر روٹی لے کر جاتی ہیں تو کن کے لیے؟ ظاہر ہے کہ باپ کے لیے، شوہر کے لیے، بھائی یا بیٹے کے لیے لے کر جاتی ہیں۔ اپنے کھیت میں اگر وہ کام کر رہی ہوتی ہیں تو کیا ان کے شانہ بشانہ نامحرم کام کر رہے ہوتے ہیں؟ دیہات میں عورتوں کے کام کا جو ماحول ہوتا ہے وہ اکثر وبیشتر اپنے اپنے گھروں سے متعلق ہوتا ہے جہاں وہ اپنے ڈھور ڈنگروں کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ وہاں نامحرموں کے ساتھ معاملہ نہیں ہوتا۔ یا اگر کوئی عورت کھیت میں کام کرنے جاتی ہے تو وہاں بھی بنیادی طور پر اس کا نامحرموں سے نہیں بلکہ محرموں کے ساتھ ہاتھ بٹانے کا معاملہ ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ ہمارے دفتروں کا جو ماحول ہے اور وہاں خواتین جس سج دھج سے جاتی ہیں اس کو بھی ملحوظ خاطر رکھیے۔ آخر عورت کی فطرت ہے، زیب وزینت اس کی کمزوری ہے۔ کیا دیہات میں کام کرنے والی خواتین اور شہروں کی ان خواتین میں کوئی نسبت ہے؟ اس فرق وتفاوت کو سامنے رکھیے، زمین وآسمان کا فرق ہے۔

اس ضمن میں آخری بات میں یہ عرض کروں گا کہ اگر ہمارے معاشرے میں دیہات میں کوئی غلط چیز ہو رہی ہو تو کیا اس کو سامنے رکھ کر آپ دین کو بدل دیں گے؟ ہماری دینی ذمہ داری تو یہ ہوگی کہ اگر دیہات میں اسلامی تعلیمات کے مطابق طور طریقے رائج نہیں ہیں تو ان

کی اصلاح کی فکر کریں نہ کہ دیہات کے غلط طرزِ عمل اور رسوم ورواج کو دلیل بنا کر اپنی غلط روی کے لیے جواز پیدا کریں! وہاں اگر ستر وحجاب کی پابندی نہیں ہو رہی تو کرانے کی ضرورت ہے' بجائے اس کے کہ وہاں کی کسی غلط بات کو اپنے لیے دلیل بنائیں۔ اول تو زمین وآسمان کا فرق ہے جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا' لیکن اگر کوئی کمی ہے تو اس کمی کو پورا کرنا ہوگا۔ خرابی ہے تو اصلاح کی کوششیں کرنا ہوں گی' کیونکہ ہمارا امام قرآن ہے' ہمارے لیے حاکم قرآن ہے۔ ہمارے لیے اللہ اور رسولؐ کے احکام ہی حجت ودلیل اور لائق اتباع ہیں۔ دیہات کا کوئی طرزِ عمل اور رسم ورواج نہ ہمارے لیے دلیل وبرہان ہیں نہ حجت —— عرب کے دیہاتوں میں عرب خواتین جس طرح ستر وحجاب کے ساتھ محرموں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں اس کے متعلق میں اپنا مشاہدہ آپ کے سامنے بیان کر چکا ہوں۔

(کتاب: اسلام میں عورت کا مقام)

''میں نے فقہ کی تعلیم حاصل نہیں کی۔ میں تو قرآن کا فلسفہ' قرآن کا فکر' قرآن کی ہدایت اور قرآن کی حکمت بیان کرتا ہوں۔ قرآن کیا مقاصد سامنے لاتا ہے' قرآن ہماری کیا ذمہ داریاں بیان کرتا ہے' قرآن ہم سے کیا مطالبہ کرتا ہے' اسی پیغام کے سمجھنے سمجھانے' پڑھنے پڑھانے اور سیکھنے سکھانے میں مَیں نے اپنی زندگی صرف کر دی ہے اور مَیں اس پر مطمئن ہوں' خوش ہوں ع ''شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم!'' میں خوش ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے موقع دیا' مجھے توفیق دی کہ میں یہ کام کر سکوں۔ جبکہ فقہ میرا موضوع نہیں ہے۔ خاص طور پر کوڈیفائیڈ قانون جو دفعات' ذیلی دفعات اور شقوں پر مشتمل ہوتا ہے' اس سے میری ذہنی مناسبت ہی نہیں ہے۔''

(میثاق جنوری 2007ء)

تدبر قرآن کی شرائط

''قرآن کو بطریق تدبر پڑھنے کی شرائط بڑی کڑی ہیں اور ان کا پورا کرنا اس کے بغیر ہرگز ممکن نہیں کہ ایک انسان اپنے آپ کو بس اسی کے لیے وقف کر دے اور اپنی پوری زندگی کا مصرف صرف تعلیم و تعلم قرآن ہی کو بنا لے۔ اس کے لیے اوّلاً عربی زبان کے قواعد کا گہرا اور پختہ علم ضروری ہے۔ پھر اس کے ادب کا ایک ستھرا ذوق اور فصاحت و بلاغت کا عمیق فہم لازمی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جس زبان میں قرآن نازل ہوا ہے اس کا صحیح فہم اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ادبِ جاہلی کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے اور دورِ جاہلی کے شعراء و خطباء کے کلام سے ممارست بہم پہنچائی جائے۔ پھر اسی پر بس نہیں' قرآن نے خود اپنی مخصوص اصطلاحات وضع کی ہیں اور اپنے خاص اسالیب ایجاد کیے ہیں جن سے انسان ایک طویل مدت تک قرآن کو پڑھتے رہنے اور اس پر غور کرتے رہنے کے بعد ہی مانوس ہوتا ہے — اس کے علاوہ نظم قرآن کا فہم بجائے خود تدبر قرآن کی راہ کی ایک کٹھن منزل ہے اور مصحف کی موجودہ ترتیب کی حکمت کا علم جو ترتیب نزولی سے قطعاً مختلف ہے' اور اوّلاً مختلف سورتوں اور پھر ہر سورت کی آیتوں کے باہمی ربط و تعلق کو سمجھنا ایسا مشکل مرحلہ ہے جس پر بڑے بڑے اصحابِ عزم و ہمت تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس مرحلے کو سر کیے بغیر ''تدبر قرآن'' کے حق کی ادائیگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا — بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسی معدن سے قرآن حکیم کے علم و حکمت کے اصل موتی حاصل ہوتے ہیں اور اسی سے اس بحرِ ناپیدا کنار کی وسعتوں کا اصل اندازہ ہوتا ہے —!

ساتھ ہی قرآن کو سمجھنے کے لیے احادیث کے تمام ذخیرے پر انسان کی گہری نظر بھی

لازمی ہے اور قدیم صحف آسمانی کا گہرا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ ان ساری منزلوں سے گزر کر تو انسان اس قابل ہوتا ہے کہ قرآن کو بطریق تدبر پڑھ سکے۔ اس کے بعد ایک دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے اور وہ یہ کہ انسانی تاریخ کے ہر دَور میں تجرباتی و عقلی دونوں قسم کے علوم ایک خاص سطح پر ہوتے ہیں اور قرآن پر تدبر کا حق اس کے بغیر ادا نہیں ہو سکتا کہ حکمت قرآنی کا طالب اپنی معلومات کے دائرے کو کم از کم اتنا وسیع ضرور کرے کہ ان تمام علوم طبعی و نظری کا ایک اجمالی خاکہ ان کے مقدمات و مبادی، طریق استدلال اور نہج استنتاج اور نتائج و عواقب کی اجمالی معرفت سمیت اس کے ذہن کی گرفت میں آ جائے۔

> اس لیے کہ قرآن مجید کے علم و حکمت کے بحرِ زخار سے ہر طالب بہرحال اپنے ''ظرفِ ذہنی'' کے عمق اور وسعت کے مطابق ہی حصہ پا سکتا ہے اور اس کتابِ منیر کا نورِ ہدایت ہر شخص پر اس کے ''افق فکر و نظر'' کی وسعت کی نسبت ہی سے روشن ہو سکتا ہے —— اور انسان کا ظرفِ ذہنی اور افق فکری بہرحال متداول علوم طبعی و عقلی ہی سے تیار ہوتا ہے۔

خاص طور پر تبلیغ و تبیین للناس کے اعتبار سے تو اس کی اہمیت بہت ہی زیادہ ہے، بلکہ اس کے بغیر ان کا حق ادا ہونا تو کسی درجے میں بھی ممکن نہیں، اس لیے کہ ہر دَور کے تجرباتی علوم کی سطح کے مطابق اور اسی کی مناسبت سے منطق و فلسفہ، الٰہیات و مابعد الطبیعیات، اخلاقیات و نفسیات اور دیگر علومِ عمرانی کا ایک طومار ہوتا ہے جس سے ذہن بالعموم مرعوب ہوتے ہیں۔ ان کے پھیلائے ہوئے غلط افکار و نظریات کا توڑ اس کے بغیر قطعاً ممکن نہیں ہوتا کہ خود ان کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور ان کے اصل سرچشموں (Original Sources) تک رسائی بہم پہنچا کر علیٰ وجہ البصیرت ان کی جڑوں پر اسی طرح ضربِ کاری لگائی جائے جس طرح اپنے اپنے وقت میں امام ابن تیمیہ اور امام غزالی رحمہما اللہ لگا چکے ہیں۔ دورِ جدید اس معاملے میں غالباً اپنی منطقی انتہا کو پہنچ چکا ہے اور علومِ متذکرہ بالا کے علاوہ علومِ طبعی (Physical Sciences) اور فنونِ صنعتی (Technology) نے انتہائی بلندیوں کو چھو کر عقلِ انسانی کو

اس طرح مبہوت و ششدر کر دیا ہے کہ ایک عام انسان کے لیے ان کے جلو میں آنے والے غلط نظریات و افکار پر جرح و تنقید قطعاً ناممکن ہوگئی ہے—اندریں حالات' دورِ حاضر میں ''تدبرِ قرآن'' کا حق صرف اس طرح ادا ہوسکتا ہے کہ اصحابِ ہمت اور اربابِ عزیمت کی ایک بڑی جماعت اپنے آپ کو پوری طرح کھپا کر ایک طرف تدبر قرآن کی متذکرہ بالا جملہ شرائط کو پورا کرے اور دوسری طرف جدید علومِ عقلی و عمرانی کی گہری و براہِ راست ممارست بہم پہنچائے' اور پھر نہ صرف یہ کہ قرآن کی روشنی میں علومِ جدیدہ کے صحیح و غلط اجزاء کو بالکل علیحدہ کر دے' بلکہ جدید استدلال اور معروف اصطلاحات کے ذریعے لوگوں کے ذہنوں کے قریب ہو کر کلام کرے اور قرآن کے نورِ ہدایت کو لوگوں کی نگاہوں کے عین سامنے روشن کر دے!—تاکہ ''لِتُبَيِّنَنَّهٗ لِلنَّاسِ'' کا جو فریضہ آنحضور ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں ادا فرمایا تھا وہ اس دور میں آپؐ کی اُمت کے ذریعے پھر پورا ہو—اور یہ کام ظاہر ہے کہ اُس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک عالم اسلام میں جابجا ایسی یونیورسٹیاں قائم نہ ہوں جن میں سے ہر ایک کا اصل مرکزی شعبہ ''تدبرِ قرآن'' کا ہو اور اس کے گرد تمام علومِ عقلی' جیسے منطق' مابعد الطبیعیات' اخلاقیات' نفسیات اور الٰہیات' علومِ عمرانی جیسے معاشیات' سیاسیات اور قانون اور علومِ طبعی جیسے ریاضی' کیمیا' طبیعیات' ارضیات اور فلکیات وغیرہ کے شعبوں کا ایک حصار قائم ہو' اور ہر ایک طالب علم ''تدبرِ قرآن'' کی لازماً اور ایک یا اس سے زائد دوسرے علوم کی اپنے ذوق کے مطابق تحصیل کرے اور اس طرح ان شعبہ ہائے علوم میں قرآن کے علم و ہدایت کو تحقیقی طور پر اخذ کر کے مؤثر انداز میں پیش کر سکے۔

ظاہر ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں! اسی لیے اس پر ہر شخص مکلّف بھی نہیں۔ یہ کام اوّل تو ہے ہی صرف ان لوگوں کے کرنے کا جو علم کی ایک فطری پیاس لے کر ہی پیدا ہوتے ہیں اور جن کے ذہنوں میں ایسے سوالات از خود پیدا ہو جاتے ہیں جن کا حل عقل کی جملہ وادیاں طے کیے بغیر ممکن ہی نہیں ہوتا۔ یہ لوگ طلب علم پر اسی طرح ''مجبور'' ہوتے ہیں جیسے ایک بھوکا تلاشِ غذا پر یا ایک پیاسا تحصیل ماء پر۔ ایسے ہی لوگ مسلسل ''رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا'' کی دعا کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں' اور اگر صحیح رہنمائی میسر آ جائے تو علم و حکمت سے حصہ وافر پاتے ہیں۔ ''تدبر قرآن'' اصلاً تو ایسے ہی لوگوں کے کرنے کا کام ہے' ویسے ہر ''طالب علم'' اپنی اپنی استعداد اور اپنی اپنی محنت کے مطابق اس سے فیض یاب ہوسکتا ہے اور اس کے لیے ایک عام تشویق

ہی کے لیے آنحضور ﷺ نے فرمایا:

((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ))

(صحیح البخاری' عن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ)

''تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھتے اور سکھاتے ہیں۔''

اور قرآن حکیم نے ایک عام ہدایت دی کہ:

﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ﴾ (التوبہ:۱۲۲)

''پس کیوں نہیں نکلتا ہر ہر فرقے میں سے ان کا ایک گروہ تا کہ سمجھ پیدا کرے دین میں۔''

یہ ''تفقّہ فی الدّین'' تدبرِ قرآن کا وہ ثمرہ ہے جس کے لیے آنحضور ﷺ نے چیدہ چیدہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے دعا فرمائی ہے[۱] اور جس کا آپ ﷺ نے ((خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ)) کے کلیہ کے ساتھ بطورِ شرط تذکرہ فرمایا ہے' یعنی یہ کہ ((إِذَا فَقُهُوْا))''

(مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق)

والدین کا خصوصی حق

''اس دنیا میں انسان زندگی بسر کرتا ہے تو اس پر بہت سے لوگوں کے حقوق عائد ہو جاتے ہیں جنہیں اسے ادا کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ انہیں شریعت کی اصطلاح میں ''حقوق العباد'' کہا جاتا ہے اور ان میں سرفہرست والدین کے حقوق ہیں' اس میں قطعاً کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ انسان پر سب سے بڑا احسان تو بلاشک و بلاریب اللہ تعالیٰ کا ہے جو اُس کا خالق ہے' مالک ہے اور پروردگارِ حقیقی ہے۔ لیکن اللہ کے بعد انسان سب سے زیادہ زیرِ بارِ احسان ہے اپنے والدین کا جنہوں نے اسے پالا پوسا' اپنا پیٹ کاٹ کر اسے کھلایا پلایا' اپنے آرام کو تج کر اس کے آرام کی فکر کی' اس کی تکلیف پر بے چین ہوتے رہے۔ پھر اُن میں بالخصوص والدہ کا حق بہت فائق ہے۔''

(مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب)

انکارِ آخرت کا ایک اہم سبب

انکارِ آخرت کا ایک سبب یہ ہے کہ جب انسان فسق و فجور کا عادی ہو جاتا ہے اور اسے حرام خوری کی عادت پڑ جاتی ہے اور وہ حرام کی کمائی سے حاصل ہونے والی عیش کا خوگر ہو جاتا ہے اور لذت کوشی اس کی گھٹی میں رچ بس جاتی ہے تو ان سب کا چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔ اب اگر وہ آخرت کو مانے تو اسے حلال و حرام میں تمیز کرنی پڑے گی اور جائز و ناجائز کے فرق کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ چنانچہ جس طرح کبوتر جب بلی کو دیکھتا ہے تو اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے (حالانکہ اس طرح سے بلی معدوم نہیں ہو جاتی)۔ اسی طرح وہ لوگ جو فسق و فجور کے عادی ہو چکے ہیں اور اس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں، بلکہ اس کو جاری رکھنا چاہتے ہیں، وہ آخرت ہی کا انکار کر دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے لئے اسی میں عافیت سمجھی ہے کہ روایتی کبوتر کی مانند قیامت و آخرت کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ گویا منکرین قیامت و آخرت کے انکار کا اصل سبب منطقی ہے نہ عقلی، بلکہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنی حرام خوری اور فسق و فجور کی روش اور لاابالیانہ طرزِ زندگی کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ نہایت جامع الفاظ میں ارشاد فرمایا: ﴿بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ﴾ یعنی ان کے اعراض و انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی فسق و فجور کی روش کو جاری رکھنا چاہتے ہیں!

(''بصائر منتخب اخباری کالموں کا مجموعہ'' سے ماخوذ)

''دنیا کا مال و اسباب آج تمہارے پاس ہے تو کل کسی اور کے پاس چلا جائے گا اور بالآخر سب کچھ اللہ کے لیے رہ جائے گا۔ آسمانوں اور زمین کی میراث کا حقیقی وارث اللہ تعالیٰ ہی ہے۔''

(میثاق جون 2009ء)

خدائی تدبیر میں مدینہ منورہ کا انتخاب

''۱۱ نبوی میں مدینہ منورہ سے ٹھنڈی ہوائیں آئیں۔ موسم حج ہے' حاجیوں کے پڑاؤ لگے ہوئے ہیں۔ محمدؐ رسول اللہ ﷺ دعوت وتبلیغ کے لیے کبھی اِس کیمپ میں اور کبھی اُس کیمپ میں تشریف لے جا رہے ہیں۔ ابھی یہاں حاجیوں کے کسی قافلے کے پاس ہیں اور ابھی وہاں۔ ایک گھاٹی میں اچانک یثرب سے آنے والے چھ حاجیوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ آپ ﷺ اپنی دعوت پیش کرتے ہیں۔ اس پر وہ کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ اِن کنکھیوں میں پوری تاریخ مضمر ہے۔ یثرب میں یہود کے تین قبیلے آباد تھے۔ یہودی اپنے علم کی بنیاد پر' اپنی کتابوں اور اپنے صحیفوں کی بنیاد پر اِن کو خبر دیا کرتے تھے کہ آخری نبی کے ظہور کا وقت آ گیا ہے اور انہیں دھمکایا کرتے تھے کہ اب تو تم ہمیں دبا لیتے ہو' تم ہم پر غالب آ جاتے ہو' لیکن کوئی بات نہیں' آخری نبیؐ کے ظہور کے بعد جب ان کے ساتھ ہو کر ہم تمہارے خلاف جہاد کریں گے تو ہم تم پر غالب ہو جائیں گے۔ یثرب سے آئے ہوئے حاجیوں نے دیکھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی نبی ہیں' جلدی کرو' ایمان لے آؤ' مبادا یہود سبقت کر جائیں۔ ذرا سوچیے' یہود کا علم اہل یثرب کو تو فائدہ دے رہا ہے اور خود یہود کے لیے وہ حجاب بن گیا۔ وہ چھ حضرات ایمان لے آئے اور ایک کھڑکی کھل گئی۔ اب تک پورا ماحول بند تھا' کہیں راستہ نہیں نکل رہا تھا۔ یہاں یہ نکتہ ذہن نشین کر لیجیے کہ یہ خالص خدائی تدبیر ہے' اس میں آنحضور ﷺ کی اپنی تدبیر کا کوئی دخل نہیں۔ آپ ﷺ کی ساری سعی وجہد آج تک مکے میں ہوئی اور مکے سے باہر سوچا بھی تو طائف کا سوچا۔ آپ ﷺ نے ایک سفر اور بھی کیا تھا اور وہ بھی اسی طرح ناکام رہا تھا۔ یہ خالص خدائی تدبیر تھی کہ مدینے کے چھ افراد ایمان لے آئے۔

اگلے سال (۱۲ نبوی میں) بارہ آدمیوں نے آ کر بیعت کی' اور درخواست کی کہ

اب ہمارے ساتھ کوئی ایسا آدمی بھیج دیجیے جو ہمیں قرآن مجید پڑھائے۔ یہ بیعت' بیعت عقبہ' اولیٰ کہلاتی ہے۔ پھر نوٹ کر لیجیے' رسول اللہ ﷺ کی دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت کی بنیاد قرآن ہے۔ یہ اس انقلاب کا انفراسٹرکچر ہے' اور اس عظیم الشان عمارت کی اصل مضبوطی اسی سے ہے۔ اکبرالٰہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے:

خدا کے کام دیکھو' بعد کیا ہے اور کیا پہلے
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے!

تو اصل اہمیت اس جڑ اور بنیاد کی ہے۔ چنانچہ بیعت عقبہ اولیٰ کرنے والے بارہ حضرات نے کہا کہ ہمیں ایک شخص دیجیے جو ہمیں قرآن پاک پڑھائے۔ قرعۂ فال حضرت مصعب ابن عمیر رضی اللہ عنہ کے نام نکلا۔ یہ بڑے ناز و نعم میں پلے ہوئے نوجوان تھے۔ ان کے لیے دو دو سو درہم کا جوڑا شام سے تیار ہو کر آتا تھا۔ عطر کی پوری پوری شیشیاں جسم پر انڈیل کر نکلتے تھے۔ مکے کی گلیوں میں لوگ دیکھتے تھے کہ کون جا رہا ہے! انتہائی خوش پوش' خوش شکل' خوش مذاق' خوش لباس تھے۔ ان کا ذکر پہلے گزر چکا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد چچا نے ان کے تن کے کپڑے تک اتروا لیے تھے اور گھر سے نکال دیا تھا۔ ان کو ساتھ کر دیا گیا اور وہ مدینہ منورہ میں قرآن کی تعلیم دینے لگے۔ مدینہ میں اُن کا نام **المُقری** یعنی قرآن پڑھانے والا پڑ گیا تھا۔

ایک سال تک حضرت مصعبؓ نے محنت کی اور اگلے سال بہتر (۷۲) مرد اور تین عورتوں نے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ ۱۳ نبوی کا واقعہ ہے۔ اس بیعت میں یہ طے ہوا کہ آپؐ ہمارے ہاں آ جائیے' ہم آپ کی حفاظت کریں گے۔ اُس وقت جو کچھ قول و قرار ہوا اُس پر بعض کہنے والوں نے کہا: اے یثرب والو! خوب سمجھ لو' خوب سوچ لو کہ کیا قول و قرار کر رہے ہو! محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو ساتھ لے کر جانا سرخ و سیاہ آندھیوں کو دعوت دینا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بھی خوب سمجھ سوچ کر معاملہ کیا اور کہا کہ ہم آپ کی اس طرح حفاظت کریں گے جس طرح اپنے اہل و عیال کی کرتے ہیں۔ یہ ہے بیعتِ عقبہ ثانیہ جو ہجرت کی تمہید بنی ہے''۔

(میثاق' اپریل ۲۰۰۷ء)

گمراہ فرقوں اور تحریکوں کا طریق واردات

''اب اس ضمن میں ایک اہم بات جان لیجیے کہ ان تمام گمراہ فرقوں اور تحریکوں کا اصل طریقۂ واردات (methodology) کیا ہے۔ اور یہ سب میں مشترک وصف ہے۔ اس مسئلہ پر میں اپنے غور و فکر کے نتائج اور اپنے خیالات وضاحت سے آپ حضرات کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ ان کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ کسی ایک آدھ مسئلہ کو پکڑ کر' جو اُمت میں متفق علیہ اور مجمع علیہ رہا ہے' اس پر شکوک وشبہات پیدا کر دیتے ہیں۔ اُمت کے تمام فقہائے کرام' محدثین عظام' علمائے حقانی اور مفسرین کرام سب کے سب اس مسئلہ کو مانتے چلے آ رہے ہیں' لیکن اس ایک مسئلہ کو اٹھا کر وہ لوگوں کو اس مغالطہ میں مبتلا کر دیتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے۔ اس ایک تیر سے کتنے شکار ہو گئے؟ اگر آپ نے ایک متفق علیہ مسئلہ کے بارے میں لوگوں کو بدظن کر دیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اپنے عقیدت مندوں کے ذہن وقلب میں یہ بات بٹھا دی کہ سارے فقہاء بے وقوف تھے' سارے محدثین ناسمجھ تھے' سارے مفسرین بے علم تھے' سارے علماءِ اُمت بے عقل تھے کہ اتنی سیدھی سی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی جو ہمارے ممدوح کی سمجھ میں آئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو عموماً ایسے لوگوں کو تمام اکابر اسلاف سے سوءِ ظن میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس کے بعد یہ لوگ اُس بے لنگر جہاز کے مانند ہیں جو لہروں کے رحم وکرم پر ہے' لہریں اس جہاز کو جدھر چاہیں لے جائیں۔ یا کٹی ہوئی پتنگ کے موافق ہیں جو ہوا کے رحم وکرم پر ہے' وہ اسے جدھر چاہے لے جائے۔

اب جیسے ہی اسلاف سے بدظنی پیدا ہوئی شیطان کو موقع مل گیا کہ وہ گمراہی پر گمراہی کا دروازہ کھولتا چلا جائے اور ''ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ'' کا نقشہ جما دے۔ اس لیے کہ ان کے دلوں میں تو عظمت کا سکہ اپنے ممدوح کا بیٹھ جاتا ہے کہ جو

بات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی سمجھ میں نہیں آئی' امام ابوحنیفہؒ کے پلے نہیں پڑی' امام مالکؒ کے ذہن کی جہاں تک رسائی نہیں ہوئی' امام شافعیؒ جس کو سمجھنے سے قاصر رہے' امام احمد بن حنبلؒ جس کی تہہ تک نہ پہنچ پائے' مزید یہ کہ اُمت کے تمام قابل اعتماد مفسرین' چاہے وہ متقدمین میں سے ہوں یا متاخرین میں سے' جس بات کے فہم سے عاری رہے' تمام علمائے حقانی کی عقل جس بات کے سمجھنے سے عاجز رہی وہ آج ان کی سمجھ میں آئی ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ قرنِ اوّل سے آج تک جس مسئلہ میں پوری اُمت کا تواتر کے ساتھ اجماع رہا ہے وہ غلط رہا ہے' اس مسئلہ کا صحیح عقدہ تو ہمارے ممدوح عالم دین اور مفسر قرآن پر منکشف ہوا ہے۔ عقیدت مند لوگ جب اجماعِ اُمت کے خلاف ایک مسئلہ میں اپنے ممدوح کی رائے کو مان لیں تو بہت آسان ہو گیا کہ وہ جو چاہے زہر گھول دے' جو کڑوی گولی چاہے اپنے عقیدت مندوں کے حلق سے اتروا دے۔ یہ ہے ان کا مشترک طریق کار (methodology)۔

ان لوگوں کو معتقدین کس طرح اور کہاں سے ملتے ہیں جو اس فتنہ کے فروغ کا ذریعہ بنتے ہیں' یہ بات بھی تجزیہ طلب ہے۔ عموماً وہ جدید تعلیم یافتہ لوگ جو دین کے نہ طالب علم ہوتے ہیں نہ انہوں نے خود دین کا بنیادی طور پر مطالعہ کیا ہوتا ہے' اس طرح کے فتنہ پردازوں کے حلقہ بگوش بن جاتے ہیں۔ دُنیوی تعلیم کے اعتبار سے وہ چاہے گریجویٹ ہوں یا ماسٹرز ڈگری رکھتے ہوں' علوم جدیدہ میں سے کسی علم میں پی ایچ ڈی ہوں' کوئی قانون میں بار ایٹ لاء ہو' کوئی ملکی آئین میں درجۂ تخصص رکھتا ہو' کسی نے سائنس اور انجینئرنگ کی اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کی ہوں' لیکن دین کے بنیادی علم سے انہیں کوئی شغف نہیں ہوتا' اس کا کوئی فہم نہیں ہوتا' اس معاملہ میں بالکل کورے ہوتے ہیں 'اِلّا ماشاء اللہ۔ زیادہ سے زیادہ تقلید آباء کے طور پر نماز روزے سے کچھ تعلق ہو تو ہو۔ اس طبقے کے متعلق ایک بزرگ بجا طور پر ''پڑھے لکھے جاہل'' کی اصطلاح استعمال کیا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ دین کے اعتبار سے تو یہ اَن پڑھ ہیں۔ اس طبقے میں بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ انہیں ناظرہ قرآن تک پڑھنا نہیں آتا۔ یہ طبقہ ہے جس میں سے

اکثر لوگ فتنہ اٹھانے والوں کے پھندے میں پھنس جاتے ہیں۔ انہیں نظر آتا ہے کہ یہ لوگ دین اور قرآن کے بڑے خادم ہیں' بڑے عالم ہیں' بڑے معقول لوگ ہیں' بڑے ذہین وفطین ہیں' ان کی ذہانت وفطانت کا دنیا میں لوہا مانا جا رہا ہے' لیکن چونکہ ان کا براہِ راست دین کا اپنا مطالعہ نہیں ہوتا لہٰذا جس شخص کو بھی انہوں نے اس طور سے مان لیا کہ دین کی فلاں اہم بات اس کی سمجھ میں آئی ہے جو آج تک کسی اور کی سمجھ میں نہیں آئی تھی تو پھر وہ شخص ایسے لوگوں کو جدھر چاہے لے جائے۔ پھر ایسے لوگ اندھے اور بہرے ہو کر اس کی پیروی کرتے ہیں۔ بغرضِ تفہیم میں چند مثالیں قدرے تفصیل سے پیش کرتا ہوں۔

سرسید احمد خان کا اس موقع پر میں تذکرہ نہیں کروں گا۔ وہ جن گمراہیوں کے بانی و مبانی تھے ان کو میں پہلے بیان کر چکا ہوں اور یہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ ان کی ذات سے کوئی فرقہ' کوئی جماعت' کوئی تنظیم وجود میں نہیں آئی۔ انہوں نے سماجی طور پر مسلمانوں کی خدمت کو اپنا میدانِ عمل بنایا اور ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ اس میدان میں انہوں نے مسلمانانِ پاک وہند کی بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ لہٰذا سرسید کی بات یہیں چھوڑ دیجیے۔

اب آپ دیکھئے مرزا غلام احمد قادیانی نے کیا کیا؟ اس نے جب ابتداءً قرآن کا نام لے کر اور آریہ سماجیوں اور عیسائیوں سے مناظرے کر کے اپنا ایک مقام بنا لیا اور معتد بہ افراد اُس کے حلقۂ ارادت وعقیدت سے وابستہ ہو گئے تو اس نے ایک مسئلہ اٹھایا۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا اپنے جسدِ خاکی کے ساتھ زندہ آسمان پر اٹھا لیا جانا اور پھر قیامت سے قبل ان کا بعینہٖ بنفسِ نفیس دوبارہ آسمان سے نازل ہونا' یہ وہ مسئلہ ہے جو اُمت کا متفق علیہ عقیدہ ہے اور سلف سے لے کر خلف تک اس پر پوری اُمت کا اجماع چلا آ رہا ہے۔ اس کا قرآن حکیم میں بھی ذکر ہے اور متعدد احادیثِ صحیحہ صراحت کے ساتھ اس مسئلہ پر موجود ہیں۔ تمام فقہاءِ اُمتؒ' تمام محدثین کرامؒ اور اُمت کے تمام قابل اعتماد مفکرین ومفسرین اس کو مانتے ہیں' لیکن غلام احمد قادیانی نے ''رفع ونزولِ مسیح'' کے انکار کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ چونکہ وہ دَور سائنسی عقلیت پرستی (scientific rationalism) کا دَور تھا اور سائنس بھی ابھی نیوٹن کے دور میں تھی'

آئن سٹائن کا دَور شروع نہیں ہوا تھا' لہٰذا اُس زمانے میں یہ بات ایک انگریزی دان اور عقلیت زدہ شخص کے لیے بڑی عجیب سی تھی کہ ایک زندہ انسان آسمان پر اٹھایا جا سکتا ہے اور پھر وہ صدیوں بعد آسمان سے نازل ہوگا۔

تعلیم یافتہ لوگوں کو تو مرزا قادیانی نے یہ عقلی مغالطہ دیا اور عوام کو اس دلیل سے فریب دیا کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ سید المرسلین اور افضل الرسل ہیں' تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آنحضور ﷺ تو انتقال فرما جائیں اور آپ کا جسد اطہر لحد میں زیرِ زمین دفن ہو اور حضرت مسیحؑ اس خاکی جسم کے ساتھ آسمان پر زندہ ہوں! اس طرح تو حضرت مسیحؑ ہمارے رسولؐ سے افضل قرار پاتے ہیں۔ حضرت مسیحؑ کو اُن کے حواریوں نے صلیب سے اتار لیا تھا' وہ زندہ تھے۔ خفیہ طور پر ان کا علاج معالجہ ہوا۔ پھر وہ چھپتے چھپاتے بیت المقدس سے نکل گئے اور کشمیر میں آ کر آباد ہوئے' وہیں طبعی طور پر ان کی وفات ہوئی اور دفن ہوئے۔ ہمارے مولویوں نے اس بات کو نہیں سمجھا اور غلط تاویلات کرتے رہے۔ چنانچہ اس مسئلہ کو اُس نے خوب ہوا دی اور اس کے ذریعے سے اس نے اپنے معتقدین کو اسلاف سے کاٹ دیا۔ جب وہ لنگر کٹ گیا تو بے لنگر کا جہاز لہروں کے رحم و کرم پر ہے' وہ جس طرف چاہیں اسے لے جائیں۔ اس کے معتقدین نے سمجھ لیا کہ سب سے بڑھ کر عالم تو یہ ہے۔ اب اس نے بتدریج دعاوی شروع کیے۔ اس نے کہا کہ احادیث میں جس مسیح کے آنے کی خبر ہے وہ بذاتہٖ مسیح نہیں بلکہ مثیلِ مسیح ہے اور وہ مسیح موعود اور مثیلِ مسیح میں ہوں۔ نوبت بایں جا رسید کہ پھر وہ صاحبِ وحی نبی بن بیٹھا' ہزاروں ماننے والے اپنے گرد جمع کر لیے اور بہت سی خلقِ خدا کی گمراہی کا سبب بن گیا۔

غلام احمد پرویز نے بھی یہی طریق کار استعمال کیا۔ اس نے لونڈی غلاموں کا مسئلہ' یتیم پوتے کی وراثت' قتلِ مرتد اور تعددِ ازدواج جیسے مسائل کھڑے کر دیے۔ یہ وہ مسائل ہیں جو قرنِ اوّل سے تا امروز متفق علیہ رہے ہیں اور اہل سنت کے تمام فقہی مکاتب کا ان پر اجماع ہے۔ یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ بڑا حساس (touchy) ہے' اس نے بڑے جذباتی اور جگر سوز (pathetic) انداز میں اپنے زورِ قلم سے یتیم پوتے

کے لیے ہمدردیاں حاصل کیں۔ اس طرح قرآن کے نام پر ان تمام مجمع علیہ مسائل کے خلاف ایک محاذ بنا کر اس نے بہت سے لوگوں کو انکارِ حدیث وسنت کی ضلالت میں مبتلا کر دیا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ بھی شریعتِ اسلامی کی الف' با' تا بھی جانتے ہیں' وہ اس کی بنیادوں کو جانتے ہیں' اس کے دلائل سے واقف ہیں۔ لیکن ہمارے معاشرے کے ''پڑھے لکھے جاہل'' تو ایک کھلی چراگاہ کی مانند ہیں کہ کوئی بھی ذہین انسان اپنی انشاء پردازی اور اپنے خاص اسلوبِ نگارش کو کام میں لا کر دھواں دار کتابیں لکھے اور اس طبقے میں سے کثیر تعداد میں لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا کر ایک جمعیت فراہم کر لے۔ اب خود سوچیے کہ جو لوگ قائل ہو گئے ان کے اذہان پر کیا اثرات مرتب ہوئے! ہلکے سے ہلکے انداز میں یہ تأثرات بیان کیے جائیں تو وہ یہ ہوں گے کہ ہمارے ائمہ کرام' فقہائے عظام' لائق احترام محدثین اور مفسرین بڑے بھولے بھالے تھے کہ ان کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آئیں۔ ان کی حقیقت منکشف ہوئی ہے تو اس شخص پر ہوئی ہے! یہ ہے وہ طریق کار جس سے قرآن کے نام پر اٹھنے والی دعوتوں اور تحریکوں نے منفی انداز اختیار کیا' لوگوں کو اسلاف سے بدظن کر دیا اور ان کا حال کٹی ہوئی پتنگ کا سا ہو گیا کہ ہوا جدھر چاہے اس کو لے جائے''۔

(میثاق دسمبر ۲۰۰۷ء)

''قرآن حکیم کے کئی مقامات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کی طرف اپنا رسول اپنے پیغام کے ساتھ بھیجتا ہے تو اب اس قوم کی قسمت اس پیغام کے ساتھ معلق ہو جاتی ہے۔ اگر وہ قوم رسول پر ایمان لے آتی ہے اور اس پیغام کو قبول کر لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر اپنی نعمتوں کے دروازے کھول دیتا ہے' بصورتِ دیگر اسے تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔

(میثاق فروری 2013ء)

خلیفہ

''اس وقت بھی ہر انسان اپنی جگہ خلیفہ ہے مگر کس معنی میں؟ اس معنی میں کہ میرا یہ جسم میرے پاس اللہ کی امانت ہے' میں اس کے استعمال میں اللہ کا خلیفہ ہوں' تا کہ اس جسم پر اللہ کا حکم نافذ کروں اور جسم میں جو صلاحیتیں ودیعت ہیں انہیں اُس کی مرضی کے مطابق صرف کروں۔ اس جسم کو وہی دوں جو اللہ نے اس کے لیے حلال ٹھہرایا ہے۔ اگر میں یہ روش اختیار کروں تو خلیفہ ہوں۔ اس کے برعکس اگر میں یہ کہوں کہ اپنے جسم سے اپنی مرضی کے مطابق کام لوں گا تو میں گویا خدائی کا دعویدار ہوں' حاکمیت کا مدعی ہوں۔ چنانچہ سورۃ الحدید میں آیا ہے:

﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ﴾ (آیت: ۷)

''ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول پر اور کھپا دو ان تمام چیزوں کو اللہ کے راستے میں جن میں اس نے تمہیں خلافت عطا کی ہے۔''

بقول حضرت شیخ سعدی:۔

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست
درحقیقت مالک ہر شے خداست

(یہ جو کچھ میرے پاس ہے' چند روزہ امانت ہے (ورنہ) ہر چیز کا مالک تو درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے)

یہ ہاتھ میری ملکیت نہیں ہیں بلکہ اللہ کی عطا کردہ امانت ہیں۔ میرا پورا وجود اور پھر جو کچھ مزید مال و اولاد کی شکل میں دیا گیا ہے' سب اللہ کی امانت ہے۔ اس لیے پہلے اپنے وجود میں' اس کے بعد اپنے اس گھر میں جس کے آپ سربراہ ہیں' خلافت کا حق ادا کریں۔ لیکن اگر آپ نے اپنے گھروں میں اللہ کے حکم کے بجائے کسی اور کا حکم چلانا شروع کر دیا ہے تو اس صورت میں آپ خلیفہ نہیں' باغی ہیں۔'' (کتاب: خلافت کی حقیقت)

نظریہ پاکستان کا تاریخی پس منظر

اس کے لیے ہمیں تاریخ کا جائزہ لینا ہوگا' اور خاص طور پر یہ کہ ہندوستان میں انگریزوں کے آنے کے بعد مسلم انڈیا کن مسائل سے دوچار ہوگیا تھا۔ انگریز ہندوستان میں تاجر کی حیثیت سے آیا تھا' لیکن اٹھارہویں صدی کے وسط میں اُس نے یہاں کی حکومت پر قبضہ کرنے کے عمل کا آغاز کیا۔ اس سے پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت رہی۔ بعض علاقوں اور خاص طور پر موجودہ پاکستانی علاقوں پر تو تقریباً آٹھ سو برس سے مسلمانوں کی حکومت چلی آ رہی تھی' جبکہ پورے ہندوستان پر بھی تقریباً چار سو برس تک مسلمانوں نے حکومت کی ہے۔ یعنی انگریزوں کی ہندوستان آمد سے قبل ہندوستان پر مسلمانوں کا غلبہ تھا اور مسلمان حاکم تھے' جبکہ یہاں کے دوسرے ابنائے وطن محکوم تھے۔ لیکن عین اُس وقت جبکہ انگریز آ رہا تھا' صورت حال کچھ بدل چکی تھی اور مرکزی حکومت یا بالفاظِ دیگر مغلیہ حکومت انتہائی کمزور ہو چکی تھی۔ حضرت اورنگزیب عالمگیر کے انتقال کے بعد سے جو زوال کا عمل شروع ہوا ہے تو تقریباً سو برس میں وہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ اور ایک وقت تو وہ بھی آیا کہ محاورے کے طور پر یہ کہا جانے لگا کہ ''حکومت شاہ عالم از لال قلعہ تا پالم''۔ پالم دہلی سے چند میل کے فاصلے پر ایک گاؤں تھا جہاں پھر پالم ایئرپورٹ کے نام سے ہوائی اڈہ بنا۔ تو گویا شاہ عالم کی حکومت لال قلعے سے صرف پالم تک تھی اور بقیہ پورے ہندوستان میں طوائف الملوکی تھی۔ شمالی ہند میں سکھا شاہی تھی' وسطی ہند میں مرہٹوں کی دہشت گروی چل رہی تھی۔ پورا ہندوستان ریاستوں میں منقسم تھا۔ ان میں مسلمان ریاستیں بھی تھیں اور ہندو ریاستیں بھی تھیں۔

اس سب کے باوجود انگریز کی آمد کے وقت بحیثیت مجموعی مسلمانوں کا پلڑا بھاری

تھا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر کے فرو ہو جانے کے بعد اور ہندوستان کے براہِ راست تاجِ برطانیہ کے تحت آ جانے کے بعد ایک بڑا بنیادی فرق واقع ہوا۔ اس سے پہلے چونکہ شمشیر و سناں کا معاملہ چل رہا تھا تو گئے گزرے حالات میں بھی مسلمان کا پلڑا بھاری تھا۔ لیکن چونکہ تاج برطانیہ کے تحت حکومت شروع ہوئی قلم کے ذریعے سے (rule of law)' جیسے ایک وائسرائے کا قول ہے:

"Will you be governed by sword or by pen?"

تو نتیجے کے طور پر صورتِ حال یہ پیدا ہوئی کہ اب تلوار تو نیام میں چلی گئی اور صرف تعداد کا معاملہ رہ گیا۔ لہٰذا ہندوؤں کی عددی اکثریت کے اثرات ظاہر ہونے شروع ہو گئے اور مسلمانوں میں ایک خفیف سا خوف پیدا ہونا شروع ہوا کہ جن پر ہم نے تقریباً آٹھ سو برس حکومت کی ہے اب یہ ہم سے انتقام لیں گے۔

اس سب پر مستزاد ایک بڑا عجیب مظہر (phenomenon) سامنے آیا' جس پر میں چاہتا ہوں کہ آپ توجہ سے غور فرمائیں۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف مسلمانوں اور ہندوؤں کے ردِّعمل میں فرق تھا۔ ہندوؤں کا معاملہ یہ تھا کہ وہ پہلے بھی غلام تھے اور اب بھی غلام ہو گئے' ان کے لیے کوئی نیا معاملہ نہیں تھا' بس آقاؤں کی تبدیلی کا معاملہ تھا کہ پہلے حاکم مسلمان تھے اور اب حاکم انگریز تھے۔ وہ تو پہلے بھی محکوم تھے اور اب بھی محکوم ہو گئے۔ لہٰذا اُن کے لیے کسی نفسیاتی صدمے اور رنج و غم کی بات نہیں تھی۔ لیکن اس کے برعکس مسلمانوں کے لیے بہت زیادہ صدمے اور غم کا معاملہ تھا۔ اس لیے کہ وہ ابھی ابھی تختِ حکومت سے اتارے گئے تھے اور انہیں اپنی سابقہ کیفیت یاد تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر بغاوت کے جراثیم پیدا ہوئے۔ انگریز ابھی بنگال سے آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ سید احمد شہید بریلویؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی عظیم تحریک ''تحریک شہیدین'' شروع ہوئی۔ ان کے پیشِ نظر یہ تھا کہ پہلے شمالی ہند کو سکھا شاہی سے نجات دلائی جائے' اور پھر چونکہ یہ علاقہ عالمِ اسلام کے ساتھ مسلسل اور متصل ہو گا تو ادھر سے آ کر پھر ہندوستان کو ازسرِ نو ہندوؤں کے غلبے سے بھی اور انگریزوں کے غلبے سے بھی

نجات دلائی جائے اور دار الاسلام کا جو سٹیٹس چلا آ رہا تھا اسے دوبارہ قائم کیا جائے۔ اگرچہ یہ تحریک بظاہر ۱۸۳۱ء میں شہادت گہِ بالاکوٹ میں ختم ہوگئی' لیکن اس کے باقیات الصالحات تقریباً ایک صدی تک چلتے رہے۔ چنانچہ بہت سے علماء نے پھانسیوں کی سزائیں پائیں۔ مولانا جعفر تھانیسری جیسے بہت سے لوگ پھانسی دیے گئے یا کالا پانی بھیجے گئے۔ بے شمار لوگوں نے قید و بند کی سزائیں بھی برداشت کیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے شمال مغرب میں ابھی تک تحریک مجاہدین کے جو جہادی اثرات باقی تھے انہوں نے ایک عرصے تک انگریزوں کے ناک میں دم کیے رکھا۔

یہ بھی واضح رہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کے ہاتھوں سب سے آخر میں جو صوبہ فتح ہوا وہ سندھ تھا اور سندھی مسلمانوں نے انگریز کی اس حکومت کو ذہناً تسلیم نہیں کیا' لہٰذا وہاں ''حر تحریک'' نام سے ایک بہت بڑی تحریک شروع ہوئی۔ ۱۹۴۰ء کی دہائی میں اخبارات میں اس طرح کی خبریں پڑھنے کو ملتی تھیں کہ آج حروں نے فلاں ریلوے اسٹیشن کو آگ لگا دی ہے اور آج فلاں تھانے کو جلا دیا ہے۔ موجودہ پیر پگاڑا صاحب کے والد صاحب کو انگریز نے پھانسی دے دی اور پھر اُن کی لاش تک نہیں دی' بلکہ ان کی قبر کا بھی کہیں نشان تک نہیں۔ اور اِن دونوں بھائیوں کو وہ انگلستان لے گئے تاکہ ان کی برین واشنگ کی جائے اور وہاں کی تہذیب و تمدن کا ان کے اوپر رنگ چڑھایا جائے۔ بہرحال یہ کیفیات تھیں جن کی وجہ سے انگریز کو مسلمانوں سے خوف اور اندیشہ تھا کہ کہیں یہ اپنی کھوئی ہوئی حکومت واپس حاصل کرنے کے لیے بڑے سے بڑا قدم نہ اٹھا دیں۔

بیسویں صدی کے آغاز تک ہمیں علماء کی ان تحریکوں کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ مثلاً بیسویں صدی کے آغاز میں ریشمی رومال کی تحریک ایک عظیم تحریک تھی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے ایک طرف اپنے نائب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو افغانستان بھیجا تھا کہ وہ افغانستان کی حکومت کو آمادہ کریں کہ وہ ہندوستان پر حملہ آور ہو۔ دوسری طرف آپ خود حجاز مقدس تشریف لے گئے تھے۔ اُس وقت تک خلافت قائم تھی اور مدینے میں ترک گورنر موجود تھا۔ آپ چاہتے تھے کہ دار الخلافہ تک رسائی حاصل ہو سکے' وہاں سے

ہندوستان پر حملہ ہو اور ہم اندر سے بغاوت کر کے انگریز کو ختم کریں' لیکن یہ راز فاش ہو گیا اور پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ حضرت شیخ الہند کو مکے سے گرفتار کر لیا گیا اور چار سال تک مالٹا کی اسیری میں رکھا گیا' اندازہ کیجیے کہ ایک ہندی مسلمان کو ہندوستان لا کر جیل میں نہیں رکھا گیا' صرف اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں ان کے زیر اثر مسلمانوں کی طرف سے ہنگامہ آرائی نہ ہو جائے۔ جیسے علامہ اقبال کا شعر ہے:

اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو!

تو حضرت شیخ الہند کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا کہ ان کے نفس تیز سے جو گرمی پیدا ہو رہی تھی اس کے پیش نظر انگریز نے انہیں ہندوستان کے بجائے چار سال تک مالٹا میں اسیر رکھا اور اُس وقت چھوڑا جبکہ ان کی ٹی بی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور انہیں اندیشہ تھا کہ اگر ہماری اسیری کے دوران میں ان کا انتقال ہو گیا تو اس پر کوئی بہت بڑا ردِّعمل پیدا ہو سکتا ہے۔

بہر حال ایک تو یہ عامل تھا جس کی بنا پر انگریز ہندوؤں کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا اور انہیں اپنے سے قریب لا رہا تھا' جبکہ مسلمانوں سے کشیدہ تھا اور انہیں دور رکھ رہا تھا۔ اس کا ایک دوسرا فیکٹر بھی تھا۔ ہندوؤں کا اپنی تہذیب اور اپنے فکر و فلسفہ سے تعلق بڑا پرانا ہو چکا تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں سرکاری ملازمتوں کے حصول کے لیے ہندوؤں کو بھی فارسی پڑھنی پڑتی تھی' جیسے انگریزی دَور میں مسلمانوں کو انگریزی پڑھنی پڑی۔ فارسی پڑھنے سے ہندوؤں کے اندر اس کے ثقافتی اثرات بھی لازمی طور پر مترتب ہوئے تھے اور وہ اپنی اصل تہذیب و تمدن سے بہت فاصلے پر آ چکے تھے۔ لہٰذا جب انگریز نے ہندوستان میں تہذیبی و ثقافتی انقلاب (cultural revolution) کا آغاز کیا تو ہندوؤں نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ انگریز کا منصوبہ تھا کہ اپنے نظامِ تعلیم کے ذریعے ہندوستان کے رہنے والے مسلمانوں اور ہندوؤں کے فکر اور سوچ کو بدلا جائے' ان کے ذہن کے اندر تبدیلی لائی جائے۔ لارڈ

میکالے جو اُس پورے نظامِ تعلیم کا بانی تھا' نے کہا تھا کہ ہمارے نظامِ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی اپنی چمڑی کی رنگت کے اعتبار سے تو ہندوستانی رہ جائیں لیکن اپنے ذہن و فکر' تہذیب وثقافت اور اپنی معاشرت کے اعتبار سے یورپی بن جائیں۔ تو ہندوؤں نے اس تہذیبی وثقافتی انقلاب کا خیر مقدم کیا اور فوراً انگریزی زبان اور یورپی علوم پڑھنے شروع کر دیے۔ جبکہ اُن کے مقابلے میں مسلمان اس حوالے سے دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ علماء کے ایک بہت مؤثر طبقے نے انگریزی زبان' انگریزی علوم اور انگریزی تہذیب وتمدن کا کلی بائیکاٹ کیا' جس کا بہت بڑا مرکز دیوبند بنا۔

اس سے یہ فرق واقع ہوا کہ ہندو ہر معاملے میں مسلمانوں سے آگے نکلنے لگے۔ ہندو ملازمتوں میں آگے جا رہا تھا' اسے انگریزوں کا تقرب حاصل ہو رہا تھا اور اس کی سرکار دربار میں رسائی ہو رہی تھی' جبکہ مسلمان دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ایک مشہور انگریزی مصنف W . W . Hunter نے اپنی ایک کتاب ''Our Indian Musalmans'' میں لکھا کہ اگر یہی صورت حال برقرار رہی تو ہندوستان میں مسلمان یا تو منڈیوں کے اندر پلّے دار اور مزدور رہ جائیں گے یا سرکاری دفتروں میں ہوں گے بھی تو محض چپڑاسی یا زیادہ سے زیادہ دفتری ہوں گے' اس کے علاوہ برٹش انڈیا میں ان کا کوئی سٹیٹس نہیں ہوگا۔

اس موقع پر سرسید احمد خان کی عظیم شخصیت منظرِ عام پر آئی۔ اگرچہ ہمیں ان سے بہت سی باتوں میں اختلاف ہے' مفسر قرآن اور متکلم کی حیثیت سے جو باتیں انہوں نے کی ہیں وہ ہمارے لیے بہت تکلیف دہ ہیں' لیکن ان کے ایک محبِ قوم مسلمان ہونے میں ہمیں کوئی شک نہیں' مسلمانوں کی محبت ان کے دل میں انتہائی زیادہ تھی اور وہ مسلمانوں کے لیے بہت دردمند تھے۔ سرسید احمد خان نے اس معاملے میں دو کام کیے۔ ایک تو بڑی عظیم کتاب لکھی: ''اسبابِ بغاوتِ ہند''۔ اس میں انہوں نے انگریزوں کو بتایا کہ یہاں ہندوستان میں بغاوت کس طرح ہوئی ہے اور اس کے اصل اسباب کیا تھے۔ اور ساتھ ہی مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کو اطمینان دلانے کی

کوشش کی کہ مسلمانوں کو باغی مت سمجھا جائے' یہ بھی پُرامن شہریوں کی حیثیت سے زندگی گزار سکتے ہیں۔

دوسرا کام انہوں نے یہ کیا کہ مسلمانوں کو اس بات پر ابھارا کہ وہ انگریزی پڑھیں اور انگریزی علوم حاصل کریں' اور انہیں متنبہ کیا کہ ورنہ ان کا وہی حال ہو جائے گا جو ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے۔ لہٰذا وہ انگریزی علوم پڑھیں' انگریزی زبان سیکھیں' نئی سائنس سیکھیں۔ ان چیزوں میں جو غلط ہوں انہیں رد کر دیں اور جو صحیح ہوں انہیں اختیار کریں۔ بہرحال مسلمان تو انگریز کے تہذیبی و ثقافتی انقلاب کو قبول کرنے کے اعتبار سے منقسم ہو گئے جبکہ ہندوؤں نے یکسو ہو کر اسے قبول کر لیا۔ لہٰذا انگریزوں نے بھی ان کی زیادہ دلجوئی کی اور انہیں اپنے قریب کیا' جبکہ مسلمانوں کو دُور رکھا۔ اس اعتبار سے اب ہندوؤں کی طاقت کا پلڑا بھاری ہونا شروع ہو گیا اور مسلمانوں میں ایک احساس اور خوف پیدا ہوا کہ ہندو اگر اسی طریقے سے آگے بڑھتے چلے گئے تو یہ ہم سے اپنی آٹھ سو سالہ غلامی کا انتقام لیں گے۔ اس احساس کو میں چاہتا ہوں کہ آپ بالخصوص نوٹ کر لیں۔''

(میثاق' مئی ۲۰۰۷ء)

''علامہ اقبال کی ولولہ انگیز ملی شاعری سے تو میں زمانۂ طالب علمی ہی سے روشناس ہو گیا تھا۔ لیکن حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب وہ ۱۹۲۰ء میں اسارتِ مالٹا سے رہائی پا کر وطن واپس آئے تو رجوع الی القرآن کی دعوت کو اپنا مقصدِ حیات بنانے کے عزم کا اظہار فرمایا۔ انگریزوں نے حضرت کو اُس وقت چھوڑا تھا جب وہ ٹی بی کی تھرڈ اسٹیج کو پہنچ چکے تھے' ورنہ وہ اس مردِ حق پرست کو کب چھوڑنے والا تھا!''

(میثاق دسمبر 2007ء)

اسلاف سے مضبوط تعلق

''اسلاف کے ساتھ دلی محبت اور عقیدت و احترام کا ہمارا تعلق کسی طور سے بھی کٹنے نہ پائے۔ اس کا اس درجہ اور اس حد تک اہتمام کیا جائے کہ اگر ہمارے بزرگوں کی کتابوں میں کوئی ایسی چیز نظر آ بھی جائے جو ہمارے لیے بظاہر قابلِ اعتراض ہو تو اوّلاً ہم اس کی بہتر سے بہتر تاویل کرنے کی کوشش کریں گے' اگر تاویل کی گنجائش موجود ہو۔ لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو ہم یہ رائے قائم کریں گے کہ یہ قابلِ اعتراض بات ان کی کتاب میں کسی اور نے شامل کر دی ہوگی۔ اس لیے کہ تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ اعداء نے بڑے پیمانے پر یہ کام کیے ہیں۔ اس مسئلہ پر پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے بڑی تحقیق و تفتیش اور محنت و کاوش سے ''تاریخِ تصوف'' نامی کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب کا ایک باب ایسا تھا جسے کوئی سرکاری ادارہ شائع کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہمت دی اور میں نے اسے شائع کر دیا۔ اس باب کا عنوان ہے: ''اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش''۔ میں آپ کو دعوت دوں گا کہ اس کا مطالعہ ضرور کریں۔ اس میں چشتی صاحب مرحوم نے سینکڑوں مثالیں جمع کر دی ہیں کہ باطل پرست فرقوں خاص طور پر باطنیہ فرقے کے لوگوں اور غالی قسم کے اہل تشیع نے اہل سنت کے صحیح العقیدہ صوفیاء کرام کی کتابوں میں ایسی باتیں شامل کر دی ہیں جو اُن کے مسلّمہ صحیح عقیدے اور منشاء کے خلاف ہیں۔ معلوم ہوا کہ ایک سازش کے تحت ہمارے بہت سے بزرگوں کی کتابوں میں تدسیس و تحریف ہوئی ہے۔ لہٰذا اسلاف میں سے کسی معتبر و معتمد عالم اور بزرگ کی کسی کتاب میں قرآن و سنت کے اعتبار سے کوئی قابل اعتراض بات نظر آئے گی تو اسے تدسیس و تحریف سمجھا جائے گا۔ کسی معتمد علیہ بزرگ کی توہین کرنا' ان کی تنقیص کرنا' ان کے احترام کو مجروح کرنا یہ ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلاف سے منقطع ہو کر انسان بے لنگر کا جہاز یا کٹی ہوئی پتنگ بن کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ جن لوگوں کا اسلاف کے ساتھ ادب' احترام' تعظیم' اعتماد اور محبت کا تعلق کمزور پڑ جاتا ہے یا منقطع ہو جاتا ہے وہ بڑی آسانی سے فتنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس بات کو ہمیشہ ایک کسوٹی (criterion) کی حیثیت سے پیش نظر رکھیے اور جو شخص بھی دین کی کسی خدمت کا مدعی ہو اُس کو پرکھنے' اس کے خلوص کو جانچنے کا ایک معیار اور اصول یہ بھی بنا لیجیے کہ اس کی صحبت میں بیٹھنے سے' اس کی باتیں سننے سے' اس کی کتابیں پڑھنے سے آیا اَسلاف کے ساتھ دل میں احترام' محبت اور حسنِ ظن پیدا ہوتا ہے یا اس کے برعکس سوءِ ظن کا معاملہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ گویا اس بات کے لیے ایک اہم پہچان ہوگی کہ جو کام بھی خدمتِ دین یا قرآن کے نام پر اٹھایا گیا ہے آیا وہ صحیح رُخ پر جا رہا ہے یا غلط رُخ پر۔''

(میثاق' دسمبر ۲۰۰۷ء)

''ہم پر جو بھی مصیبت آتی ہے وہ اللہ ہی کی مرضی اور اجازت سے آتی ہے۔ اس کے اذن کے بغیر کائنات میں ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ وہ ہمارا کارساز اور پروردگار ہے۔ اگر اس کی مشیت ہو کہ ہمیں کوئی تکلیف آئے تو سر آنکھوں پر ع ''سر تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے''۔ جو اس کی رضا ہو ہم بھی اسی پر راضی ہیں۔ اگر اُس کی طرف سے کوئی تکلیف آ جائے تو اس میں بھی ہمارے لیے خیر ہے ع ''ہر چہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است'' (ہمارا ساقی ہمارے پیالے میں جو بھی ڈال دے اس کا لطف و کرم ہی ہے)۔ محبوب کی شمشیر سے ذبح ہونا یقیناً بہت بڑے اعزاز کی بات ہے اور یہ اعزاز کسی غیر کے نصیب میں کیوں ہو' جبکہ ہماری گردنیں ہر وقت اس سعادت کے لیے حاضر ہیں: ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!''

(میثاق جولائی 2012ء)

ہمارا معیار اور آئیڈیل

''حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے انتقال پر ایک بات کہی تھی کہ اے ابوبکرؓ! تم اپنے بعد آنے والوں کے لیے بڑی سختی پیدا کر گئے' ایسا معیار قائم کر گئے جس پر پورا اترنا آسان نہیں۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی وہ معیار قائم کیا جس کی نظیر ممکن نہیں۔ بہرحال ہمارا معیار اور آئیڈیل یہی نظام ہے جو یہ حضرات قائم کر گئے۔ یہ پریوں کی کہانیاں نہیں ہیں' یہ تاریخی حقائق ہیں۔ یہ نظام قائم ہوا ہے' بالفعل قائم ہوا ہے' دنیا کی شہادت ہے کہ قائم ہوا ہے۔ اس شہادت کی ایک صدائے بازگشت اس صدی کے آغاز میں مہاتما گاندھی کی زبان سے اُس وقت بلند ہوئی جب کانگرس کی صوبائی وزارتیں تشکیل پائی تھیں۔ اُس وقت مہاتما گاندھی نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ میں تمہارے سامنے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہما) کی مثال پیش کرتا ہوں۔ اس نے کسی اشوک' بکرماجیت' چندر گپت موریا اور رام چندر کی مثال پیش نہیں کی۔ مثال پیش کی تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی۔ یہ ہے میری گفتگو کا موضوع' جسے میں نے ع ''لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!'' کے مصداق شاید ذرا زیادہ پھیلا دیا۔ بہرحال یہ ہے اتمامِ حجت' یہ ہے بعثتِ انبیاء و رُسل علیہم السلام کی غرض و غایت اور یہ ہے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت کا تقاضا۔ ایک نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام کے لیے پوری انقلابی جدوجہد محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی اور پھر اس کے خلاف اٹھنے والی مزاحمتی اور مخالفانہ قوتوں سے خلیفۂ کامل' خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبرد آزما ہوئے اور بالکل ایک مستحکم معاشرہ دے کر رخصت ہوئے۔ اب اس کھیت میں جس میں ہل چل چکے تھے' کاشت کاری ہوئی' اور دورِ فاروقی و عثمانی میں نوعِ انسانی کے لیے نظامِ عدلِ اجتماعی کے عملی نمونے کی صورت میں ایک لہلہاتی فصل جملہ برکات کے ساتھ ظہور میں آئی''۔

(میثاق' اگست ۲۰۰۷ء)

علامہ اقبال اور وطنی قومیت

''ان کی ابتدائی تعلیم اور خاندانی پس منظر کے اندر مذہبی اثرات بڑے گہرے تھے۔ لیکن ۱۸۹۹ء میں ایم اے کرنے کے بعد سے لے کر ۱۹۰۵ء تک کا اقبال اور تھا۔ اس دَور میں ایک طرف تو وہ ہندی نیشنلزم کے خوگر نظر آتے ہیں اور دوسری طرف ان کی شاعری میں گل و بلبل کے افسانے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ''ترانۂ ہندی'' ان کا اُسی دَور کا ترانہ ہے: ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا!

آج بھی یہ ترانہ ہندوستان حکومت کی سرپرستی میں ریڈیو پر نشر کیا جاتا ہے۔ بلکہ اُس زمانے میں انہوں نے اپنی ایک نظم ''نیا شوالہ'' میں ایک شعر ایسا بھی لکھا جس کی ان کے بعد کے اشعار میں شدید ترین نفی ہوتی ہے: ؎

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے!

اس درجے گہری ہندی قوم پرستی اقبال کے اندر بھی موجود تھی۔ لیکن آپ ۱۹۰۵ء میں ۲۸ سال کی عمر میں انگلستان چلے گئے اور تین سال تک انگلستان اور جرمنی میں رہے۔ اس دوران انہوں نے بیرسٹری کی۔ چونکہ فلسفی تھے اور پی ایچ ڈی بھی کر چکے تھے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصے میں اقبال کی قلب ماہیت ہوگئی۔

یہ بات میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ میں پہلی مرتبہ ۱۹۷۰ء میں

انگلستان گیا جبکہ میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ابصار احمد وہاں زیرِ تعلیم تھے تو میں نے مشاہدہ کیا کہ وہاں یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے اور ایک ایک دو دو پی ایچ ڈیز کیے ہوئے لوگ جمعہ کے روز اکٹھے ہوتے ہیں' قرآن پڑھتے ہیں' دروسِ قرآن کی محافل ہوتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو قرآن مجید پڑھ کر سناتے ہیں تاکہ تجوید کی غلطیوں کی اصلاح ہو سکے' جبکہ پاکستان میں میرے مشاہدے میں اس طرح کی بات نہیں آئی کہ یہاں اس سطح کے لوگ اس قسم کی مصروفیات میں مشغول ہوں۔ چنانچہ میرا تجزیہ یہ تھا کہ جن لوگوں کی بنیادی تربیت اور خاندانی اثرات میں مذہب کا عنصر موجود ہوتا ہے تو چاہے اپنے ملک میں رہتے ہوئے اس کے آثار زیادہ ظاہر اور نمایاں ہو کر سامنے نہ آئیں' لیکن جب وہ ایک مخالف ماحول میں پہنچتے ہیں تو اس ماحول میں ان کے اندر کی چنگاری شعلہ بن کر بھڑکتی ہے۔ امریکہ میں بھی میں نے یہی کچھ دیکھا ہے کہ یہی دو نتیجے نکلتے ہیں کہ جو لوگ وہاں جاتے ہیں اُن میں سے کچھ لوگ تو سیلاب کی رو میں بہہ جاتے ہیں' وہاں کی تہذیب میں رنگے جاتے ہیں اور شراب و شباب اور رقص و سرود وغیرہ ساری چیزیں ان کی زندگیوں میں شامل ہو جاتی ہیں' لیکن کچھ دوسرے لوگ جن میں دین کی حمیت کی کچھ چنگاری موجود ہوتی ہے وہ پھر دین کے معاملے میں فعال ہو جاتے ہیں اور وہ چنگاری ایک شعلہ بن کر بھڑک اٹھتی ہے۔ علامہ اقبال کے ساتھ بھی بعینہٖ یہی معاملہ پیش آیا۔ علامہ اقبال خود کہتے ہیں: ع ''مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے''۔ چنانچہ وہاں سے واپس آنے کے بعد ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۰ء تک پورے ۲۲ برس علامہ اقبال نے یہی کچھ کیا کہ اسلام کے نظامِ فکر' فلسفہ اور حکمت کو اپنی شاعری اور نثر کے ذریعے بیان کیا اور قرآن کی ایک نہایت جدید اور بہت عمدہ تفسیر پیش کی۔ اگرچہ یہ تفسیر آپ کو ''تفسیرِ اقبال'' کے نام سے نہیں ملے گی' لیکن کلامِ اقبال خود تفسیرِ قرآن ہے۔ اقبال دعویٰ کرتا ہے کہ میرے پیغام میں سوائے قرآن کے اور کچھ نہیں ہے۔ اقبال سرورِ کائنات ﷺ کے حضور مناجات کرتے ہوئے کہتے ہیں: ؎

گر دلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم غیر قرآن مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن
ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
روزِ محشر خار و رسوا کن مرا!
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا!

''اے اللہ کے رسولؐ! اگر میرے دل کی مثال اس آئینے کی سی ہے جس میں کوئی جوہر ہی نہ ہو اور اگر میری شاعری میں قرآن کے سوا کسی اور چیز کی ترجمانی ہے تو آپ میرے فکر کا پردہ چاک کر دیجیے اور اس چمن کو مجھ جیسے کانٹے سے پاک کر دیجیے۔ مزید برآں قیامت کے دن مجھے ذلیل و خوار کیجیے گا اور مجھے اپنی قدم بوسی سے محروم کر دیجیے گا!''

یہ اقبال کا دعویٰ ہے کہ اس نے جو کچھ کہا ہے قرآن سے کہا ہے۔

مجھے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کا جو تھوڑا بہت فہم اور فکر دیا ہے اس کے ذرائع (sources) میں آٹھ اشخاص بہت نمایاں ہیں۔ ان میں سے دو ''اَبوین'' ہیں' یعنی ابوالاعلیٰ مودودی اور ابوالکلام آزاد۔ دو ''دکتورین'' ہیں' یعنی ڈاکٹر محمد اقبال اور ڈاکٹر رفیع الدین۔ دو ''شیخین'' ہیں' یعنی شیخ الہند مولانا محمود حسن اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی۔ قرآن فہمی میں مَیں نے شیخ الہند مولانا محمود حسن کا ترجمۂ قرآن مجید بہت مفید پایا ہے' جس پر شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کے حواشی ہیں۔ ان کے علاوہ دو ''حی این'' ہیں' یعنی مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا امین احسن اصلاحی' جنہوں نے قرآن مجید کے مضامین کے اندر موجود نظم کو واضح کیا ہے۔ اس طرح علامہ اقبال بھی میرے لیے قرآن مجید کے فہم اور فکر کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ بلکہ بچپن میں ہی مجھ پر علامہ اقبال کا بہت زیادہ گہرا اثر ہے۔ میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا جب ان کی نظم ''جوابِ شکوہ'' کا یہ شعر میرے ذہن میں چپک کر رہ گیا: ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

علامہ اقبال نے مغربی فکر پر شدید تنقید کی اور خاص طور پر مغربی تہذیب کی نفی کی۔ اس سب سے بڑھ کر وہ تجدیدِ ملت اسلامی اور احیائے فکر اسلامی کے علمبردار بن کر سامنے آئے۔ سب جانتے ہیں کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد ملت اسلامیہ کی کیا حالت ہوگئی تھی! سلطنتِ عثمانیہ کی دھجیاں بکھر گئیں۔ نوآبادیاتی استعمار پورے عالم اسلام پر حکمران تھا اور عالمِ اسلام محکوم تھا۔ اقبال نے خوشخبری دی کہ اگرچہ اس وقت ملت اسلامیہ پسی اور دبی ہوئی ہے' لیکن اس کا دوبارہ غلبہ ہوگا' ملت اسلامیہ کی تجدید ہوگی' اسلام کی نشأۃ ثانیہ ہوگی۔ اس طرح اقبال اسلام کے روشن مستقبل کے مبشر بن کر سامنے آئے۔ اقبال نے ایک اور بہت بڑا کام جو کیا وہ ان کی طرف سے وطنی قومیت کی شدید ترین نفی ہے۔ اس لیے کہ اُس وقت وطنی قومیت مسلمانوں کو اپنے اندر ہڑپ کرنے کے لیے پوری قوت کے ساتھ زور لگا رہی تھی۔ ہندوؤں میں اُس دور میں مذہبی تجدید کا عمل بڑی شدت کے ساتھ شروع ہو چکا تھا۔ بنکم چیٹر جی ہندو احیاء کا بہت بڑا علم بردار تھا۔ اس نے ''بندے ماترم'' کا ترانہ پیش کیا جس میں زمین کی بندگی کا تصور ہے کہ بھارت ماتا! ہم تیرے بندے ہیں۔ بھارت میں آج بھی مسلمانوں کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ بھی سکولوں کے اندر یہ ترانہ پڑھیں اور مسلمان ابھی تک اس کے خلاف مزاحمت کر رہے ہیں۔

اس حوالے سے پھر دوسری شخصیت راجہ رام موہن رائے کی سامنے آئی۔ یہ شخص بہت بڑا عالم و فاضل اور دس کے قریب زبانوں کا ماہر تھا' جن میں مغربی زبانیں بھی تھیں اور مشرقی بھی۔ انگریز پادریوں نے جب یہاں پر تثلیث کی تلقین شروع کی تو یہ شخص مسلمانوں کا ہمدرد بن کر سامنے آیا اور تثلیث کی نفی کے لیے ''آئینہ توحید'' کے نام سے کتابچہ لکھا۔ یہ کچھ ایسی شخصیت بننے کی کوشش کر رہا تھا کہ مسلمان بھی اس کو قبول کریں۔ اس کے بعد پھر اس نے ''برہمو سماج'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا' اور وہی فلسفہ پیش کیا جو اس سے پہلے اکبر بادشاہ نے ''دین الٰہی'' کے نام سے پیش کیا تھا کہ اللہ کو تو سب مانتے ہیں' بس اس کے نام مختلف ہیں' کسی نے اس کا نام مہادیو رکھ دیا' کسی نے اللہ اور کسی نے God۔ جبکہ شریعت اور رسالت (نعوذ باللہ) فساد کی جڑ ہے' رسالت کی بنیاد

پر شریعتیں مختلف ہو جاتی ہیں' عبادتیں مختلف ہو جاتی ہیں' لہٰذا اس کو پس پشت ڈالو۔ دینِ الٰہی یا بالفاظِ دیگر دینِ اکبری میں درحقیقت کوشش یہ تھی کہ تمام مذاہب کو ایک ہاون دستے میں کوٹ کر' چھان پیس کر اور ایک سفوف بنا کر پورے ہندوستان کا ایک ہی مشترک مذہب وجود میں لایا جائے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کو کھڑا کیا جنہوں نے اس فتنے کی سرکوبی کی۔ رام موہن رائے نے بھی ''مجلسِ ایزدی'' کے نام سے اسی قسم کے ایک ادارے کی داغ بیل ڈالی۔ یہ فلسفہ مسلمانوں کے حق میں میٹھی چھری کی مانند تھا۔ اس لیے کہ اسلام اور شریعت کا سارا دارو مدار تو رسالت اور نبوت پر ہے۔ بقول اقبال: ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است!

اگر قرآن کو حدیث و سنت اور رسالت سے کاٹ دیجیے تو پھر تو اسے موم کی ناک بنا کر جدھر چاہیں موڑ لیں' اس کی جو بھی تعبیر اور تشریح چاہیں کر لیں۔

اس سلسلے کی تیسری تحریک دیانند سرسوتی کی ''آریہ سماج'' تحریک تھی۔ یہ بہت پُرتشدد اور جارحیت پسند (militant) تحریک تھی اور ہندو معاشرے میں اس کو بہت پذیرائی ملی۔ انہوں نے کھل کر یہ کہا کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا ملک ہے' یہاں مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ نہیں' لہٰذا مسلمان یا ہندو ہو جائیں یا پھر یہاں سے ہجرت کر جائیں۔ اس آریہ سماج کے تحت پھر آر ایس ایس بنی جو ہندوؤں کی انتہائی جارحیت پسند تنظیم تھی۔ اسی طرح پھر شدھی کی تحریک شروع ہوئی کہ مسلمانوں کو دوبارہ ہندو بنایا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کے آباء و اجداد ہم ہی میں سے تھے جو مسلمان ہو گئے تھے' لہٰذا انہیں واپس لایا جائے۔ چنانچہ راجستھان کے علاقے میں یہ تحریک بڑی تیزی سے پھیل رہی تھی' جہاں مسلمانوں میں جہالت تھی' علم نہیں تھا۔ بس کسی صوفی اور بزرگ کے فیض سے وہ لوگ مسلمان تو ہو گئے تھے مگر ان کی تربیت کا کوئی انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ مسلمان حکومتوں نے تو اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا کوئی

انتظام سرے سے کیا ہی نہیں تھا۔ اسی طرح میوات کے علاقے میں میو مسلمان بڑی تیزی کے ساتھ ہندو ہو رہے تھے۔ اسی شدھی کی تحریک کا مقابلہ کرنے کے لیے مولانا الیاسؒ نے تبلیغی جماعت کا نظام بنایا کہ بس چھ باتیں لے کر دیہاتوں میں جاؤ اور تبلیغ کرو، کوئی تنخواہ نہیں ہوگی اور کھانے پینے کا انتظام بھی اپنا ہی کرنا ہوگا۔ پھر سنگھٹن کی تحریک شروع ہوئی کہ سب ہندوؤں کو جمع کر دیا جائے۔ ان حالات میں اقبال نے وطنیت کی شدید ترین نفی کی۔ ان کی نظم ''وطنیت'' ملاحظہ کیجیے:۔

اِس دَور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دین نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے!

قلبِ ماہیت کا ذرا اندازہ کیجیے کہ وہی شخص جو کل کہہ رہا تھا کہ ع ''خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے!'' وہ آج اس وطن کو سب سے بڑا بت قرار دے کر اس کو پاش پاش کرنے کے لیے کس قدر زوردار الفاظ استعمال کر رہا ہے۔ قومی ریاست (Nation State) کا تصور اٹھارہویں صدی سے یورپ میں شروع ہوا کہ ایک ملک میں رہنے والے سب شہری برابر ہیں اور اُن کے اندر مذہب کا اختلاف کوئی حیثیت نہیں رکھتا، مذہب تو ہر شخص

کا پرائیویٹ معاملہ ہے' سرکاری سطح کے اور اجتماعی معاملات کسی مذہب کے مطابق طے نہیں ہوں گے۔ اس ضمن میں ان کا ایک قطعہ اس سے بھی بڑھ کر ہے:

منزلِ رہرواں دور بھی' دشوار بھی ہے
کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے؟
بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن
اس زمانے میں کوئی حیدرِ کرار بھی ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال نے اس سلسلے میں وہ کردار ادا کیا جو دین اکبری کا قلع قمع کرنے میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے ادا کیا تھا۔ اس اعتبار سے میں کہا کرتا ہوں کہ علامہ محمد اقبال حضرت مجدد الف ثانی کے بروز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کو حضرت مجدد الف ثانی کے ساتھ گہری نسبت تھی۔ فرماتے ہیں:

حاضر ہوا میں شیخ مجددؒ کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار
اِس خاک کے ذرّوں سے ہیں شرمندہ ستارے
اِس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اَسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار

اقبال نے ان کو ''سرمایۂ ملت کا نگہبان'' کہا ہے اور سرمایۂ ملت کا تمام تر دارومدار ایمان بالرسالت پر ہے۔ چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکاتیب میں سب سے زیادہ زور اطاعت رسول پر ہے۔ اکبر نے دین الٰہی کے ذریعے سے اطاعت رسول کی جڑ کاٹنے کی کوشش کی تھی لیکن مجدد الف ثانیؒ نے اُس کو دوبارہ مستحکم کیا ہے۔''

(میثاق' مئی ۲۰۰۷ء)

انتخابات کے ذریعے اولی الامر کا تقرر

''اولی الامر کے تقرر کے لیے انتخابات کا طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے' مگر الیکشن کے نظام کو اسلامی ریاست میں کچھ حدود و قیود کا پابند کرنا ہوگا۔ تاہم روحِ عصر کا تقاضا ہے کہ انتخابات زیادہ سے زیادہ broad-based ہونا چاہئیں۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں (شہریوں) کی رائے کا اس میں عمل دخل ہو۔ اس ضمن میں بھی سید الطائفہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ ''اَلْمُسْلِمُ کُفْوٌ لِکُلِّ مُسْلِمٍ'' یعنی ''قانونی و دستوری حقوق کے اعتبار سے تمام مسلمان برابر ہیں۔'' اسلامی ریاست میں ایسا نہیں ہوگا کہ ایک مسلمان متقی ہے' لہٰذا اس کے قانونی و دستوری حقوق کچھ زیادہ تسلیم کیے جائیں اور ایک فاسق و فاجر مسلمان کے حقوق کچھ کم ہوں۔ ایک اسلامی ریاست میں تمام مسلمانوں کے شہری حقوق یکساں اور برابر ہیں' البتہ ذمہ داریاں سپرد کرنے میں شہریوں کے علم و عمل کے لحاظ سے ان کے مابین امتیاز کیا جاتا ہے اور کیا جانا چاہیے۔ گویا اسلامی ریاست میں ووٹ دینے کا حق تمام مسلمانوں کو حاصل ہوگا۔ یہ بات اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ روحِ عصر کا تقاضا بھی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو نظامِ حکومت میں اپنی شمولیت کا احساس ہو۔'' (کتاب: خلافت کی حقیقت)

ہمارے عقائد

''تنظیم اسلامی کے بنیادی دینی تصورات — یعنی عقائد — اہل سنت والجماعت کے مطابق ہیں' جن کی رُو سے: ہر عاقل و بالغ مسلمان خواہ وہ مرد ہو یا عورت' پر لازم ہے کہ وہ:

(الف) پورے شعور و ادراک کے ساتھ اقرار کرے کہ:

آمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَائِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ' اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ

یعنی میں یقین رکھتا ہوں اللہ پر جیسا کہ وہ اپنے اسماء و صفات سے ظاہر ہے اور قبول کرتا ہوں اس کے جملہ احکام' اقرار کرتا ہوں زبان سے اور تصدیق کرتا ہوں دل سے! — اور

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ

یعنی میں یقین رکھتا ہوں اللہ پر' اور اس کے فرشتوں پر' اور اس کی کتابوں پر' اور اس کے رسولوں پر' اور یوم آخر پر' اور تقدیر پر کہ اس کی بھلائی اور بُرائی سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اور مرنے کے بعد جی اُٹھنے پر۔

تشریح

اسلام کی اساس ایمان پر قائم ہے اور ایمان کی تعبیر کے لیے ایمان مجمل اور ایمان مفصّل کے مندرجہ بالا الفاظ جو سلف سے منقول ہیں' حد درجہ موزوں بھی ہیں اور نہایت جامع و مانع بھی۔ اس لیے کہ ان میں ایمانیات کی تفصیل کے علاوہ دو اہم اور بنیادی نکتے بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ ایمان زبانی اقرار (جو اُس قانونی ایمان یعنی اسلام کا رکن اولین ہے جس پر تمام دنیوی معاملات کا دار و مدار ہے اور جس پر اسلامی ہیئت اجتماعی کی بنیاد قائم ہوتی

ہے) اور تصدیق قلبی (جس پر اُس حقیقی ایمان کا دارومدار ہے جس کی بناء پر آخرت میں کوئی شخص مومن قرار پائے گا) دونوں کا مجموعہ ہے اور دوسرے یہ کہ علمی ونظری اور اصولی اعتبار سے ایمان حقیقتاً ایمان باللہ ہی کا نام ہے۔ بقیہ تمام ایمانیات اسی اصل کی فروع اور اسی اجمال کی تفصیل ہیں۔ چنانچہ ایمان بالآخرت بھی اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حکمت وعدل ہی کا مظہر ہے اور ایمان بالرسالت بھی اس کی صفاتِ ربوبیت وہدایت ہی کی توسیع۔

اللہ وہ زندۂ جاوید ہستی ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ اَلْاَحَدُ ہے یعنی ہر اعتبار سے تنہا اور اکیلا' چنانچہ نہ کوئی اس کی ذات میں شریک ہے نہ صفات میں' نہ حقوق میں نہ اختیارات میں' نہ اس کا کوئی ہم جنس ہے نہ ہم کفو' نہ ہم سر ہے نہ ہم پلہ' نہ ضد ہے نہ ندّ نہ مثل ہے نہ مثال۔ وہ اَلصَّمَد ہے یعنی وہ پورے سلسلہ کون ومکان کا مبدع بھی ہے اور موجد بھی' خالق بھی ہے اور باری بھی' صانع بھی ہے اور مصور بھی اور اسی کی توجہ وعنایت اسے تھامے ہوئے بھی ہے اور قائم کیے ہوئے بھی۔

وہ پاک اور منزہ ومبرا ہے ہر عیب' ہر نقص' ہر کمی' ہر ضعف' ہر احتیاج' ہر غلطی اور ہر کوتاہی سے۔ گویا وہ سبُّوح بھی ہے اور اَلقُدّوس بھی — اور جامع ہے تمام محاسن وکمالات کا' اور ہر خیر اور خوبی کا بدرجہ تمام وکمال' گویا وہ الغنی بھی ہے اور الحمید بھی۔ کسی کو کوئی قوت و طاقت حاصل نہیں بجز اس کے اذن واجازت کے' گویا وہی اَلعَلِیّ بھی' العظیم بھی' اَلمُتَعَال بھی ہے اور الکبیر' اَلمُتَکَبِّر بھی۔ ''سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ وَلَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ''

اس کی ذات وراءُ الوراء ثم وراءُ الوراء ہے اور اس کی ماہیت اور کنہہ کو کوئی نہیں جان سکتا' اور اس کی معرفت کی واحد راہ اس کے اسماء وصفات کے واسطے ہی سے ہے۔ چنانچہ تمام اچھے نام اسی کے ہیں اگرچہ متعین طور پر اس کے اسماءِ حسنیٰ وہی ہیں جو قرآن اور حدیث نبویؐ میں وارد ہوئے۔ اسی طرح وہ تمام صفات کمال سے بتمام وکمال متصف ہے جن میں سے اہم ترین آٹھ ہیں یعنی (۱) حیات' (۲) علم' (۳) قدرت' (۴) ارادہ' (۵) سمع' (۶) بصر' (۷) کلام اور (۸) تکوین۔ چنانچہ وہی اَلحَیّ بھی ہے اور اَلقَیُّوم بھی' اَلسَّمِیع بھی ہے اور البصیر بھی' ''عَلٰی کُلِّ شَیءٍ قَدِیر'' بھی ہے اور ''بِکُلِّ شَیءٍ عَلِیم'' بھی ''فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْد'' بھی ہے اور ''اِنَّمَا اَمْرُہٗ اِذَا اَرَادَ شَیئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْن'' کی شان کا حامل بھی۔ مزید برآں

اس کی جملہ صفات اس کی ذات ہی کے مانند مطلق ولا متناہی ہیں نہ کہ محدود ومقید اور قدیم ہیں نہ کہ حادث اور ذاتی ہیں نہ کہ کسی اور کی عطا کردہ۔

فرشتے وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے نور سے تخلیق فرمایا۔ وہ صاحب تشخص وجود کے حامل ہیں نہ کہ مجرد قوائے طبعیہ۔ ان کا نہ مذکر ہونا معلوم ہے نہ مونث۔ وہ خدا سے قرب ضرور رکھتے ہیں لیکن الوہیت میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ وہ اللہ کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا حکم انہیں بارگاہِ خداوندی سے ملے۔ وہ اللہ کے احکام کی تنفیذ بھی کرتے ہیں اور خالق ومخلوق کے مابین پیغام رسانی بھی چنانچہ وہی انبیاء ورُسل تک وحی لاتے رہے ہیں۔ ان کی تعداد بے شمار ہے لیکن چار بہت مشہور بھی ہیں اور جلیل القدر بھی یعنی حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل اور حضرت عزرائیل علیہم السلام۔

اللہ کی کتابوں میں سے بھی چار ہی معلوم ومعروف ہیں، یعنی توراۃ جو حضرت موسیٰؑ کو عطا ہوئی اور زبور جو حضرت داؤدؑ کو عطا ہوئی اور انجیل جو حضرت عیسیٰؑ کو عطا ہوئی اور قرآن جو حضرت محمد ﷺ کو عطا ہوا، جو اللہ کی آخری کتاب اور نوعِ انسانی کے نام اللہ کا آخری اور مکمل پیغام ہے، جس کے بعد کوئی اور کتاب نازل نہ ہوگی اور جو من وعن محفوظ موجود ہے اور ہمیشہ رہے گا جبکہ باقی تینوں کتابیں ردوبدل اور تغیر وتحریف کا ہدف بن چکی ہیں، گویا اب قرآن ہی اُن کا مُصَدِّق بھی ہے اور مُهَيْمِن بھی۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے پیغمبروں کے صحیفے عطا ہوئے جن میں سے کچھ اب دنیا میں سرے سے موجود ہی نہیں ہیں، باقی محرف اور مبدل ہیں۔

اللہ کے رسول نوعِ انسانی کے وہ برگزیدہ افراد ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بنی آدم تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے وقتاً فوقتاً چنا اور پسند فرمایا۔ وہ انسانیت کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے اور سب گناہ سے پاک یعنی معصوم تھے۔ ان کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے، قرآن مجید میں جن کے نام مذکور ہیں ان کے سوائے کسی اور کو یقین کے ساتھ نبی یا رسول قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان میں سے پانچ حد درجہ اولوالعزم اور نہایت عالی مرتبہ ہیں یعنی حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سیدنا محمد ﷺ۔ ان میں سے بعض کو بعض پر بعض پہلوؤں سے جزوی فضیلت حاصل ہے لیکن جملہ انبیاء ورُسل پر فضیلت کلی سیدُ ولد آدم حضرت محمد ﷺ کو حاصل ہے، جو خاتم النبیین بھی ہیں اور آخر الرسل بھی اور جن کے بعد وحی نبوت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کلی طور پر بند ہو چکا ہے۔

انبیاء ورُسل کی تائید وتقویت کے لیے اللہ تعالیٰ عام مادی ضوابط کو عارضی طور پر معطل کر کے گویا عادی قانون کو توڑ کر اپنی آیات ظاہر کرتا اور معجزات دکھاتا رہا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کو بھی بے شمار حسی معجزے عطا ہوئے لیکن آپ کا اہم ترین اور عظیم ترین معجزہ معنوی ہے یعنی قرآن حکیم۔

یوم آخر وہ دن ہے جس میں تمام انسان دوبارہ زندہ ہو کر عدالت خداوندی میں محاسبے اور جزا و سزا کے فیصلے کے لیے پیش ہوں گے' جس کے نتیجے میں یا جنت میں داخلہ ہوگا یا جہنم میں۔ اس دن اقتدار مطلق اور اختیار کلی صرف اللہ واحد وقہار کے ہاتھ میں ہوگا' نہ کسی کو کسی جانب سے کوئی مدد مل سکے گی' نہ کوئی کچھ دے دلا کر چھوٹ سکے گا' نہ کوئی سفارش ہی خدا کی پکڑ سے بچا سکے گی۔ انبیاء ورُسل' صلحاء واتقیاء' ملائکہ وارواح اور سب سے بڑھ کر نبی اکرم ﷺ کے مراتبِ عالیہ کے اظہار واعلان اور ان کے اعزاز واکرام کے لیے شفاعت کی اجازت دی جائے گی اور گناہ گار اہل ایمان کے حق میں ان کی شفاعت قبول بھی ہوگی لیکن نہ وہ خدا کی مرضی اور منشاء کے خلاف کچھ کہیں گے اور نہ ہی خدا کی صفت عدل باطل ہوگی۔

تقدیر کے خیر وشر کا من جانب اللہ ہونا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اور مخلوقات میں سے کسی کے بس میں نہیں کہ بغیر اس کی اجازت محض اپنے ارادے سے کچھ کر سکے۔ لہٰذا یہاں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے' خواہ وہ کسی کو بھلا لگے یا بُرا' اللہ کے اذن ہی سے ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو خدا کا عاجز ولاچار ہونا لازم آتا ہے۔ مزید برآں' وہ "عَالِمُ مَاكَانَ وَمَايَكُوْنُ" بھی ہے۔ چنانچہ اس پورے سلسلہ کون ومکان میں جو کچھ ماضی میں ہوا' یا حال میں ہو رہا ہے یا مستقبل میں ہوگا سب اس کے علم قدیم میں پہلے سے موجود ہے' اگرچہ اس کا یہ علم جبرِ محض کو مستلزم نہیں۔ گویا' ایمان بالقدر دراصل اللہ تعالیٰ کی دو صفات یعنی قدرت اور علم کے مضمرات اور مقدرات ہی کو ماننے کا نام ہے۔

بعث بعد الموت سے مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا نفخہ اُولیٰ ہوگا' جس کے نتیجے میں کائنات کا پورا موجودہ نظام درہم برہم ہو جائے گا اور سب پر ایک عمومی موت طاری ہو جائے گی۔ پھر جب اللہ کا اذن ہوگا نفخہ ثانیہ ہوگا اور سب جی اُٹھیں گے اور حضرت آدم ﷺ سے لے کر تا قیامِ قیامت پیدا ہونے والے آخری انسان تک سب میدان حشر میں جمع کیے جائیں گے!

(ب) کلمہ طیبہ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کے جملہ مضمرات و مقدرات کے فہم و شعور کے ساتھ گواہی دے کہ:

"اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ" یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوائے کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔

تشریح: اس شہادت کے جزو اوّل کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور آسمان اور جو کچھ آسمان و زمین میں ہے سب کا خالق، پروردگار، مالک اور تکوینی و تشریعی حاکم صرف اللہ ہے۔ ان میں سے کسی حیثیت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ گویا "اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ" اور "لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ"

اس حقیقت کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ:

۱۔ انسان اللہ کے سوا کسی کو ولی و کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا، فریاد رس اور حامی و ناصر نہ سمجھے، کیونکہ کسی دوسرے کے پاس کوئی اقتدار ہے ہی نہیں۔

۲۔ اللہ کے سوا کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے والا نہ سمجھے، کسی سے تقویٰ اور خوف نہ کرے، کسی پر توکل نہ کرے، کسی سے اُمیدیں وابستہ نہ کرے، کیونکہ تمام اختیارات کا مالک تنہا وہی ہے۔

۳۔ اللہ کے سوا کسی سے دُعا نہ مانگے، کسی کی پناہ نہ ڈھونڈے، کسی کو مدد کے لیے نہ پکارے۔ کسی کو خدائی انتظامات میں ایسا دخیل اور زور آور بھی نہ سمجھے کہ اس کی سفارش قضائے الٰہی کو ٹال سکتی ہو، کیونکہ خدا کی سلطنت میں سب بے اختیار رعیت ہیں، خواہ فرشتے ہوں یا انبیاء یا اولیاء۔

۴۔ اللہ کے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکائے، کسی کی پرستش نہ کرے، کسی کو نذر نہ دے اور کسی کے ساتھ وہ معاملہ نہ کرے جو مشرکین اپنے معبودوں کے ساتھ کرتے رہے ہیں، کیونکہ تنہا ایک اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے۔

۵۔ اللہ کے سوا کسی کو بادشاہ، مالک الملک اور مقتدر اعلیٰ تسلیم نہ کرے، کسی کو باختیار خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز نہ سمجھے، کسی کو مستقل بالذات شارع اور قانون ساز نہ مانے اور اُن تمام اطاعتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دے جو ایک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تحت اور

اُس کے قانون کی پابندی میں نہ ہوں' کیونکہ اپنے ملک کا ایک ہی جائز مالک اور اپنی خلق کا ایک ہی جائز حاکم اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی کو مالکیت اور حاکمیت کا حق نہیں پہنچتا۔

نیز اس عقیدے کو قبول کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ:

۶۔ انسان اپنی آزادی و خود مختاری سے دست بردار ہو جائے' اپنی خواہش نفس کی بندگی چھوڑ دے اور اللہ کا بندہ بن کر رہے جس کو اس نے الٰہ تسلیم کیا ہے۔

۷۔ اپنے آپ کو کسی چیز کا مالک مختار نہ سمجھے' بلکہ ہر چیز حتیٰ کہ اپنی جان' اپنے اعضاء اور اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو بھی اللہ کی ملک اور اس کی طرف سے امانت سمجھے۔

۸۔ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ سمجھے اور اپنی قوتوں کے استعمال اور اپنے برتاؤ اور تصرفات میں ہمیشہ اس حقیقت کو ملحوظ رکھے کہ اُسے قیامت کے روز اللہ کو ان سب چیزوں کا حساب دینا ہے۔

۹۔ اپنی پسند کا معیار اللہ کی پسند کو اور اپنی ناپسندیدگی کا معیار اللہ کی ناپسندیدگی کو بنائے۔

۱۰۔ اللہ کی رضا اور اس کے قرب کو اپنی تمام سعی و جہد کا مقصود اور اپنی پوری زندگی کا محور ٹھہرائے۔ گویا اللہ تعالیٰ ہی اس کا محبوب حقیقی اور مطلوب و مقصود اصلی بن جائے۔

۱۱۔ اپنے لیے اخلاق میں' برتاؤ میں' معاشرت اور تمدن میں' معیشت اور سیاست میں' غرض زندگی کے ہر معاملے میں صرف اللہ کی ہدایت کو ہدایت تسلیم کرے اور ہر اُس طریقے اور ضابطے کو رد کر دے جو اللہ کی شریعت کے خلاف ہو۔

اس شہادت کے جزو ثانی سے واضح ہوتا ہے کہ سید وُلدِ آدم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپؐ اللہ کے بندے ہیں اور دوسرے یہ کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ پہلی حیثیت کے اعتبار سے آپ عبدیت کاملہ کے مقام پر فائز ہیں اور آپؐ کی اس حیثیت کے علم اور اعتراف سے شرک کی ان جملہ اقسام کا کامل سدّ باب ہو جاتا ہے جن میں سابقہ امّتیں اپنے اپنے انبیاء و رُسل کے فرطِ احترام' شدتِ عقیدت اور غلوِ محبت کے باعث ملوث ہو گئیں۔ دوسری حیثیت کے اعتبار سے آپؐ کے قرقِ مبارک پر ختم نبوت اور ختم رسالت کا تاج بھی ہے اور آپؐ کے دستِ مبارک میں شہنشاہِ ارض و سماء کی جانب سے اِتمامِ نعمتِ شریعت اور تکمیلِ دینِ حق کا فرمانِ شاہی بھی۔ گویا سلطانِ کائنات کی طرف سے رُوئے زمین پر بسنے والے انسانوں کو جس آخری نبیؐ کے ذریعہ سے مستند ہدایت نامہ اور ضابطہ قانون بھیجا گیا اور جس کو

اس ضابطہ کے مطابق کام کر کے ایک مکمل نمونہ قائم کر دینے پر مامور کر دیا گیا' وہ محمد ﷺ ہیں۔

اس امر واقعی کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ انسان کو جملہ مخلوقات میں شدید ترین محبت آنحضور ﷺ ہی سے ہو اور آپؐ کی اطاعت اور اتباع ہی زندگی کا اصل طریق بن جائے۔ گویا:

۱۔ انسان ہر اُس تعلیم اور ہر اُس ہدایت کو بے چون و چرا قبول کرے جو محمد ﷺ سے ثابت ہو۔

۲۔ اس کو کسی حکم کی تعمیل پر آمادہ کرنے کے لیے اور کسی طریقہ کی پیروی سے روک دینے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہو کہ اس چیز کا حکم یا اس چیز کی ممانعت رسولِ خدا ﷺ سے ثابت ہے۔

۳۔ رسولِ خدا ﷺ کے سوا کسی کی مستقل بالذات پیشوائی و رہنمائی تسلیم نہ کرے۔ دوسرے انسانوں کی پیروی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے تحت ہو' نہ کہ ان سے آزاد۔

۴۔ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں خدا کی کتاب اور اُس کے رسولؐ کی سُنّت کو حجت اور سند اور مرجع قرار دے۔ جو خیال یا عقیدہ یا طریقہ کتاب و سنت کے مطابق ہو اسے اختیار کرے' جو اس کے خلاف ہو اسے ترک کر دے' اور جو مسئلہ بھی حل طلب ہو اسے حل کرنے کے لیے اُسی سرچشمہ ہدایت کی طرف رجوع کرے۔

۵۔ تمام عصبیتیں اپنے دل سے نکال دے خواہ وہ شخصی ہوں یا خاندانی' یا قبائلی و نسلی' یا قومی و وطنی' یا فرقی و گروہی کسی کی محبت یا عقیدت میں ایسا گرفتار نہ ہو کہ رسولؐ خدا کے لائے ہوئے حق کی محبت و عقیدت پر وہ غالب آ جائے یا اس کی مدِ مقابل بن جائے۔

۶۔ نبی اکرم ﷺ کے بعد پیدا ہونے والے کسی شخص کو نہ تو کسی بھی معنی میں نبی یا رسول سمجھے نہ معصوم اور نہ ہی کسی کا یہ منصب اور مرتبہ سمجھے کہ اس کے ماننے پر انسان کا مومن و مسلم سمجھا جانا منحصر ہو۔

نیز اسی کے متضمنات کی حیثیت سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ:

۷۔ یہ تسلیم کیا جائے کہ آپؐ نے جو نظام قائم فرمایا اور جو خلافتِ راشدہ کے دوران بتمام و کمال قائم رہا' وہی ''دین حق'' اور ''نظام اسلامی'' کی صحیح ترین اور واحد مسلّمہ تعبیر ہے۔ گویا خلافتِ راشدہ فی الواقع ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' تھی اور خلفائے اربعہ یعنی حضرات ابوبکر صدیق' عمر فاروق' عثمان غنی اور علی حیدر رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاہم نبی اکرم ﷺ کے وہ ''خلفائے راشدین و مہدیین'' ہیں جن کی سنت آنحضور ﷺ کے بعد دین میں

حجت کا درجہ رکھتی ہے۔

۸۔ یہ یقین رکھا جائے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جنہیں آنحضور ﷺ کی صحبت اور آپؐ کی تعلیم اور تزکیہ وتربیت سے براہِ راست فیض یاب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی، من حیثیت الجماعت پوری اُمت میں افضلیت مطلقہ کے حامل ہیں۔ حتیٰ کہ کوئی غیر صحابی کسی صحابی سے افضل نہیں ہوسکتا۔ ان کی محبت جزو ایمان ہے، ان کی تعظیم وتوقیر دراصل نبی اکرم ﷺ کی تعظیم وتوقیر ہے اور ان سے بغض وعداوت اور ان کی تحقیر وتوہین درحقیقت آنحضور ﷺ سے بغض وعداوت اور آپؐ کی تحقیر وتوہین ہے۔ ان کے مابین جزوی فضیلت کے بہت سے پہلو ہو سکتے ہیں لیکن فضیلت کلی متعین طور پر اس طرح ہے کہ تمام صحابہؓ میں ایک اضافی درجۂ فضیلت حاصل ہے حضراتِ اصحاب بیعت رضوان کو، پھر ان پر ایک مزید درجہ فضیلت حاصل ہے حضرات اصحاب بدر کو، پھر ان پر ایک اور درجہ فضیلت کے حامل ہیں حضرات عشرۂ مبشرہ اور ان میں فضیلت مطلقہ حاصل ہے حضراتِ خلفاء اربعہ کو جن کی افضلیت علیٰ ترتیب الخلافت ہے یعنی افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق ہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ پھر درجہ ہے حضرت عمر فاروقؓ کا، پھر مقام ہے حضرت عثمان غنیؓ کا اور پھر مرتبہ ہے حضرت علی حیدرؓ کا!

مزید برآں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کل کے کل ''عدول'' ہیں اور ان کے مابین اختلاف ونزاع نفسانیت کی بناء پر نہیں بلکہ خطائے اجتہادی کی بنا پر ہوا۔ چنانچہ مشاجراتِ صحابہؓ کے باب میں محتاط ترین روش تو یہ ہے کہ ''کَفِّ لِسان'' سے کام لیا جائے اور کامل سکوت اختیار کیا جائے تاہم کوئی حقیقی اور واقعی ضرورت ہی لاحق ہو جائے تو ایک کو ''مصیب'' یعنی صحیح موقف پر اور دوسرے کو ''مخطِی'' یعنی راہِ خطائے اجتہادی پر تو قرار دیا جا سکتا ہے لیکن کسی کو بھی سب وشتم یا الزام واتہام کا ہدف بنانا جائز نہیں ہے!

(ج) ہر قسم کے کفر اور جملہ انواع واقسام شرک اور تمام رذائل وذمائم اخلاق سے شعوری طور پر اعلانِ براءت کرے، یا ان الفاظ کہ:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ اَنْ اُشْرِکَ بِکَ شَیْئًا وَّ اَنَا اَعْلَمُ بِہٖ وَاَسْتَغْفِرُکَ لِمَا لَا اَعْلَمُ بِہٖ تُبْتُ عَنْہُ وَتَبَرَّاْتُ مِنَ الْکُفْرِ وَالشِّرْکِ وَالْکِذْبِ

وَالْغِيْبَةِ وَالْبِدْعَةِ وَالنَّمِيْمَةِ وَالْفَوَاحِشِ وَالْبُهْتَانِ وَالْمَعَاصِيْ كُلِّهَا۔

یعنی ''اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ تیرے ساتھ کسی کو جانتے بوجھتے شریک کروں اور تجھ سے مغفرت کا طلب گار ہوں اگر کبھی بے سمجھے بوجھے ایسا ہو جائے اور میں اعلان برائت کرتا ہوں ہر نوع کے کفر سے' شرک سے' جھوٹ سے' غیبت سے' بدعت سے' چغل خوری سے' بے حیائی کے کاموں سے' بہتان طرازی سے اور جملہ نافرمانیوں سے۔''

(۵) سابقہ زندگی کے تمام گناہوں پر نہایت الحاح و زاری سے بارگاہِ خداوندی میں مغفرت کا طلب گار ہو اور آئندہ کے لیے کامل خلوص و اخلاص کے ساتھ توبہ کرے' ان الفاظ کے ساتھ کہ:

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ اَذْنَبْتُهٗ عَمَدًا اَوْ خَطَاً سِرًّا اَوْ عَلَانِيَةً وَّ اَتُوْبُ اِلَيْهِ مِنَ الذَّنْبِ الَّذِيْ اَعْلَمُ وَمِنَ الذَّنْبِ الَّذِيْ لَا اَعْلَمُ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ وَسَتَّارُ الْعُيُوْبِ وَغَفَّارُ الذُّنُوْبِ

''میں اللہ سے معافی کا خواستگار ہوں تمام گناہوں پر خواہ میں نے جان بوجھ کر کیے ہوں یا غیر ارادی طور پر' اور خواہ چھپ چھپا کر کیے ہوں خواہ علانیہ طور پر' اور خواہ وہ میرے علم میں ہوں خواہ میرے علم میں نہ ہوں۔ اے اللہ تو ہی تمام غیبوں کا جاننے والا اور تمام عیبوں کی پردہ پوشی کرنے والا اور تمام گناہوں کی بخشش فرمانے والا ہے!''

تشریح: توبہ صرف زبان سے کلماتِ توبہ کے ادا کر دینے یا ان کے ورد یا وظیفہ بنا لینے کا نام نہیں ہے بلکہ گناہ پر حقیقی ندامت اور واقعی پشیمانی اور معصیت سے کلی اجتناب کے عزمِ مصمم کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں رجوع کرنے اور گناہ و معصیت کو بالفعل ترک کر دینے کا نام ہے۔ یہ تین شرائط ان کوتاہیوں کے ضمن میں کافی ہیں جو حقوق اللہ کے باب میں ہوں۔ حقوق العباد سے تعلق رکھنے والے معاصی کے لیے ایک چوتھی اضافی شرط یہ ہے کہ جس کسی پر زیادتی

ہوئی ہو اس کی تلافی کی جائے یا اس سے معافی حاصل کی جائے۔

(۴) گہرے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اعلان کرے کہ وہ ہر طرف سے یکسو ہو کر صرف اللہ کا ہو کر رہے گا' رضائے الٰہی ہی اس کا اصل مقصود و مطلوب ہوگی اور نجات و فلاحِ اُخروی کا حصول ہی اس کا اصل نصب العین ہوگا—— اور جس طرح اس کی نماز اور قربانی صرف اللہ کے لیے ہوگی اسی طرح اس کے جسم و جان' مال و منال حتیٰ کہ زندگی اور موت سب اللہ ہی کے لیے ہوں گے۔ یعنی:

اِنِّی وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ — اور — اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ

تشریح: ہر ذی شعور مسلمان کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ اللہ کی محبت سے سرشار ہو کر اپنی پوری زندگی اس کی کامل اطاعت میں دے دے (جو لازماً اطاعتِ رسولؐ ہی کے واسطے سے ہوگی)! اسی رویے کا نام عبادتِ رب ہے جو ہر انسان سے اللہ کا پہلا مطالبہ ہے اور جس کی طرف نوعِ انسانی کو دعوت دینے کے لیے تمام انبیاء و رسل مبعوث ہوئے اور جو از روئے قرآن جنوں اور انسانوں کا عین مقصدِ تخلیق ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس پر لازم ہے کہ اپنی صحت و قوت' فرصت و فراغت' صلاحیت و استعداد' مال و دولت' اور وسائل و ذرائع کا زیادہ سے زیادہ حصہ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' احقاقِ حق اور ابطال باطل' دعوت الی اللہ اور تبلیغ دین' نصرتِ خدا و رسولؐ اور حمایت و اقامتِ دین' اور شہادتِ حق علی الناس اور اظہارِ دین حق علی الدین کلّہٖ کے لیے وقف کر دے اور اس کے لیے محنت و مشقت' انفاق و ایثار' ترک و اختیار' ابتلا و آزمائش' صبر و مصابرت' استقامت و مقاومت۔ الغرض ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کے جملہ مراحل کے لیے مقدور بھر ہمت و عزیمت کی راہ اختیار کرے۔ یہ تمام فرائض ہر مسلمان پر حسبِ صلاحیت و استعداد اور مطابقِ وسعت و قوت عائد ہوتے ہیں اور ان کی انجام دہی میں ہی بندے کی وفاداری کا اصل امتحان ہے!'' (کتاب: تعارف تنظیم اسلامی)

❁❁❁

منافق کی علامت

''نبی اکرم ﷺ نے منافق کی جو علامتیں بیان فرمائی ہیں ان میں کذب کو سرفہرست رکھا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

﴿آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ :اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اؤْتُمِنَّ خَانَ﴾ (۱)

''منافق کی تین نشانیاں ایسی ہیں : (۱) جب بات کرے جھوٹ بولے۔ (۲) جب وعدہ کرے خلاف ورزی کرے اور (۳) جب اس کے پاس کوئی چیز بطور امانت رکھوائی جائے تو خیانت کرے''۔

یہاں چونکہ معاملہ اس نوع کے نفاق کا نہیں ہے جو ذہنوں میں بیٹھا ہوا ہے کہ منافق تو اسے کہتے ہیں جس نے مسلمانوں اور اسلام کو زک پہنچانے کے لیے سازش کے طور پر اسلام کا لبادہ اوڑھا ہو' لہٰذا اس حدیث کی تشریح میں بالعموم علماء کرام نفاق کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں کہ ایک ہے نفاقِ اعتقادی اور دوسرا نفاقِ عملی۔ ان کی توجیہہ کے مطابق اس حدیث میں نفاقِ عملی کا تذکرہ ہے' نفاقِ اعتقادی کا نہیں۔ بہرکیف اس بحث سے قطع نظر نبی اکرم ﷺ کا فرمان یہ ہے کہ یہ تین اوصاف وہ ہیں کہ جو اگر کسی کی طبیعت میں راسخ ہو جائیں تو وہ پکا منافق ہے۔ ہاں اگر کبھی کسی وقت جھوٹ کا ارتکاب ہو جائے یا کبھی کسی وقت وعدہ خلافی ہو جائے تو یہ چیز نفاق کے ذیل میں نہیں آئے گی۔

یہ مضمون ایک اور متفق علیہ حدیث میں اس سے بھی زیادہ مؤکدہ شکل میں آیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ((اَرْبَعٌ مَّنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا))(۱) کہ چار خصلتیں ایسی ہیں کہ جس کسی میں وہ چاروں موجود ہوں تو وہ شخص منافق ہے' پکا اور کٹر منافق! ایک روایت میں یہ اضافی الفاظ بھی آئے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ((وَاِنْ

صَامَ وَصَلّٰی وَزَعَمَ اَنَّهٗ مُسْلِمٌ))[۲] ''خواہ وہ شخص روزہ رکھتا ہو' خواہ نماز پڑھتا ہو اور خواہ اسے خود بھی یہ زعم ہو اور وہ یہ خیال کرتا ہو کہ میں مسلمان ہوں۔ لیکن اگر یہ چاروں وصف اس میں موجود ہیں تو وہ پکا منافق ہے۔ اس حدیث میں ان تین باتوں کے علاوہ جن کا ذکر پچھلی حدیث میں تھا' چوتھی چیز آپؐ نے یہ گنوائی: ((وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ)) کہ جب کہیں کوئی جھگڑا ہو تو وہ آپے سے باہر ہو جائے' نہ زبان پر کنٹرول رہے نہ جذبات پر۔ یہ چوتھا وصف یا چوتھی علامت ہے منافق کی۔ حضور ﷺ نے اس حدیث میں مزید وضاحت فرمائی کہ جس میں یہ چاروں خصلتیں جمع ہیں وہ تو کٹر منافق ہے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک وصف پایا جاتا ہے اس میں اسی مناسبت سے نفاق موجود ہے۔ یہ ہے نفاق کی حقیقت از روئے قرآن و حدیث!''

(مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب' درس 19)

''ہماری ملکیت میں جو سامان اور مال ہے کیا ہم اس کے استعمال میں بھی اپنی مرضی نہیں کر سکتے؟ یہ وہی تصور ہے جو آج کے جدید زمانے میں sacred right of ownership کے خوبصورت الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے' جبکہ اسلام میں ملکیت کا ایسا تصور نہیں ہے۔ اسلام کی رو سے ہر چیز کا مالک اللہ ہے اور دنیا کا یہ مال اور ساز و سامان انسانوں کے پاس اللہ کی امانت ہے' جس میں اللہ کی مرضی کے خلاف تصرف کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ لہٰذا اسلام ملکیت کے کسی ''مقدس حق'' کو تسلیم نہیں کرتا' کیونکہ: ؎

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست
درحقیقت مالک ہر شے خداست

یعنی یہ مال و دولت ہمارے پاس چند دن کی امانت ہے' ورنہ حقیقت میں ہر شے کا مالک حقیقی تو اللہ ہی ہے۔''

(میثاق مارچ 2013ء)

حسرت بوقتِ مرگ

''ایک بڑا حسرت کا وقت آئے گا جب انسان کفِ افسوس ملے گا کہ اے کاش! میں اس مال کو اللہ کی راہ میں صدقہ کر سکتا۔ آج یہ لوگ دونوں ہاتھوں سے مال جمع کر رہے ہیں' گھروں کی آرائش و زیبائش پر بے تحاشا خرچ ہو رہا ہے' ان میں نامعلوم کہاں کہاں سے فرنیچر اور کراکری جمع کی گئی ہے' یہ سب چیزیں انسان کو بڑی محبوب ہیں ﴿وَمَسٰكِنَ تَرْضَوْنَهَآ﴾ (التوبۃ:۲۴) لیکن ایک وقت ایسا آئے گا جس کے بارے میں سورۃ القیامہ میں ہے: ﴿وَظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ﴾ کہ وہ فراق کا وقت ہوگا۔ مال و دولت اور جائیداد' سب کو چھوڑ کر جانا ہوگا' یہاں سے نکلنا ہوگا' اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے بھی تعلق منقطع ہو کر رہے گا' اہل و عیال سے بھی جدا ہونا پڑے گا' اُس وقت انسان حسرت سے کہے گا: ﴿رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ﴾ کہ اے ربّ! کیوں نہ تو نے مجھے ذرا اور مہلت دے دی! تُو اگر ذرا اس وقت کو ٹال دے تو ﴿فَاَصَّدَّقَ﴾ پھر میں یہ سب کچھ تیری راہ میں دے دوں' سارا مال صدقہ کر دوں ﴿وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ اور میں بالکل سچائی اور صداقت کی راہ اختیار کر لوں۔ کاش مجھے تھوڑی سی مہلت اور مل جاتی تو میں صالحین میں سے ہو جاتا!! اس وقت بس یہی ایک حسرت ہوگی' لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اللہ کی یہ سنت ثابتہ ہے کہ جب کسی کا وقتِ معین آ جائے تو پھر اسے مؤخر نہیں کیا جاتا۔ ﴿وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا﴾ امتحان کا وقت ختم ہو چکا' اب تو نتیجہ کے نکلنے کا انتظار کرو! اور آخری تنبیہہ کر دی گئی کہ ﴿وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ ''اللہ جانتا ہے جو کچھ کہ تم کرتے ہو''۔ اس وقت کی یہ جزع فزع اور نالہ و شیون بھی فی الحقیقت منافقانہ ہو گی۔ اگر کہیں بالفرض کوئی مہلت مل بھی جائے تو پھر دوبارہ مال کی محبت عود کر آئے گی اور پھر تم اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے کنی کترا ؤ گے۔''

(مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب' درس 19)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

''ایک خیال یہ بھی عام لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھ گیا ہے اور بعض روایات سے غلط طریقے پر یہ نتیجہ اخذ کرلیا گیا ہے کہ نفاق تو بس دَورِ نبویؐ ہی میں تھا' اس کے بعد اب نفاق کہیں موجود نہیں ہے۔ حالانکہ یہ تو ایک ایسا نفسیاتی مرض ہے کہ کوئی انسانی معاشرہ کبھی اس سے خالی نہیں رہا۔ ہر انسانی جدوجہد میں تین طرح کے طبقات ہمیشہ موجود رہے۔ ایک وہ کہ جو کسی نئی دعوت کو یا نظریے کو کھلم کھلا قبول کرتے ہیں' ہر چہ بادا باد کی شان کے ساتھ۔ دوسرے وہ جو کھلم کھلا مخالفت کرتے ہیں اور اس دعوت یا جدوجہد کا راستہ روکنے کے لیے میدان میں آ جاتے ہیں۔ ایک تیسرا طبقہ وہ ہوتا ہے کہ وہ کسی جانب یکسو نہیں ہوتا' بلکہ ادھر والوں سے بھی بنا کر رکھنا چاہتا ہے اور اُدھر بھی اپنے روابط برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے ہر قیمت پر اپنا تحفظ مطلوب ہوتا ہے کہ اگر اونٹ اِس کروٹ بیٹھ جائے تب بھی ہمارے لیے بچاؤ کا کوئی راستہ رہ جائے اور اگر کہیں اُس کروٹ اونٹ بیٹھے تب بھی ہمارے لیے مکمل تباہی نہ ہو!—— اس کیفیت کو قرآن ''تربص'' سے تعبیر کرتا ہے اور یہی درحقیقت نفاق کی بنیاد ہے۔ سورۃ الحدید میں جہاں نفاق کی اصل حقیقت اور اس کے اسباب کا بیان ہے' وہاں یہ لفظ آیا ہے۔ اسی طرح سورۃ التوبۃ کی آیت ۲۴ میں بھی' جس کا حوالہ اس سے قبل دیا جا چکا ہے' یہ لفظ ہمارے مطالعے میں آ چکا ہے' کہ اے نبی! ان مسلمانوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تمہیں اپنے باپ اور اپنے بھائی اور اپنے بیٹے اور اپنی بیویاں اور اپنے رشتہ دار اور اپنے وہ مال جو تم نے جمع کیے ہیں اور اپنے کاروبار جو تم نے بڑی محنت سے جمائے ہیں اور جن کے مندا پڑ جانے کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے اور اپنی جائیدادیں جو تمہیں بہت محبوب ہیں' اگر یہ تمام

چیزیں محبوب تر ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد سے تو جاؤ حالت تربص میں رہو' انتظار کرو!—— یہاں اسلوب میں غیظ وغضب نمایاں ہے اور الفاظ یہ ہیں: ﴿فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ ''جاؤ' انتظار کرو' یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔'' (مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب' درس 19)

نفاق کا علاج: انفاق

''دلچسپ بات یہ ہے کہ ''نفاق'' اور ''انفاق'' دونوں کا سہ حرفی مادہ ایک ہی ہے یعنی ''ن ف ق''۔ اس سے ''نفق'' اور ''نافقاء'' کے الفاظ آتے ہیں جس سے منافقت کا لفظ نکلا ہے اور اسی مادے سے ''نَفَقَ يَنْفَقُ'' کے الفاظ مشتق ہیں جن سے باب افعال میں ''انفاق'' بنتا ہے' یعنی خرچ کر دینا اور کھپا دینا۔ یہی انفاق دراصل منافقت کا تیر بہدف علاج ہے۔ اللہ کی راہ میں جان و مال خرچ کرو' لگاؤ اور کھپاؤ! دل کی دنیا کو اس مال کی محبت اور اس کی نجاست سے پاک وصاف کرو!—— دنیا کا تمام مال واسباب محض برتنے اور استعمال کرنے کی چیز ہے (مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا) لیکن دیکھنا اس کی محبت دل میں راسخ نہ ہونے پائے' یہ مال و دولتِ دنیا کسی درجے میں بھی تمہارا مطلوب و مقصود نہ بن جائے!—— اس کا ذریعہ یہی ہے کہ جو مال و دولت اللہ نے تمہیں عطا کیا ہے اسے زیادہ سے زیادہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ مال کی محبت کو دل سے کھرچنے اور نفس کے تزکیے کے لیے یہ عمل بہت ضروری ہے۔''

(مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب' درس 19)

تکمیل وختمِ نبوت کا منطقی تقاضا

قرآن حکیم سے جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ تمام نوعِ انسانی کے لئے رسول بنا کر مبعوث کئے گئے ہیں اور آپؐ کی رسالت تا قیامِ قیامت دائم اور جاری وساری ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خاتم الانبیاء وآخر الرسل محمد ﷺ جو دین حق دے کر مبعوث فرمائے گئے تھے اور جس دین کو تمام نظامہائے حیات پر غالب کرنا آپؐ کا فرضِ منصبی قرار دیا گیا تھا، اس دین کی دعوت وتبلیغ اور اقامت کا کام جاری رہے۔ چنانچہ اب یہ فریضہ اُمّتِ مسلمہ کے سپرد ہوا۔ یعنی ایک طرف اللہ کا پیغام تمام بنی نوعِ انسان تک اس درجہ میں پہنچا دینا کہ لوگوں پر حجت قائم ہو جائے کہ وہ اللہ کے یہاں یہ عذر پیش نہ کر سکیں کہ ہم تک تیرا پیغام نہیں پہنچا۔ اور پھر اسی پر بس نہیں بلکہ پورے کرۂ ارضی پر دین حق کو بالفعل غالب وقائم کرنا بھی اس امت کی ذمہ داری ہے۔ اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ بنفسِ نفیس اپنے مشن کی ایک حد تک تکمیل فرما کر اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک انقلاب کی تکمیل ہوگئی، لیکن آپؐ کا مشن تو درحقیقت اس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچے گا جب پورے کرۂ ارضی پر اللہ کا پرچم سب سے بلند ہوگا۔

اس پہلو سے جہاں تک نبی اکرم ﷺ کا تعلق ہے تو حضورؐ اپنے فرضِ منصبی کے اعتبار سے اس پر مامور تھے کہ آپؐ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک انقلاب کی تکمیل بنفس نفیس فرما دیں۔ یہ گویا آپؐ کی آفاقی، عالمی اور دائمی بعثت ورسالت کا اولین مرحلہ تھا جو پورا ہوا۔ لیکن ابھی بین الاقوامی اور عالمی سطح پر دعوت وتبلیغ کا کام باقی تھا جس کا نبی اکرم ﷺ نے اپنی حیاتِ دنیوی کے دوران بنفسِ نفیس آغاز فرما کر پھر اس مشن کو امت کے حوالے فرما دیا کہ اب اس فریضہ کی عالمی سطح پر تکمیل تمہارے ذمہ ہے۔ اب ایک ایک فردِ نوعِ بشر تک دعوت وتبلیغ اور شہادت علی الناس کا فرض تمہیں انجام دینا ہے اور پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کا بول بالا کرنا یعنی ''اسلامی انقلاب'' تم نے برپا کرنا ہے۔''

(کتاب: منہج انقلاب نبویؐ)

''کتنی بڑی خوش قسمتی ہے اُمتِ محمد (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی کہ یہاں کوئی مصنوعی شخصیت تراشنے اور گھڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسروں کو تو مصنوعی شخصیتیں گھڑنی پڑتی ہیں اور ان کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ ہر دور میں انہیں ایک نئی شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے علامہ اقبال کا یہ مصرع بڑا پیارا ہے کہ ع ''می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر!'' لیکن ہمارے پاس نبی اکرم ﷺ کی محبوب' دلنواز' دلآویز' من موہنی' معراجِ انسانیت پر فائز شخصیت' جن کی سیرت و کردار پر کوئی دشمن بھی کہیں کوئی انگلی نہ رکھ سکا' انسانِ کامل' انسانی عظمت کا مظہرِ اتم شخصیت موجود ہے۔ آپ ﷺ کی شخصیت ہماری ملی شیرازہ بندی کے لیے مرکزی شخصیت ہے۔ آپؐ کے ساتھ دلی محبت' آپؐ کا ادب' آپؐ کی تعظیم' آپؐ کا احترام' آپؐ سے عقیدت' اگر اسلامی معاشرہ میں ان تمام امور کا جذبہ موجود رہے گا تو معاشرہ بنیانِ مرصوص بنا رہے گا۔ آپ ﷺ وہ شخصیت ہیں کہ جن کے متعلق بالکل صحیح کہا گیا ہے ؎

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا!

آپؐ وہ شخصیت ہیں جن کے بارے میں علامہ اقبال نے بالکل درست کہا ہے کہ ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

اب اگر ہم ان دونوں بنیادوں کو جمع کریں تو ایک ہے ہماری ہیئتِ اجتماعیہ یا حیاتِ ملی کے لیے دستوری' آئینی اور قانونی بنیاد ——— اور وہ ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی اطاعت۔ یہ گویا ایک دائرہ ہے اور اس دائرے کے درمیان ہے ایک انتہائی دلنواز اور دلآویز شخصیت' بقول شاعر ع ''نگہ بلند' سخن دل نواز' جاں

پرسوز'' کا مصداقِ کامل ـــــ اس کے لیے اگر ''مرکز ملت'' کی اصطلاح اختیار کی جائے تو مجھے اعتراض نہیں' لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ہمارا یہ مرکز دائم و قائم ہے۔ یہ کسی بھی دور میں بدلنے والا نہیں ہے' بلکہ یہ تو ہمیشہ ہمیش کے لیے تا قیامِ قیامت جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی شخصیت ہے جو ''مرکز ملت'' کے مقام پر فائز رہے گی اور حضور ﷺ ہی کو معیارِ مطلق بنانا ہوگا۔ مختلف مسلمان معاشروں اور مختلف مسلمان ملکوں میں یقیناً جب رہنما اور مصلح سامنے آتے ہیں تو ہمیں ان سے محبت و عقیدت پیدا ہوتی ہے۔ اگر ترکوں کے دلوں میں مصطفیٰ کمال کی عظمت ہے تو ٹھیک ہے' وہ ان کے محسن تھے۔ اسی طرح پاکستانی مسلمانوں کے دلوں میں اگر قائداعظم محمد علی جناح مرحوم کی محبت ہے تو درست ہے' وہ ہمارے محسن ہیں۔ لیکن ہمیشہ کے لیے اور جو ابدی معیار قائم و دائم رہے گا وہ شخصیت جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ اگر ہم نے اس معیار کو مجروح کر دیا تو یہ جان لیجیے کہ پھر مسلمانوں کی حیاتِ ملی کی ایک اہم اساس منہدم ہو جاتی ہے۔ یہ ہمارا معیار ہے جو مستقل ہے' دائم و قائم ہے۔ یہ نہ صرف ہماری تہذیبی و ثقافتی ہم آہنگی کی ضمانت دیتا ہے' بلکہ اس تہذیبی و ثقافتی ہم رنگی' ہم آہنگی اور یکسانیت کے ساتھ تہذیب و ثقافت کا ایک تسلسل و تواتر ہے جو چودہ سو سال سے جاری و ساری ہے۔ وضع قطع اور لباس کے حدود و قیود اور نشست و برخاست کے انداز' حضور ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کے اتباع سے مسلمانوں میں فروغ پذیر ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان چاہے مشرقِ بعید کے رہنے والے ہوں یا مغربِ بعید کے' غرض دنیا کے کسی خطے میں بسنے والے مسلمان ہوں' ان سب کے درمیان ایک مناسبت' ہم رنگی' اور یکسانیت نظر آتی ہے۔ یہ اسی لیے ہے کہ ان کے لیے مرکزی شخصیت ہمیشہ ہمیش کے لیے جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے۔''

(کتاب: مسلمانوں کی سیاسی و ملی زندگی کے رہنما اصول)

مرتبہ و مقامِ محمدیؐ کا لحاظ اشد ضروری ہے

''آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران کچھ واقعات ایسے ہوئے کہ جن میں لوگوں سے کچھ بے احتیاطی ہوئی' جس سے حضور ﷺ کا بلند' ارفع و اعلیٰ مقام مجروح ہونے کا کچھ اندیشہ ہوا۔ کسی نے کبھی اپنی آواز کو حضور ﷺ کی آواز سے کچھ بلند کر لیا—— اس پر فرمایا گیا کہ مسلمانو! ہرگز ایسا نہ کرنا۔ یہ وہ عمل ہے کہ تمہیں محسوس بھی نہیں ہوگا لیکن یہ اتنی بڑی گستاخی شمار ہوگی کہ تمہارے پچھلے کیے کرائے سارے اعمال رائیگاں ہو جائیں گے' تمہاری ساری نیکیاں اکارت جائیں گی۔ پھر مثبت انداز میں بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی تعلیم اور اس کی افزائش کے لیے انہی حضرات کے دلوں کو جانچ کر اور پرکھ کر منتخب فرما لیا ہے کہ جو اپنی آوازوں کو نبی ﷺ کی آواز کے سامنے پست رکھتے ہیں۔ اس معاملہ میں باہر سے آنے والے بدوؤں سے کچھ بے احتیاطی ہو جاتی تھی۔ جیسے کتب سیرت میں واقعہ ملتا ہے کہ بنی تمیم کے کچھ لوگ آئے اور جیسا کہ وہاں کے بدوؤں کا ایک مزاج تھا' انہوں نے مسجد نبوی میں آ کر پکارنا شروع کر دیا ''یا محمّد اُخرج علینا'' یعنی ''اے محمد (ﷺ) باہر آیئے'' —— اس پر ان کو ٹوک دیا گیا' لیکن ساتھ ہی فرما دیا گیا کہ یہ لوگ ناسمجھ ہیں۔ ان کی نیت میں خلل نہیں ہے' یہ ان کے مزاج کا اکھڑ پن ہے جو ان کی طبیعتِ ثانیہ بن گیا ہے' اسی کا یہ ظہور ہے' لہٰذا ٹوکنے کے ساتھ ہی فرمایا گیا: ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵﴾ ''اللہ بخشنے والا ہے' رحم فرمانے والا ہے'' لیکن احتیاط کی بہرحال ضرورت ہے۔

اس کے بعد آیت ۶ میں جو بات آئی ہے' اس پر ان شاء اللہ بعد میں گفتگو ہوگی۔

میں نے اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کو تین موضوعات میں تقسیم کیا ہے۔ چھٹی آیت کا تعلق ان معین موضوعات میں سے دوسرے موضوع سے ہے' لیکن آیات ۷ اور ۸ میں وہ

اہم ترین بات آئی ہے جو موضوع زیر گفتگو سے متعلق ہے۔ فرمایا: ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ﴾ ''اچھی طرح جان لو کہ تمہارے مابین (جو محمد ﷺ کی شخصیت ہے وہ) اللہ کے رسول ہیں'' ـــــ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ یہ محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہیں' لیکن تمہیں آپؐ کی جو شان ہر آن ملحوظ رکھنی چاہیے وہ یہ حقیقت ہے کہ حضور ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اب فرض کیجیے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ یہ سمجھ کر کہ محمد ﷺ میرے بھتیجے ہیں' آپؐ کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کریں جیسے ایک بڑا اپنے چھوٹے سے کرتا ہے تو یہاں حضور ﷺ کی رسول کی حیثیت کے مجروح ہونے کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا فرمایا گیا: ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ﴾ ''اور جان لو کہ (محمد ﷺ) تمہارے مابین اللہ کے رسول ہیں''۔ ان کے ساتھ وہ معاملہ کرو جو ایک اُمتی کو رسول کے ساتھ کرنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کا ادب واحترام اور آپ ﷺ کی تعظیم وتوقیر کو ہر آن ملحوظ رکھو۔

اس ضمن میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ نقشہ خاص طور پر سامنے لایا گیا کہ اللہ نے تمہارے دلوں میں ایمان کو راسخ اور جاگزیں کر دیا ہے' اسے تمہارے دلوں میں کھبا دیا ہے' تمہارے دلوں کو ایمان سے مزین کر دیا ہے اور کفر وفسق سے اور معصیت سے تمہیں طبعاً نفرت ہو چکی ہے۔ اس اسلوب میں جہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مدح ہے' وہاں یہ ترغیب وتشویق کا بھی انداز ہے کہ اس معاملے میں ذرا احتیاط ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ حضور ﷺ کی ''رسول اللہ'' ہونے کی حیثیت کسی حال میں بھی نظر انداز نہ ہونے پائے۔''

عزت وشرف کی بنیاد: تقویٰ

''رنگ ونسل کی بنیاد پر انسانوں میں اونچ نیچ کا تصور قائم کرنا کہ فلاں نسل اعلیٰ ہے اور فلاں ادنیٰ' نوعِ انسانی کا فلاں طبقہ بڑھیا ہے اور فلاں گھٹیا ـــــ یہ بالکل غلط نظریہ اور سراسر غلط تصور ہے۔ یہ انسانوں کے درمیان فساد' نفرت اور عداوت پیدا کرنے والا تصور ونظریہ ہے۔ یہ اونچ نیچ اور اعلیٰ وادنیٰ کی تقسیم اس فطری فرق و تفاوت کا بالکل غلط استعمال ہے' جسے قرآن حکیم صحیح تسلیم کر رہا ہے کہ: ﴿وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا﴾ ''اور ہم نے تمہاری قومیں اور تمہارے قبیلے بنائے تاکہ تم باہم ایک دوسرے کو پہچانو'' ـــــ لیکن ایک بنائے شرف اور بنائے عزت بھی اللہ نے رکھی ہے: ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ﴾ جان لو کہ اللہ کے نزدیک تو تمہارے مابین اونچ نیچ کا معاملہ صرف ایک بنیاد پر ہے ـــــ اور وہ بنیاد رنگ نہیں ہے' خون نہیں ہے' نسل نہیں ہے' وطن نہیں ہے' زبان نہیں ہے' شکل وصورت نہیں ہے' قومیت نہیں ہے' بلکہ وہ واحد بنیاد ہے تقویٰ' خدا ترسی' پرہیز گاری' نیکوکاری' اعلیٰ سیرت وکردار' اعلیٰ اخلاق اور حسن معاملات۔ اللہ کے نزدیک کوئی اونچا ہے تو ان اوصاف کی بنیاد پر اور کوئی نیچا ہے تو ان کے فقدان کی بنا پر۔ اونچ نیچ اور شرافت و رذالت کے لیے اس کے سوا اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی اور بنیاد نہیں ہے۔''

(کتاب: مسلمانوں کی سیاسی وملی زندگی کے رہنما اصول)

مقامِ رسالت کے حوالے سے ہماری ذمہ داری!

''رسول اللہ ﷺ کی ثابت شدہ سنتیں اور احادیث ہمارے لیے حضور ﷺ کی قائم مقام ہیں۔ نبی اکرم ﷺ آج بھی معناً ہمارے مابین موجود ہیں' اس لیے کہ حضور ﷺ کی سنتیں آج بھی زندہ و پائندہ ہیں۔ حضور ﷺ کا اُسوۂ حسنہ آج بھی نصف النہار کے خورشید کی طرح درخشاں و تاباں ہے۔ ہمارے سامنے جب بھی کوئی بات حضور ﷺ کی آئے ہمیں اپنی عقل کو ایک طرف رکھ دینا چاہیے' اپنے فلسفے بگھارنے بند کر دینے چاہئیں' اپنی منطق کو پس پشت ڈال دینا چاہیے' اپنے ''اقوال'' پر تالا ڈال دینا چاہیے۔ تحقیق تو ہو سکتی ہے کہ حضور ﷺ نے یہ بات فرمائی یا نہیں فرمائی' لیکن ادب کا تقاضا یہ ہے کہ حضور ﷺ کی حدیث کے حوالے سے جب بات سامنے آئے تو زبان فوراً بند ہو جائے' سر فوراً جھکا دیے جائیں۔ بعد میں اگر تحقیق سے معلوم ہو کہ روایت صحیح نہیں تو ٹھیک ہے' اس پر اب عمل نہیں ہو گا' لیکن ادب کا تقاضا یہ ہے کہ حضور ﷺ کی کوئی بات اگر سامنے آئے تو فوراً سرِ تسلیم خم کر دیا جائے۔ اگر اس کے برعکس پھر بھی ہم اپنے فلسفے چھانٹیں اور اپنی منطق بگھاریں تو یہ وہ طرزِ عمل ہو جائے گا: ﴿اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ﴾ ''مبادا تمہارے تمام اعمال اکارت ہو جائیں'' ﴿وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝۲﴾ ''اور تمہیں اس کا ادراک و احساس تک نہ ہو۔''

(کتاب: مسلمانوں کی سیاسی و ملی زندگی کے رہنما اصول)

تحریک پاکستان میں مسلمانانِ ہند کا جوش و جذبہ

''قائداعظم محمد علی جناح نے جب اسلام کا راگ الاپا اور قوالی گائی تو اس کے نتیجے میں قوم کو ''حال'' آ گیا۔ آپ ذرا سوچیے کہ مسلم اقلیتی صوبوں کے لوگوں نے مسلم لیگ کو کیوں ووٹ دیے؟ کیا اتر پردیش اور مدراس پاکستان میں آ سکتے تھے؟ اور کیا بمبئی اور CP پاکستان کا حصہ بن سکتے تھے؟ یہ بات بظاہر عقل کے خلاف معلوم ہوتی ہے' لیکن یہ دراصل مسلمانوں کے حال میں آنے کا نتیجہ تھا۔ جہاں جذبات کی حکمرانی ہو جاتی ہے وہاں عقل ایک طرف رہ جاتی ہے' ورنہ اور کوئی وجہ نہیں تھی کہ پاکستان کے ساتھ کسی تعلق کے نہ ہونے کے باوجود اقلیتی صوبوں کے مسلمان پاکستان کے لیے مسلم لیگ کو ووٹ دیتے۔ قرارداد پاکستان ۱۹۴۰ء میں منظور ہو چکی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کامیاب ہو گئی اور اسے پورے ہندوستان میں نہ صرف اکثریتی صوبوں میں بلکہ اقلیتی صوبوں میں بھی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

اس دوران میں دعائیں بھی بہت مانگی گئیں اور نعرہ لگایا گیا: ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ''۔ اگرچہ کچھ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ یہ کوئی سنجیدہ نعرہ نہیں تھا' بلکہ بچوں کا بنایا ہوا نعرہ تھا۔ بے شک یہ بچوں کا بنایا ہوا نعرہ ہو لیکن بہرحال یہ مسلمانانِ ہند کے دلوں کی آواز بنا ہے۔ میں تو خود اُن لوگوں میں سے ہوں جنھوں نے یہ نعرے لگائے ہیں۔ اُس وقت میں ہائی سکول کے طالبِ علم کی حیثیت سے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن ضلع حصار کا جنرل سیکرٹری تھا۔ ہم نے جلسوں' جلوسوں میں یہ نعرے لگائے ہیں اور جمعہ اور عیدین کے اجتماعات میں گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگی ہیں کہ اے اللہ! ہمیں انگریز اور ہندو کی دوہری غلامی سے نجات دے دے' ہمیں ایک آزاد خطۂ ارضی عطا فرما' وہاں پر ہم تیرے دین کا بول بالا کریں گے اور تیرے نبی ﷺ کی شریعت نافذ کریں گے۔

درحقیقت اگر یہ نعرہ اور پیغام نہ ہوتا تو پورے ہندوستان کے مسلمان ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں مسلم لیگ کو ووٹ نہ دیتے۔ لہٰذا اس اعتبار سے یہی فیصلہ کن نظریہ تھا جو پاکستان کی بنیاد بنا۔

اسی زمانے میں ہندو مسلم کشاکش بھی انتہا کو پہنچ گئی۔ چونکہ ہندوؤں کے لیے بھارت ماتا نہایت مقدس تصور ہے اور الگ وطن کا مطالبہ کر کے مسلمان گویا بھارت ماتا کو ٹکڑے کرنا چاہتے تھے لہٰذا ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف شدید نفرت اور دشمنی پیدا ہوگئی اور اس دشمنی کا ظہور تقسیم ہند کے وقت ہوا۔ چنانچہ مسلمانوں کا قتل عام ہوا' انسان بھیڑیوں سے بڑھ کر سفاک بنا' چھوٹے چھوٹے بچوں کو اچھال کر نیزوں میں پرویا گیا' لاکھوں عورتوں کی عصمت دری ہوئی' بے شمار عورتیں اغوا ہوئیں' لاکھوں آدمی قتل ہوئے۔ ایک کروڑ انسان اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر منتقل ہوئے۔ آبادی کی اتنی بڑی ہجرت تاریخ انسانی میں کبھی نہیں ہوئی۔

اس کے حوالے سے میں قائد اعظم کا ایک اور اقتباس پیش کر رہا ہوں' جو ۱۸ جنوری ۱۹۴۶ء کو سول اینڈ ملٹری گزٹ میں شائع ہوا۔ حبیبیہ ہال' اسلامیہ کالج لاہور میں مسلمان خواتین کا ایک اجلاس ہوا جس میں قائد اعظم نے فرمایا:

> *"If we do not succeed in our struggle for Pakistan, the very trace of Muslims and Islam will be obliterated from the face of India.*
>
> ''اگر ہم پاکستان کے حصول کی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے تو ہندوستان سے مسلمانوں اور اسلام کا نام ونشان مٹ جائے گا''۔

اور یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ اس طرح ہسپانیہ کی تاریخ دہرائی جاتی۔ وہاں بھی مسلمانوں نے آٹھ سو برس حکومت کی تھی' لیکن پھر وہ وقت آیا کہ پندرہویں صدی کے آخر اور سولہویں صدی کے شروع میں وہاں مسلمانوں کا ایک بچہ تک باقی نہیں رہا۔ سارے کے سارے مسلمان یا تو قتل کر دیے گئے' یا زندہ جلا دیے گئے یا انہیں جہازوں میں بھر بھر کر افریقہ کے شمالی ساحل پر پھینک دیا گیا۔ وہاں غرناطہ کے محل اور مسجد

قرطبہ اب بھی قابل دید ہیں' جو مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی تہذیب کا مرثیہ کہتے ہیں۔ علامہ اقبال نے کہا تھا:

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے
مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں!

وہی معاملہ ہندوستان میں بھی ہوسکتا تھا۔ یہ قائداعظم کے الفاظ ہیں جن کی میں تائید کرتا ہوں' اس لیے کہ اُس وقت ہندو جارحیت اور تشدد پرستی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور ہندو کے جذبات بھی انتہا کو پہنچ گئے تھے' اور اس کے بعد یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔''

(میثاق' مئی ۲۰۰۷ء)

غیر اسلامی نظام کے تحت زندگی کا کفارہ

''اِس وقت ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہم غیر اسلامی نظام کے تحت زندگی گزار رہے ہیں اور یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ اِس صورت حال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ دنیا میں کسی بھی جگہ اسلامی نظام قائم نہیں کہ وہاں ہجرت کر جائیں اور اس مجرمانہ زندگی سے چھٹکارا پاسکیں۔ جب کہیں اسلام کا نظام ہی موجود نہیں ہے تو ہم سود یا سود کا غبار کھانے پر مجبور ہیں۔ اسی طرح ہمیں کئی اور ایسے گناہوں پر مجبور کر دیا گیا ہے جن کے خلاف ہمارا بس نہیں چلتا۔ ہم طوعاً و کرھاً ان میں شریک اور حصہ دار ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس کا کوئی کفارہ بھی ہے جس کو ادا کر کے ہم اللہ کی جناب میں سرخرو ہوسکیں؟ تو میری نظر میں اس کا کفارہ یہ ہے کہ ہم اس طاغوتی نظام کے خاتمے اور اسلامی نظام کے قیام کے لیے جدوجہد اور کوشش کریں۔ ہم ایسا کریں گے تو یہ غیر اسلامی نظام کے تحت زندگی گزارنے کے گناہ کا کفارہ اور تلافی ہو جائے گی۔''

خلافتِ راشدہ کے خصائص

''موجودہ دور میں اسلامی نظامِ خلافت کی بنیاد تین چیزوں پر ہوگی: (i) اللہ کی حاکمیت (ii) قرآن وسنت کی بالادستی (iii) شورائیت یعنی جو معاملات مباحات کے درجے میں ہوں گے وہ باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔

اس ضمن میں ایک بات ضرور نوٹ کر لیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد جو خلافت راشدہ قائم ہوئی تھی اس کے بعض خصائص ایسے ہیں جو دنیا میں دوبارہ repeat نہیں ہو سکتے۔ خلافت راشدہ دورِ نبوت کا ضمیمہ تھی' ان کے درمیان کوئی زمانی فصل نہیں تھا۔ آپؐ کا انتقال ہوتے ہی حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا آغاز ہو گیا۔ اس لیے اس دور کی واقعاتی صورت حال میں چند باتیں اچھی طرح ذہن میں ہونی چاہئیں:

(ا) نبی اکرم ﷺ کی دعوت وتعلیم اور تربیت وتزکیہ کی وجہ سے بحیثیتِ مجموعی پورے ماحول پر خیر کا غلبہ تھا۔ یہ نہیں کہ شر تھا ہی نہیں' شر تھا ضرور' لیکن مغلوب اور دبا ہوا تھا۔ خاص طور پر وہ جماعت جو ہر وقت حضور ﷺ کے بہت قریب رہتی تھی ان کے اندر تو خیر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ آپؐ اپنے صحابہؓ سے تمام معاملات میں مشاورت فرماتے اور صحابہ کرامؓ بھی آپؐ کے حکم کے بغیر ایک قدم بھی نہ اٹھاتے تھے۔ آپؐ کا ان صحابہؓ سے تعلق اس قدر گہرا تھا کہ ایک دفعہ بعض لوگوں نے ان مقتدر صحابہ کے ساتھ گستاخی کا معاملہ کیا تو رسول اللہ ﷺ نے باقاعدہ خطبہ دیا اور اس میں فرمایا:

((لَا تَسُبُّوْا اَصْحَابِیْ فَلَوْ اَنَّ اَحَدَکُمْ اَنْفَقَ مِثْلَ اُحُدٍ ذَهَبًا مَا بَلَغَ مُدَّ اَحَدِهِمْ وَلَا نَصِیْفَهٗ)) (۱)

''دیکھو! میرے صحابہ کو برا بھلا مت کہو' یقیناً تم میں سے کوئی شخص اللہ کی راہ میں کوہِ اُحد جتنا سونا صدقہ کرے تب بھی وہ ان میں سے کسی کے اللہ کی راہ میں دیے گئے ایک مُد بلکہ آدھے کے برابر بھی نہیں پہنچ سکتا''۔

غور طلب بات تو یہ ہے کہ اُس وقت آپ کے مخاطبین صحابہؓ ہی تھے' پھر بھی آپؐ نے فرمایا کہ میرے صحابہ کو گالی نہ دو۔ معلوم ہوا کہ ''اَصْحَابِی'' سے مراد آپؐ کی تیار کردہ خاص جماعت تھی' جو حزب اللہ کہلاتی تھی۔ (اس جماعت کے تفصیلی اوصاف سورۃ المائدۃ میں بیان ہوئے ہیں۔) یہ ایسی جماعت تھی جس کا تزکیہ اس درجے ہو چکا تھا کہ اس سے آگے تزکیہ کا تصور بھی ممکن نہیں تھا۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ کیجئے، ایک جنگ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک مشرک سے مقابلہ ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس پر غالب آ گئے اور پچھاڑ کر اس کے سینے پر سوار ہو گئے۔ آپؓ ابھی خنجر گھونپنے ہی والے تھے کہ نیچے پڑے ہوئے کافر نے اُن پر تھوک دیا۔ اب حضرت علی رضی اللہ عنہ اسے چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے۔ وہ شخص سخت حیران ہوا کہ میں تو مغلوب تھا' میرے سینے میں تو خنجر آیا چاہتا تھا' پھر میں نے ان کے چہرے پر تھوک کر ان کی توہین بھی کر دی' پھر یہ مجھے چھوڑ کر کھڑے کیوں ہو گئے؟ اُس نے حضرت علیؓ سے پوچھا: آپ نے ایسا کیوں کیا؟ حضرت علیؓ نے فرمایا: دیکھو میرا تم سے کوئی ذاتی جھگڑا نہیں ہے' میں تو تمہیں اللہ کے لیے قتل کر رہا تھا۔ اب جب تم نے میری توہین کی تو تمہاری اس حرکت سے میرے اندر ذاتی انتقام کا جذبہ بھی پیدا ہو گیا۔ اب اگر میں تمہیں قتل کرتا تو یہ عمل خالصتاً لوجہ اللہ نہ ہوتا' بلکہ اس میں میرا جذبۂ انتقام بھی شامل ہو جاتا' اس لیے میں نے تمہیں چھوڑ دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ صحابہؓ کے احتسابِ نفس کا اندازہ کیجیے کہ عین حالتِ جنگ میں بھی انہوں نے اپنی نیت پر کڑی خود احتسابی عائد کی ہوئی تھی۔ کیا اس کی کوئی ادنیٰ سی مثال بھی مل سکتی ہے؟ نیت کی پاکیزگی کا اس درجے لحاظ رکھنا، یہ صرف جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہی خاصہ تھا، جنہوں نے آپؐ سے تربیت پائی تھی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مخصوص جماعت کے افراد ورع وتقویٰ کے امام' عدل وانصاف کے پیکر' دُنیوی جاہ وجلال سے نفرت کرنے والے تھے' اس لیے ان کی امانت ودیانت پر مکمل اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ خلفائے راشدین بھی چونکہ اسی گروہ کے افراد تھے اس لیے خلافتِ راشدہ میں ریاست کے تمام شعبوں مثلاً عدلیہ' انتظامیہ' فوج وغیرہ پر انہیں مطلق

اختیارات تفویض کرنا باعثِ ضرر نہیں تھا۔ چنانچہ ہمیں یہی دکھائی دیتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جو خلیفہ وقت ہیں' خود مجتہد بھی ہیں' قاضی بھی ہیں، حتیٰ کہ سپہ سالار بھی خود ہی ہیں۔ آج ہمیں سیدنا ابوبکر' سیدنا عمر' سیدنا عثمان اور سیدنا علی رضی اللہ عنہم جیسی دیانت دار' فہیم' مخلص اور اللہ سے ڈرنے والی شخصیات میسر نہیں ہیں۔ لہٰذا اب جملہ اختیارات کسی ایک فرد کی ذات میں مرتکز نہیں کیے جا سکتے۔

(۲) خلفائے راشدین تا حیات خلیفہ ہوتے تھے۔ یعنی ایک دفعہ جو صحابی خلیفہ منتخب ہو گئے تو وہ اپنی وفات تک کے لیے خلیفہ ہیں۔ لیکن اب ایسے نہیں ہوگا' اس لیے کہ خلفاء راشدین کے بارے میں قطعاً یہ اندیشہ نہیں تھا کہ کسی وقت انہیں اقتدار کا نشہ چڑھ جائے اور وہ لوگوں پر ظلم' جبر' تشدد' زیادتی کرنے لگیں اور ناانصافی پر اتر آئیں۔ آج لوگوں کے اخلاقیات اس قدر اعلیٰ اور کردار اس قدر پختہ کہاں ہیں کہ وہ سیم و زر کی چمک سے مرعوب نہ ہوں۔ پولیٹیکل سائنس کا اصول ہے:

"Authority tends to corrupt and absolute authority corrupts absolutely."

چنانچہ موجودہ دور میں حکومت کسی ایک فرد کے ہاتھ میں نہیں دی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت دنیا کے جدید قانون میں Counstitutional Law ایک علیحدہ شعبہ ہے جس میں سارا زور اسی پر ہوتا ہے کہ چیک اینڈ بیلنس رہنا چاہیے' یعنی اختیار کے اوپر بھی نگرانی ہو اور حاکم کے ذہن میں ہر وقت جواب دہی کا تصور موجود رہے۔ کیونکہ اگر کسی کے ہاتھ میں ایسا اختیار آ جائے جس پر نہ کوئی نگران ہو' نہ آدمی کو جواب دہی کی فکر ہو تو ایسا صاحب اختیار تو بدعنوان ہو جائے گا۔ یہ اصول خلفائے راشدین کے بارے میں نہیں ہے۔ لہٰذا جب انہیں ایک مرتبہ منتخب کیا گیا تو وہ پوری زندگی کے لیے خلیفہ بن گئے۔

(۳) اُس وقت ایک اور انتہائی اہم بات یہ بھی تھی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں قرآن اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدا کردہ درجہ بندیاں (gradations) بھی موجود تھیں۔ سب سے اوپر دس صحابہ یعنی عشرۂ مبشرہ تھے' پھر تین سو تیرہ اصحابِ بدر' پھر چودہ سو یا اٹھارہ سو اصحابِ بیعتِ رضوان' پھر فتح مکہ سے قبل ایمان لانے والے اور آخر میں وہ لوگ جو فتح مکہ کے

بعد ایمان لائے تھے۔ اس درجہ بندی کی بدولت اُمت کو فائدہ یہ ہوا کہ پہلے چاروں خلفاء اُمت کے دس بہترین لوگوں میں سے ہوئے۔ سب سے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ انہوں نے تو اپنے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فیصلہ دے دیا کہ میرے بعد یہ خلیفہ ہوں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی شہادت کے وقت کسی خاص شخص کے بارے میں فیصلہ نہ کر پائے کہ کس کو خلافت سونپی جائے۔ انہوں نے اس کام کے لیے ایک کمیٹی بنا دی۔ کمیٹی میں اپنے منتخب کردہ نہیں بلکہ اللہ اور رسول کے منتخب کردہ انہی عشرۂ مبشرہ میں سے صحابہؓ کو شامل کیا۔ یہ نہیں کہا کہ سارے قبیلوں میں سے ایک ایک آدمی لے آؤ' جیسے ایوب خان نے کیا تھا کہ ایک الیکٹورل کالج بنالو' بعد میں وہ صدر منتخب کر دیں۔ اُس وقت عشرۂ مبشرہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علاوہ پانچ صحابہ رہ گئے تھے۔ آپؓ نے ان کی ایک باڈی بنا دی اور اپنے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ان کی گفتگو اور مشاورت کی نگرانی کرو۔ ان میں سے دو افراد سیدنا زبیر اور سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ہم اس عہدے سے دستبردار ہوتے ہیں۔ اب باقی تین رہ گئے۔ ان میں سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما سے کہا کہ اگر آپ دونوں اپنا معاملہ میرے حوالے کر دو تو میں بھی آپ کے حق میں دستبردار ہوتا ہوں۔ دونوں نے ان کی اس تجویز کو تسلیم کر لیا۔ باقی علیؓ اور عثمانؓ رہ گئے۔ اس سے یہ بھی پتا چلا کہ کسی عہدے کا امیدوار ہونا جائز ہے۔ اس لیے کہ جب تین صحابہؓ امیدواری سے دستبردار ہو گئے' تو جو رہ گئے وہ یقیناً امیدوار تھے' ورنہ وہ بھی دستبردار ہو جاتے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید میں حضرت یوسفؑ کے بارے میں مذکور ہے کہ انہوں نے خود کہا تھا: ﴿اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ﴾ (یوسف:۵۵) ''مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر کر دو''۔ لہٰذا کسی خیر کے کام کے لیے آگے بڑھنا امیدواری نہیں بلکہ ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے لیے اپنی آمادگی کا اظہار ہے۔

بہر حال حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اہل حل وعقد سے تفصیلاً مشورہ کیا' اس کے علاوہ گلیوں میں کھیلتے بچوں سے اور خواتین سے بھی رائے لی اور بالآخر حضرت عثمانؓ کو

منتخب کر دیا۔

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ صحابہ میں گریڈیشن تھی جو خود نبی کریم ﷺ نے قائم کی تھی۔ ایسا معاملہ اب نہیں ہے۔ ایک شخص بڑا متقی نظر آ رہا ہے' لیکن اس کے اندر کیا ہے ہم نہیں جانتے۔ آیا اس کی خلوت اور جلوت ایک جیسی ہے' ہمیں علم نہیں ہے۔ البتہ خلفائے راشدین کے بارے میں نبی کریم ﷺ کی سند موجود تھی۔

(۴) ایک بات اُس دور میں یہ تھی کہ معاشرہ قبائلی تھا' جس میں قبیلے کا سردار اپنے قبیلے کا نمائندہ ہوتا تھا۔ قبیلے کے ایک ایک فرد سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ قبائل کے سردار جمع ہو کر طے کر لیں تو ﴿اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ کا حق ادا ہو جاتا تھا۔ اب تمدّنی ارتقاء کے نتیجے میں سماج اس سطح تک آ پہنچا ہے کہ سیاسی عمل میں ہمیں تمام لوگوں سے رائے لینی ہوگی۔

مذکورہ چند چیزیں خلافتِ راشدہ کے خصائص ہیں' جو اب دوبارہ دنیا میں نہیں آ سکتے۔ البتہ خلافت کا جوہر باقی رہے گا کہ حاکمیت اللہ کی ہوگی' سپریم لاء قرآن اور سنت ہوگا اور اس کے نیچے نیچے مباح امور باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔'' (میثاق' اگست ۲۰۰۹ء)

''آج بھی پوپ کو پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ جو چاہے فیصلہ کرے۔ جیسا کہ اُس نے ایک فرمان کے ذریعے سے یہودیوں کو دو ہزار سال پرانے اس الزام سے بری کر دیا' کہ انہوں نے حضرت مسیحؑ کو سولی پر چڑھایا تھا۔ گویا اسے تاریخ تک کو بدل دینے کا اختیار ہے' اسی طرح وہ کسی حرام چیز کو حلال اور حلال کو حرام قرار دے سکتا ہے۔ اس طرح کے تصورات ہمارے ہاں اسماعیلیوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کا امامِ حاضر معصوم ہوتا ہے اور اسے اختیار حاصل ہے کہ وہ جس چیز کو چاہے حلال کر دے اور جس چیز کو چاہے حرام کر دے۔ اس طرح انہوں نے شریعت کو ساقط کر دیا ہے۔''

(میثاق جولائی 2012ء)

اسلامی تحریک کی اساس: شعوری ایمان

''مولانا مودودی نے یہ بات تو صحیح فرمائی تھی کہ اسلامی نظام ایک اسلامی تحریک ہی کے نتیجے میں برپا ہوگا' لیکن یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہیے کہ اس تحریک کے ضمن میں اہم ترین شے اُس کی فکری اساس ہے۔ فکری اساس ہی کے لیے ہم لفظ ''ایمان'' استعمال کرتے ہیں۔ جب تک ایمان ایک شعوری عقیدے کی شکل نہ اختیار کر لے' جب تک وہ ایک personal conviction کی صورت میں نہ ڈھلے اور اس کے اندر یقین کی گہرائی اور گیرائی کی کیفیت نہ پیدا ہو جائے' اس وقت تک ایک حقیقی اسلامی تحریک کا آغاز نہیں ہوگا۔ آپ ایک مسلمان قوم کے موروثی عقائد کی بنیاد پر' جن میں یقین کی حرارت اور گہرائی اور گیرائی نہ ہو' ایک جماعت تو بنالیں گے اور ہوسکتا ہے کہ جماعت کے لوگوں میں وقتی جوش وخروش بھی پیدا ہو جائے' لیکن اس سے اسلامی تحریک برپا نہیں ہوگی۔ ہمارے ہاں کتنی ہی تحریکیں ہیں جو جوش وخروش کا مظاہرہ کر چکی ہیں۔ اس حوالے سے نظامِ مصطفیٰ ﷺ کی تحریک ایک مثالی تحریک تھی' لیکن اس سے کیا نتیجہ برآمد ہوا؟ اسلامی تحریک برپا کرنے کے لیے ضروری یہ ہے کہ ہم اس موروثی عقیدے پر انحصار نہ کریں جس کا نام ہم نے ایمان رکھ لیا ہے۔ اس لیے کہ یہ شعوری ایمان نہیں' یہ ہمارا ایک وراثتی عقیدہ ہے جو نسلاً بعد نسلٍ ہم میں منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ یہ عقیدہ ہماری ذاتی سوچ میں پیوست اور ہمارے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے نہیں ہے۔ اس نے ہمارے ذاتی یقین کی شکل اختیار نہیں کی ہے۔ اس میں Burning faith کی حرارت موجود نہیں ہے۔ لہٰذا اسلامی تحریک کے لیے فکری اساس کی تعمیر نو ناگریز ہے۔ (میں جان بوجھ کر ''ایمان'' کی بجائے ''فکری اساس'' کے الفاظ استعمال کر رہا ہوں۔ اس کے لیے میرے سامنے علامہ اقبال کے خطباتِ مدراس کا عنوان ہے:

Reconstruction of Religious Thought in Islam یعنی ''فکرِ اسلامی کی تشکیلِ نو'')

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے انسانی تاریخ کا عظیم ترین انقلاب برپا کیا اور اس کے لیے آپؐ نے عظیم انقلابی جدوجہد کی۔ اس اعتبار سے اگر آپ نبی کریم ﷺ کی عظیم جدوجہد کو انقلابی تحریک سے تعبیر کریں تو مجھے اختلاف نہیں ہوگا۔ لیکن یہ بات پیشِ نظر رہنی ضروری ہے کہ حضورؐ کی اس جدوجہد میں بھی ایک ترتیب رہی ہے۔ اکبرالہ آبادی نے کہا تھا ؎

خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے!

نبی اکرم ﷺ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اندر ایمان کی بنیادوں کو استوار کرنے میں بڑی محنت کرنا پڑی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرامؓ کا ایمان صرف ایک عقیدہ یا وراثتاً منتقل ہو جانے والے چند عقائد کا مجموعہ نہیں تھا' بلکہ وہ اُن کے رگ و پے میں سرایت کر جانے والی ایک زندہ حقیقت تھی۔ اُن کے لیے ایمانی حقائق محض سنے ہوئے حقائق نہیں تھے بلکہ ایسے یقین کی شکل اختیار کر چکے تھے جس کو حدیث جبرئیل میں ان الفاظ میں تعبیر فرمایا گیا: ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ)) ''تم اللہ کی یوں عبادت کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو''۔ یہ حدیث جبریل کا سب سے زیادہ معروف متن ہے اور ان الفاظ کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔ دو اور صحابہ' حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے جو روایات مروی ہیں' اُن کے الفاظ میں باریک سا فرق ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے: ((اَنْ تَخْشَى اللّٰهَ تَعَالٰى كَاَنَّكَ تَرَاهُ)) ''تمہیں اللہ سے اس طرح کی خشیت ہونی چاہیے گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو''۔ اور دوسری روایت میں آیا ہے: ((اَنْ تَعْمَلَ لِلّٰهِ كَاَنَّكَ تَرَاهُ)) ''کہ تو عمل کرے (یا محنت کرے) اللہ کے لیے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔'' ((فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ)) ''اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو (یہ احساس تو ہو کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔'' کم از کم اس درجے میں تو استحضار موجود رہے۔

چنانچہ اسی کا عکس ہمیں ایک صحابیؓ کے قول میں ملتا ہے۔ ایک روز نبی کریم ﷺ نماز فجر کے بعد حسب معمول مسجد میں بیٹھے تھے۔ آپؐ نے ایک صحابی سے پوچھا: آج تیری صبح کیسے ہوئی؟ انہوں نے جواب دیا: اے اللہ کے رسول! مجھے ایک خالص اور سچے مومن کی صبح نصیب ہوئی ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے پھر سوال کیا: تمہاری ایمانی کیفیت کی صفت اور علامت کیا ہے؟ صحابیؓ نے عرض کیا: حضور میری کیفیت تو یہ تھی کہ گویا میں اپنی آنکھوں سے جنت کو دیکھ رہا ہوں اور گویا اپنی آنکھوں سے جہنم کو دیکھ رہا ہوں۔ چنانچہ جب تک یقین کی یہ گہرائی پیدا نہیں ہوگی' اسلامی تحریک نہیں چل سکتی۔ اس کے بغیر ایک سیاسی تحریک تو برپا ہوسکتی ہے اور اس میں گہرا مذہبی رنگ اور نمایاں جوش اور ولولہ بھی ہوسکتا ہے' اس میں لوگ قربانیاں بھی دے سکتے اور تن من دھن بھی لگا سکتے ہیں' جیسا کہ ماضی قریب میں مسلمانانِ پاکستان نے تحریک نظامِ مصطفیٰؐ میں جانیں دی ہیں' لیکن ایک اسلامی تحریک' جو اسلامی نظام کو قائم کر سکے' اس کی بنیادیں اگر ایمان پر نہ اٹھائی گئی ہوں اور اس کی فکری اساس پختہ' محکم اور مستحکم نہ ہو تو وہ کبھی اسلامی نظام کے قیام اور حقیقی اسلامی انقلاب کے برپا ہونے پر منتج نہیں ہوسکتی، بلکہ وہ لازماً کہیں درمیان میں رہ جائے گی۔ یا تو اس کا جوش خروش ٹھنڈا پڑ جائے گا' یا وہ مشرق یا مغرب کی طرف رخ موڑ لے گی' یا ماحول کے ساتھ مصالحت کر لے گی' یا تحریک کے وابستگان کی ہمت جواب دے جائے گی اور وہ اپنی کم ہمتی کے لیے طرح طرح کے بہانے تراشیں گے''۔

(میثاق' مارچ ۲۰۱۰ء)

''کافروں کو مہلت اس لیے ملتی ہے کہ وہ اپنے کفر میں اور بڑھ جائیں تاکہ اپنے آپ کو برے سے برے عذاب کا مستحق بنالیں۔ اللہ ان کو ڈھیل ضرور دیتا ہے' لیکن یہ نہ سمجھو کہ یہ ڈھیل ان کے حق میں اچھی ہے۔''

(میثاق جون 2009ء)

انسانی زندگی کی حقیقت

''تیسری چیز جو قرآن مجید کے ہر صفحے پر نمایاں کی گئی ہے' وہ انسانی زندگی کی حقیقت سے متعلق ہے۔ وہ لوگ جو صرف حواس کے دائرے تک اپنے آپ کو محدود رکھیں وہ تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ پیدائش سے پہلے بھی ہمارا کوئی وجود تھا اور نہ یہ مان سکتے ہیں کہ موت کے بعد بھی ہمارے وجود کا تسلسل برقرار رہے گا۔ ان لوگوں کے نزدیک لامحالہ زندگی پیدائش اور موت کا درمیانی وقفہ قرار پائے گی۔ یہی چالیس' پچاس' ساٹھ سالہ عرصہ کل زندگی شمار ہوگا۔ اسی زندگی کے متعلق بہادر شاہ ظفر نے کہا ہے: ؎

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی صرف پیدائش سے موت تک کے وقفے کا نام نہیں ہے۔

بقولِ اقبال: ؎

تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں' پیہم دواں' ہر دم جواں ہے زندگی

انسان جو تخلیق کا نقطۂ عروج ہے' اس کی کل زندگی یہی نہیں ہے' بلکہ اس کی زندگی بہت طویل ہے۔ موت معدوم ہو جانے کا نام نہیں' بلکہ ایک عالم سے دوسرے عالم میں منتقل ہونے کی کیفیت ہے۔ گویا: ؎

موت اِک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر

موت تو زندگی کا تسلسل ہے۔ انسان کی آنکھ یہاں بند ہوتی ہے تو کسی اور عالم میں کھل

جاتی ہے ؎

جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے!

دُنیوی زندگی انسان کی طویل زندگی کا ایک مختصر سا حصہ ہے۔ موت کا وقفہ ڈال کر درحقیقت زندگی کے اس چھوٹے سے حصے کو علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ یہ وقفہ کیوں ڈالا گیا ہے' اس کا جواب انبیاء کرام علیہم السلام نے دیا ہے۔ وہ یہ کہ اللہ انسان کی آزمائش کرنا چاہتا ہے۔ یہ زندگی ایک امتحان اور ایک ٹیسٹ ہے۔ قرآن عزیز کہتا ہے:

﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملک:۲)

''اُس (اللہ) نے موت اور زندگی (کے سلسلہ) کو اس لیے پیدا کیا تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں کون اچھے اعمال کرتا ہے۔''

اسی مضمون کو علامہ اقبال نے شعری پیرایہ میں یوں بیان کیا ہے: ؎

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

اس امتحان کا نتیجہ موت کے بعد نکلے گا' جب انسان کو دوبارہ اُٹھایا جائے گا اور اس کا حساب کتاب ہوگا۔ اس امتحانی وقفے میں اُس نے جو کمایا' جو کھایا' جو زبان سے کہا' جو آنکھ سے دیکھا' ہر شے کا پورا پورا حساب ہوگا۔ انسان کا ہر ایک چھوٹا بڑا عمل اُس کے سامنے آجائے گا۔ کوئی بہت بڑا (giant) کمپیوٹر ہوگا کہ ایک بٹن دبے گا اور آپ کی پوری زندگی کی ریل آپ کے سامنے آجائے گی' جسے دیکھ کر مجرمین حیران و سرگرداں ہو جائیں گے۔ قرآن کہتا ہے:

﴿وَوُضِعَ الْکِتٰبُ فَتَرَی الْمُجْرِمِیْنَ مُشْفِقِیْنَ مِمَّا فِیْهِ وَیَقُوْلُوْنَ یٰوَیْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْکِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَةً وَّلَا کَبِیْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَلَا یَظْلِمُ رَبُّکَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾﴾ (الکھف)

''اور عملوں کی کتاب کھول کر رکھی جائے گی' تو تم گناہ گاروں کو دیکھو گے کہ جو کچھ اس میں (لکھا) ہوگا اس سے ڈر رہے ہوں گے' اور کہیں گے ہائے ہماری شامت' یہ کیسی

کتاب ہے کہ نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے نہ بڑی کو (کوئی بات بھی نہیں) مگر اسے لکھ رکھا ہے۔ اور جو عمل انہوں نے کیے ہوں گے سب کو حاضر پائیں گے۔ اور تمہارا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔''

اور کہا جائے گا:

﴿اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝۱۴﴾ (بنی اسرائیل)

''اپنی کتاب پڑھ لے۔ تو آج اپنا آپ ہی محاسب کافی ہے۔''

کوئی بھی اپنے اس اعمال نامے کو جھٹلا نہ سکے گا۔ اس حساب کتاب کے نتیجے پر ہی انسان کی ابدی زندگی کی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار ہے۔ یا تو انسان کو دائمی جنت ملے گی یا پھر اُسے آتش جہنم کا ایندھن بنا دیا جائے گا۔''

تحقیر آمیز ناموں سے پکارنے کی ممانعت

''تیسرا حکم آیا: ﴿وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ﴾ ایک دوسرے کے برے نام' چڑانے والے نام' تحقیر آمیز نام رکھ کر ان ناموں سے کسی کو مت پکارا کرو۔ ظاہر بات ہے کہ اس سے انسان کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے اور اس کا ردِعمل ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کمزور ہو' احتجاج نہ کر سکے اور ''قہر درویش بر جانِ درویش'' کے مصداق اسے اندر ہی اندر ضبط کر رہا ہو۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کے جذبات مجروح نہیں ہوئے۔ یہی چیز وہ صورت اختیار کر سکتی ہے جیسے دو اینٹوں کے درمیان ان کو جوڑنے والا مسالہ کمزور پڑ جائے اور اپنی جگہ چھوڑ دے تو یہ چیز دشمن کے در آنے کا سبب بن سکتی ہے۔ لہٰذا فرمایا گیا کہ ایسے تمام رخنوں کو بند رکھنے کا اہتمام کرو۔ اس معاملہ میں احتیاط کا دامن تھامے رکھو۔''

(کتاب: مسلمانوں کی سیاسی و ملی زندگی کے رہنما اصول)

یقینِ قلبی کا ذریعہ: قرآن مجید

''اب سوال یہ ہے کہ وہ یقین کیسے پیدا ہو؟ یہ یقین کہاں سے آئے؟ اس کے لیے میں پھر عرض کروں گا کہ اس کا ذریعہ قرآن حکیم ہے۔ قرآن حکیم میں حضور ﷺ سے خطاب ہوا:

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۵۲ ﴾ (الشوریٰ)

''اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے تمہاری طرف روح القدس کے ذریعے سے (قرآن) بھیجا ہے۔ تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو لیکن ہم نے اس کو نور بنایا ہے کہ اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔ اور بے شک (اے محمدؐ) تم سیدھا راستہ دکھاتے ہو۔''

حضور ﷺ جو یقین مجسم بنے اور پھر آپؐ سے یہ یقین معاشرے کے اندر متعدی ہوا اور لوگوں میں پھیلا' قرآن مجید اس کا بھی یہی synthesis کرتا ہے۔ سورۃ الضحیٰ میں فرمایا: ﴿ وَوَجَدَكَ ضَاۗلًّا فَهَدٰى ۝۷ ﴾ ''اور اُس نے آپ کو تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو ہدایت دی۔'' یعنی آپ تفکر و اعتبار (غور و فکر) کے مراحل طے کرتے ہوئے جب ایسے مرحلے تک جا پہنچے گویا حقیقت کے دروازے پر دستک دی' تو آپؐ پر دروازے وا کر دیے گئے۔ پھر اس کے بعد اس میں یقین کا رنگ وحی کے ذریعے سے پیدا ہوا۔ آج ہمارے دلوں میں اگر ایمان کی شمع روشن ہو سکتی ہے تو اسی نورِ وحی یعنی آیاتِ قرآنی سے ہو سکتی ہے۔ اللہ کی کتاب ہی ہمارے اندر ایمان کی جوت جگا سکتی ہے۔ اللہ کی معرفت یوں تو ہمارے دلوں میں موجود ہے' لیکن وہ خوابیدہ (dormant) ہے۔ اسے بیدار کرنے کے لیے آیاتِ قرآنیہ نازل ہوئی ہیں اور یہ قرآن مجید ہی کے ذریعے activate ہو سکتی ہے۔

ایسے کچھ تار بھی ہیں سازِ حقیقت میں نہاں
چھو سکے گا نہ جنہیں زخمہ مضرابِ حواس

انسان کی فکر کی سطح پر ایمان کو activate کرنے کے لیے تو آیاتِ آفاقیہ موجود ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ﴾

(حٰمٓ السجدہ :۵۳)

''ہم عنقریب اُن کو اطرافِ عالم میں اور خود اُن کی ذات میں بھی نشانیاں دکھائیں گے' یہاں تک کہ اُن پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے۔''

لیکن اُس کے اندر کے تاروں کو چھیڑنے کے لیے آیاتِ قرآنیہ کا نزول ہوا ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ (البقرۃ:۲۵۷)

''جو لوگ ایمان لائے ہیں اُن کا دوست اللہ ہے جو ان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے جاتا ہے۔''

وہ لوگ جو ذہنی صلاحیتیں رکھتے ہوں اور جنہوں نے غور و فکر کے مراحل طے کیے ہوں' ان کے اندر قرآن مجید کی آیات ہی کے ذریعے سے یہ ایمان اُبھرے گا اور اسی کے ذریعے فکر کی جڑیں مضبوط ہوں گی۔ آپ غالب کا ایک شعر سنتے ہیں تو جھوم جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس شعر نے آپ کے وجود کے اندر کے تاروں میں سے کسی تار کو چھیڑ دیا ہے۔ آپ کا اپنا کوئی احساس تھا جو اس شعر کے ذریعے متحرک ہوا اور آپ جھوم گئے۔

ایمان و یقین حواس کے مشاہدے اور خارجی تجربہ سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ علامہ اقبال نے تو یہاں تک ثابت کیا ہے کہ خارجی تجربہ بسا اوقات انسان کو دھوکا دے دیتا ہے۔ مثلاً آپ ایک گرم چیز کو زیادہ دیر چھونے کے بعد کم گرم شے کو چھوئیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ ٹھنڈی ہے۔ لیکن ایک ٹھنڈی شے کو چھونے کے بعد آپ اسی کم گرم شے کو چھوئیں تو معلوم ہوگا کہ وہ گرم ہے۔ اندازہ کیجیے' ایک ہی شے کو آپ کے حواس گرم بھی

بتا رہے ہیں اور ٹھنڈا بھی۔ گویا خارجی تجربہ دھوکہ دے سکتا ہے اور اس سے انسان کو طرح طرح کے مغالطے ہو سکتے ہیں۔ یقینِ قلبی آیاتِ قرآنیہ سے پیدا ہوگا۔ حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو قرآن کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس کرتے ہیں گویا یہ قرآن میں لکھا ہوا نہیں ہے' ان کے اپنے دل پر نقش ہے۔ کلام اللہ اور اُن کے دل کے درمیان اتنی ہم آہنگی اور توافق ہوتا ہے کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو میری فطرت کی پکار ہے''۔

(میثاق' مارچ ۲۰۱۰ء)

عیب جوئی کی ممانعت

''جو تنگ نظر رکھنے والا انسان ہوگا' جس کا اپنا ظرف چھوٹا ہوگا' اس میں یہ بات نظر آئے گی کہ وہ دوسروں کے عیب تلاش کرے گا' عیب چینی کرے گا' عیب جوئی کرے گا' ان کی کسی برائی کو ان کے منہ پر دے مارے گا' دوسروں کی توہین کرنے کو اپنا وطیرہ بنا لے گا۔ اب یہاں دیکھئے کہ کیسا پرتأثیر اسلوب اختیار فرمایا گیا ہے: ﴿وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ کہ تم اگر کسی مسلمان کی عیب جوئی کر رہے ہو' اس پر عیب لگا رہے ہو' اس کے عیب ظاہر کر رہے ہو تو وہ تمہارا اپنا مسلمان بھائی ہے۔ گویا اس طرح تم نے خود اپنے آپ کو عیب لگایا ہے۔ اب اس سے زیادہ مؤثر اپیل کا انداز اور دلنشیں پیرایہ ممکن نہیں ہے۔ جیسے ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اپنے ماں باپ کو گالیاں مت دیا کرو''۔ اس پر کسی نے عرض کیا کہ ''کون شخص اپنے ماں باپ کو گالی دے گا؟'' حضور ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا ''اگر تم کسی کے ماں باپ کو گالی دو گے اور وہ پلٹ کر تمہارے ماں باپ کو گالی دے گا تو درحقیقت یہ تم نے خود اپنے والدین کو گالی دی''۔ اگر یہ بات دل کی گہرائی میں اتر جائے تو ﴿وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ کی بلاغت و حکمت واضح ہو کر سامنے آ جائے گی۔''

(کتاب: مسلمانوں کی سیاسی و ملی زندگی کے رہنما اصول)

منافق کون ہے؟

''منافق اسے کہتے ہیں جس کے دل میں ایمان نہ ہو لیکن وہ ایمان کا مدعی اور ایمان کا دعوے دار ہو' گویا وہ اپنے آپ کو مسلمانوں میں شامل کراتا ہو' حالانکہ اس کا دل نورِ ایمان سے خالی ہو۔ یہ بات یقیناً صحیح ہے' لیکن اس کے بارے میں یہ عام تصور جو لوگوں میں پایا جاتا ہے کہ منافق صرف وہی ہوتا ہے کہ جو ابتداء ہی سے دھوکہ اور فریب کی نیت کے ساتھ اسلام میں داخل ہو' گویا کہ اسے کبھی ایمان کی کوئی رمق سرے سے نصیب ہی نہ ہوئی ہو' یہ بات پورے طور پر درست نہیں ہے۔ اس نوع کے منافق بھی یقیناً پائے جاتے تھے لیکن ایسا معاملہ بہت کم تھا۔ قرآن مجید میں یہود کی ایک سازش کا ذکر ہے کہ جب ان کی ساری مخالفتوں کے علی الرغم اور تمام تر ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے باوجود مدینے میں اسلام کی جڑیں گہری ہوتی چلی گئیں اور نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ میں تمکن عطا فرما دیا تو انہوں نے اسلام کی قوت کو کمزور کرنے کے لیے ایک تدبیر سوچی۔ انہوں نے دیکھا کہ اسلام کی یہ ساکھ عرب معاشرے میں قائم ہو چکی ہے کہ جو شخص ایک بار ایمان لے آتا ہے وہ واپس نہیں پھرتا' چاہے ایمان قبول کرنے کے نتیجے میں اسے کتنی ہی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں اور کیسی ہی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ اس ساکھ کو ختم کرنے کے لیے انہوں نے یہ سازش تیار کی کہ صبح کے وقت ایمان لانے کا اعلان کرو اور شام کو انکار کر دو اور مرتد ہو جاؤ' اپنے سابق دین میں واپسی کا اعلان کر دو۔ اس طرح اُمید کی جا سکتی ہے کہ کچھ اور لوگ بھی لوٹ آئیں' اپنے آبائی دین کی طرف پلٹ آئیں۔ عام لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ آخر یہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے' اندر جا کر انہوں نے ضرور کوئی ایسی غیر

متوقع بات دیکھی ہوگی جس سے بدک کر یہ لوگ واپس لوٹ آئے' ممکن ہے جس اُمید میں یہ اسلام میں گئے تھے اس کے برعکس کوئی صورت وہاں نظر نہ آئی ہو کہ انہیں لوٹنا پڑا!..... ایمان کی ساکھ کو ختم کرنے کے لیے یہود نے یہ تدبیر اختیار کی۔ اب ظاہر بات ہے کہ اس کیفیت کے ساتھ جو شخص بھی اسلام کے دائرے میں داخل ہوا اس نے اگرچہ کلمۂ شہادت زبان سے ادا کیا ہوگا لیکن اس کا یہ داخلہ ابتداء ہی سے دھوکے کے تحت ہے' ایمان کی کوئی رَمق اسے کسی ایک لمحے کے لیے بھی حاصل نہیں ہوئی۔ ایسے کسی شخص نے ایک آدھا دن یا چند دن اگر اس قانونی اسلام کی کیفیت میں بسر کیے تو یقیناً ایک خالص منافق کی حیثیت سے بسر کیے ہیں۔

اس نوع کا معاملہ بعد میں بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص مسلمانوں میں جاسوس کی حیثیت سے شامل ہونے کے لیے اسی قسم کے کسی انداز میں اسلام میں داخل ہو' اور کلمۂ شہادت زبان سے ادا کرے تو ایمان سے یکسر محروم ہونے کے باوجود بھی قانونی طور پر وہ مسلمان سمجھا جائے گا۔ اور ایسا شخص تو ظاہر بات ہے کہ شعائرِ دینی کا احترام بھی عام مسلمان سے زیادہ کرے گا' اپنے آپ کو مسلمان منوانے کے لیے وہ نمازیں بھی پڑھے گا' روزے بھی رکھے گا' لیکن اس شخص کے قلب کی کیفیت کے بارے میں ہر شخص جانتا ہے کہ ایک لحظہ کے لیے بھی اسے کبھی ایمان کی روشنی نصیب نہیں ہوئی۔ تو اگرچہ اس نوع کا نفاق بھی دورِ نبویؐ میں موجود تھا لیکن اکثر و بیشتر جس قسم کے نفاق کا ذکر ہمیں قرآن مجید میں ملتا ہے اس کی نوعیت اس سے مختلف تھی۔''

(مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب' درس 19)

''جو کوئی اللہ کی پناہ میں آجائے' اللہ کا دامن مضبوطی سے تھام لے اُسے تو ضرور صراطِ مستقیم کی ہدایت ملے گی اور وہ ضلالت و گمراہی کے خطرات سے محفوظ ہو جائے گا۔ اللہ کا دامن واقعتاً محفوظ پناہ گاہ ہے' اور جو کوئی اس کے ساتھ چمٹ جاتا ہے وہ گمراہی کی ٹھوکروں سے محفوظ ہو جاتا ہے اور جادۂ مستقیم پر گامزن ہو جاتا ہے۔''

(میثاق مارچ 2009ء)

''حضرت عثمانؓ کی خصوصی فضیلت

ترجمان وحی جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے حضرت عثمانؓ کے بے شمار فضائل ومناقب مروی ہیں۔ان کے علاوہ سیرت عثمانیؓ کے متعدد واقعات آنجنابؓ کی فضیلتوں پر دلالت کرتے ہیں۔ان میں سے ایک خصوصی فضیلت یہ ہے کہ دو مواقع پر حضرت عثمانؓ کی عدم موجودگی کے باوجود حضورؐ نے گویا انؓ کو موجود قرار دیا۔پہلا موقع غزوۂ بدر کا ہے۔آنجنابؓ کی اہلیہ اور نبی اکرمؐ کی لخت جگر حضرت رقیہؓ کافی علیل تھیں' اس لئے ان کی تیمارداری کے لئے حضورؐ نے آنجنابؓ کو مدینہ میں چھوڑ دیا تھا اور انہیں اس لشکر میں شامل نہیں فرمایا تھا جو اولاً تو ابوسفیان کے تجارتی قافلہ کا راستہ روکنے کے لئے نکلا تھا' لیکن بالآخر غزوۂ بدر پر منتج ہوا تھا۔نبی اکرمؐ نے حضرت عثمانؓ کو بدر کے مال غنیمت میں سے وہی حصہ مرحمت فرمایا جو دوسرے بدری صحابہؓ کو مرحمت کیا گیا تھا۔گویا حضورؐ نے آپؓ کو مجازی طور پر اس غزوہ میں شریک قرار دیا جبکہ حقیقی طور پر وہ اس میں شریک نہیں تھے۔اس طرح کا دوسرا موقع حدیبیہ کے مقام پر پیش آیا۔حضرت عثمانؓ چونکہ وہاں موجود نہیں تھے' لہٰذا نبی اکرمؐ نے خود ہی اپنا ایک دست مبارک دوسرے دست مبارک کے اوپر رکھ کر ارشاد فرمایا کہ ''یہ عثمانؓ کا ہاتھ ہے اور یہ عثمانؓ کی طرف سے بیعت ہے''۔یہ درحقیقت حضرت عثمانؓ کے فضائل میں بہت بلند مقام ہے اور یہ بہت بڑی سعادت ہے جو اس روز انؓ کو حاصل ہوئی۔ پھر یہ کہ نبی اکرمؐ نے خون عثمانؓ کے قصاص کیلئے حدیبیہ کے مقام پر موجود تمام صحابہ کرامؓ سے جو بیعت لی یہ بھی انتہائی اعلیٰ مرتبہ ہے جو حضرت عثمان غنیؓ کو حاصل ہوا۔یہ وہ بیعت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا مندی اور خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے۔اس طرح بیعت رضوان کا یہ عظیم الشان واقعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام قرآن مجید میں ہمیشہ ہمیش کیلئے محفوظ فرما دیا ہے۔''

قرآن حکیم کی روشنی میں اخلاقیات کی فلسفیانہ اساس

''علم اخلاق یا اخلاقیات کے ذیل میں قرآن حکیم کی اہم ترین تعلیم جو اخلاقیات کی فلسفیانہ اساس بنتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے نفس میں اللہ تعالیٰ نے نیکی و بدی کا شعور الہامی طور پر ودیعت کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آج اپنی گفتگو کا آغاز سورۃ الشمس کی اِن آیات سے کیا ہے: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷﴾ اور نفسِ انسانی کی قسم اور جیسا کچھ اللہ نے اس کو بنایا' سنوارا' اس کی نوک پلک درست کی۔ ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸﴾ اور الہامی طور پر اس میں ودیعت کر دیا فجور اور تقویٰ کا علم' نیکی اور بدی کا شعور' خیر اور شر کا امتیاز' اِثم و برّ کے مابین تمیز۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں نیکی اور بدی کے لیے خیر اور شر کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں' اِثم و برّ کے الفاظ بھی آئے ہیں' لیکن جامع ترین اصطلاح ہے ''معروف'' اور ''منکر''۔ معروف کے لفظی معنی ہیں جو شے جانی پہچانی ہے' جبکہ منکر کہتے ہیں اُس شے کو جس کے بارے میں اجنبیت محسوس کی جائے' جس کو پہچانا نہ جا رہا ہو۔ اس اعتبار سے قرآن مجید نیکی اور بدی کے بارے میں یہ بنیادی تصور سامنے لاتا ہے۔ میں یہاں نفسِ انسانی کی اصطلاح استعمال کر رہا ہوں' کیونکہ آیاتِ مبارکہ میں ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷﴾ آیا ہے۔ نفسِ انسانی میں جو بھی ارتقائی عمل ہوا ہے اس کے نتیجے میں حیوانات کے مقابلے میں ایک بالکل نئی استعداد اور صلاحیت پیدا ہوئی ہے اور وہ ہے خیر اور شر میں امتیاز کی صلاحیت۔ انسان اپنی اس فطرت کے اعتبار سے جانتا ہے کہ کیا خیر ہے اور کیا شر ہے؟ کیا نیکی ہے اور کیا بدی؟ ''خیر'' اس کے لیے معروف کے درجے میں ہے' جبکہ شر' برائی' بدی اور اِثم کو وہ منکر سمجھتا ہے۔ یہ درحقیقت خیر اور شر (good and evil) کے بنیادی تصورات ہیں جو پوری نوعِ انسانی کا مشترک اثاثہ ہیں' ان میں آپ کو کہیں کوئی فرق معلوم نہیں ہوگا۔ سچ بولنا ہر

معاشرے میں' ہر دور میں خیر قرار دیا گیا اور جھوٹ بولنا ہر معاشرے میں' ہر دور میں بدی قرار پایا۔ ایفائے عہد ہر دور میں' ہر معاشرے میں نیکی قرار پائی اور وعدہ خلافی ہر دور میں' ہر معاشرے میں ایک برائی سمجھی گئی۔

اس کا ذرا تقابل کریں دوسرے الفاظ کے ساتھ۔ ایک ہے شریعت کے احکام اور اوامر و نواہی کہ یہ فرض ہے' یہ واجب ہے اور یہ حرام ہے' اس کے قریب نہ پھٹکو۔ واضح رہے کہ یہ دوسری منزل ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کے لیے انسان کو وحی اور نبوت کی تعلیم کی ضرورت ہے۔ مثلاً شراب حرام ہے' اس کا معاملہ ایسا نہیں ہے کہ انسان طبعاً اس کا فیصلہ کر سکے' سؤر کا گوشت حرام ہے' اس کے بارے میں آج بھی لوگوں کو اشکال ہے کہ کیوں حرام ہے؟ یہ وہ چیزیں ہیں جو درحقیقت شریعت کے نقل پر مبنی ہیں۔ جو اللہ نے فرمایا اور جو اللہ کے رسول ﷺ نے ہم تک پہنچایا ہے ان احکام کی اطاعت ہمارے ذمے ہے' ان کی خلاف ورزی کو ہم معصیت قرار دیتے ہیں۔ جبکہ منکر کی اصطلاح اس سے وسیع تر مفہوم کی حامل ہے۔ یہ وہ پہلی منزل ہے جو اخلاقی اقدار (ethical values) پر مشتمل ہے۔ یہ اخلاقی اقدار پوری نوعِ انسانی کی مشترک متاع ہیں۔ ہر دور میں' تمام اقوام میں اور ہر علاقے میں ان کو مانا گیا ہے کہ یہ اچھائیاں ہیں' بھلائیاں ہیں' نیکیاں ہیں اور یہ برائیاں ہیں' یہ شر ہے اور یہ خیر ہے۔

اس اعتبار سے میں چاہتا ہوں کہ چند احادیث مبارکہ آپ کے سامنے رکھوں۔ بڑی پیاری حدیث ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں: ((اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَائَتْكَ سَيِّئَتُكَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ)) (۷) ''اگر تمہیں کوئی اچھا کام کر کے خوشی ہو اور کوئی برا کام کر کے تمہیں خود ملال ہو' تو تم مؤمن ہو''۔ یہ احساس گویا ایمان کی علامت ہے۔ معلوم ہوا کہ فطرت مسخ نہیں ہوئی' اس فطرت کے اندر خیر و شر کا امتیاز برقرار ہے۔ تبھی تو نیکی کر کے تمہیں مسرت ہوئی ہے' خوشی ہوئی ہے' اور کوئی کام اگر غلط ہو گیا ہے' کسی بدی کا ارتکاب ہو گیا ہے تو اس پر تمہیں خود گھٹن محسوس ہوئی ہے' تمہیں خود ضیق اور تنگی کا احساس ہوا ہے۔ یہ علامت ہے اس بات کی کہ فطرت اپنی صورت پر برقرار ہے' فطرت مسخ (pervert) نہیں ہوئی۔

اس سے بھی زیادہ حکیمانہ قول ہے محمد رسول اللہ ﷺ کا جو بہت ہی اہم فلسفیانہ حقیقت پر مشتمل ہے: ((وَالْإِثْمُ مَا حَاكَ فِي نَفْسِكَ وَكَرِهْتَ أَنْ يَطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ)) (۸) ''گناہ وہ ہے جو تمہارے سینے میں کھٹکے اور تم اسے ناپسند کرو کہ وہ کام لوگوں کے علم میں آئے''۔ جیسا کہ سورۃ القیامۃ میں ''نفس لوامہ'' کی قسم کھائی گئی ہے:

﴿لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ① وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ②﴾

''نہیں! میں قسم کھاتا ہوں روزِ قیامت کی۔ اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفس ملامت گر کی۔''

یہ وہ ضمیر ملامت گر ہے کہ اگر ہم سے کسی برائی کا صدور ہو جاتا ہے تو ہمیں اس کی بنا پر اندر ہی اندر کوئی شے ملامت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ انگریزی میں اسے یوں تعبیر کرتے ہیں: ''My conscious is biting me'' یعنی ''میرا ضمیر مجھے کچوکے دے رہا ہے''۔ درحقیقت یہ اسی آیت مبارکہ کی ترجمانی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ ایک ہے انسان کا انفرادی ضمیر (individual conscious) جس پر مذکورہ بالا حدیث میں آنجناب ﷺ کی جانب سے گویا اظہارِ اعتماد کیا گیا ہے۔ یہ ضمیر ایک زندہ حقیقت ہے اور یہ علامت ہے اس بات کی کہ فطرتِ انسانی اپنی صحت پر برقرار ہے۔ آپ کے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ میں یہ کام کر تو بیٹھا ہوں لیکن کسی کے علم میں نہیں آنا چاہیے۔ اس لیے کہ لوگ ملامت کریں گے، میرے بارے میں بری رائے قائم کریں گے۔ اسی طرح نوعِ انسانی کا ایک اجتماعی ضمیر (collective conscious) بھی ہے جس کا اثبات کیا جا رہا ہے۔ بہرحال احکامِ شریعت کے معاملے کو، جو ایک بلند تر منزل ہے، آج کی بحث سے خارج سمجھیے۔ لیکن جہاں تک انسانی اخلاقیات کا تعلق ہے تو ان چیزوں کے لیے انسان کسی تلقین یا تعلیم کا حاجت مند نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کی عطا ہے، یہ دولت اس کے پاس ہے۔ یہ پہچان، یہ فہم، یہ شعور، یہ امتیاز اس کے اندر ودیعت شدہ ہیں۔ لہٰذا صداقت و امانت ہو، ایفائے عہد ہو، صلہ رحمی ہو، خدمتِ خلق ہو، یہ وہ بنیادی اوصاف ہیں جو مجمع علیہ ہیں۔

ایک حدیث ملاحظہ کیجیے، حضرت انس رضی اللہ عنہ جو نو برس تک حضور ﷺ کے ذاتی خادم

کی حیثیت سے آپؐ کے ساتھ رہے ہیں' ان کی گواہی ہے کہ: قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِلَّا قَالَ : ((لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهٗ ' وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ)) (۹) ''شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہوگا کہ ہمیں اللہ کے رسول ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا ہو اور اس میں یہ الفاظ نہ وارد ہوئے ہوں: ''جس شخص کے اندر امانت داری کا وصف نہیں ہے اس کا کوئی ایمان نہیں اور جس میں ایفائے عہد کا مادہ نہیں اس کا کوئی دین نہیں''۔ امن' امانت اور ایمان کا قریبی رشتہ ہے اور لفظی طور پر بھی ان کا ایک ہی مادہ ہے۔ ایفائے عہد کا دین سے جو معنوی ربط ہے اس کو سمجھ لیجئے' کہ درحقیقت دین بھی تو بندے اور رب کے درمیان ایک عہد ہے۔ نماز میں ہم عہد کرتے ہیں: ﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ۝﴾ (سورۃ الفاتحہ) ''پروردگار! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے''۔ یہ ایک بڑا عہد ہے' جو شخص چھوٹے چھوٹے وعدے پورے نہ کرتا ہو وہ اتنا بڑا عہد' پوری زندگی کا عہد کیسے نبھائے گا؟ چنانچہ جس شخص میں امانت کا وصف نہیں اس میں ایمان نہیں' اور جس میں پاسِ عہد نہیں اس کا کوئی دین نہیں!!

اسی طرح خدمتِ خلق کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا یہ قول یاد کیجئے: ((خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَنْفَعُ النَّاسَ))(۱۰) ''لوگوں میں بہترین وہی ہیں جو لوگوں کو فائدہ پہنچائیں۔''

یہ جو بنیادی اخلاقیات ہیں' مثلاً صداقت' امانت' ایفائے عہد' صلہ رحمی' خدمتِ خلق' کمزوروں پر رحم' غریبوں کی امداد' یتیموں اور مسکینوں کی سرپرستی' یہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:

﴿اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُكَذِّبُ بِالدِّیْنِ ① فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ② وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ③﴾ (الماعون)

''کیا دیکھا آپ نے اُس شخص کو جو جھٹلاتا ہے بدلے کو؟ پس وہی ہے جو دھکے دیتا ہے یتیم کو' اور نہیں ترغیب دیتا مسکین کو کھانا کھلانے کی۔''

یہ وہ چیزیں ہیں جو فطرتِ انسانی کی جانی پہچانی ہیں' معروفات ہیں۔ ہر انسان جانتا ہے کہ یہ نیکی ہے اور اس کی ضد شر ہے۔''

(میثاق' اپریل ۲۰۱۰ء)

''قرآن حکیم کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ قرآن حکیم اس طرح کی کتاب نہیں ہے جیسی عام طور پر انسانی تصنیف ہوتی ہے۔ انسانی تصنیف میں ابواب ہوتے ہیں۔ پھر ہر باب کا ایک عنوان ہوتا ہے جو اس باب کے مضامین کی نشاندہی کرتا ہے۔ پھر وہ باب ذیلی عنوانات یا فصول میں منقسم ہوتا ہے اور ہر فصل میں بحث کا ایک حصہ مکمل ہو جاتا ہے' جبکہ قرآن مجید درحقیقت اس نوع کی کتاب نہیں ہے' بلکہ اسے ہم خطباتِ الٰہیہ کے مجموعے سے تعبیر کر سکتے ہیں اور یہ تعبیر غلط نہیں ہوگی۔ نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران مختلف مواقع اور مراحل پر یہ خطباتِ الٰہیہ نازل ہوتے رہے اور حضور ﷺ کی انقلابی دعوتِ توحید کو جن حالات' موانعات' اعتراضات اور مخالفتوں سے سابقہ پیش آتا تھا' ان کی مناسبت سے حضور ﷺ کو ہدایات دی جاتی رہیں اور متعلقہ بحثیں نازل ہوتی رہیں۔ ان ہی کے ضمن میں وہ دائمی و ابدی رہنما اصول بھی دے دیے گئے جن پر اللہ تعالیٰ اس دنیا میں انسان کی اجتماعی زندگی کو استوار دیکھنا چاہتے ہیں' لیکن ان کے لیے قرآن حکیم میں غور و فکر اور تدبر لازم ہے۔ ان کو معلوم اور اخذ کرنے کے لیے آیات کے بین السطور جھانکنا پڑتا ہے اور سورتوں کے مضامین کا تجزیہ کر کے یہ چیز معین کرنی پڑتی ہے کہ یہاں کون سے دائمی اور ابدی رہنما اصول ہمیں مل رہے ہیں۔''

(کتاب: مسلمانوں کی سیاسی و ملی زندگی کے رہنما اصول)

ضبطِ نفس اور ستر و حجاب کے احکامات کی پابندی

''ایک اور چیز جو خاندان کے ادارے کو مستحکم کرنے والی' اس میں امن و سکون پیدا کرنے والی اور ہماری معاشرتی زندگی کی ایک اہم اساس ہے وہ یہ ہے کہ معاشرے میں ضبطِ جنس اور ضبطِ شہوت (sexual discipline) ہو' جنسی انارکی نہ ہو۔ انسان اپنی اس فطری ضرورت (urge) کو ایک قاعدہ و قانون اور حلال و حرام کے حدود و قیود کے اندر پورا کرے۔ مجھے فرائڈ (اہلِ مغرب جسے نفسیات کا ''امام'' مانتے ہیں) کی اس بات سے بہت حد تک اتفاق ہے کہ انسان کے اندر سب سے طاقتور (potent) جذبہ محرکہ شہوت یعنی جنسی جذبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تخلیق کے مطابق یہ بے حد ضروری تھا' کیونکہ اگر یہ جذبہ اتنا طاقتور نہ ہوتا تو کون شادی کا کھکھیڑ مول لیتا اور انسان کی نسل کیسے چلتی؟ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو آباد رکھنا ہے' نسلِ انسانی کو ابھی اور بڑھانا ہے' لہٰذا جنسِ مخالف میں اس قدر کشش اور طلب پیدا کی ہے کہ انسان یہ جانتے ہوئے بھی کہ شادی کے بعد اتنی ذمہ داریاں ہوں گی' خاندان کا بوجھ اٹھانا ہوگا' اولاد کو پالنا پوسنا ہوگا' یہ ساری ذمہ داریاں جھیلتا ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ جس شے میں جتنی زیادہ کشش اور شدت ہوتی ہے اتنا ہی اس میں کج روی اور بگاڑ کا زیادہ امکان ہوتا ہے' جیسے پولیٹکل سائنس کا مسلمہ اصول (axiom) ہے:

Authority tends to corrupt and absolute authority corrupts absolutely.

چنانچہ جنسی جذبے کی یہ شدت جتنی زیادہ ہے تو اس کے بگاڑ کا بھی اتنا ہی زیادہ امکان موجود ہے۔ یوں سمجھئے کہ گویا انسان کے اندر بارود ہے' لہٰذا اس پر بڑی قدغنوں' بڑی پابندیوں اور بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہ پابندیاں اور یہ اہتمام ہمارے دین کی طرف سے ہے۔ خطاب کے آغاز میں میں نے سورۃ المومنون کی ابتدائی آیات کی

تلاوت کی تھی۔ان آیات میں اہل ایمان کے فلاح کے لوازمات کے شرائط میں ایک شرط یہ بھی بیان کی گئی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝﴾

''وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔سوائے اپنی بیویوں اوران عورتوں کے جو ان کی ملک یمین ہوں' سوان پر کوئی ملامت نہیں ہے۔''

آپ غور کیجیے کہ اس میں کس قدر توازن ہے۔ایک طرف یہ تصور دیا گیا ہے کہ جنسی شہوت کو بری نہ سمجھو' یہ کوئی برائی (evil) نہیں ہے' یہ تو فطرت کا داعیہ اور فطرت کا تقاضا ہے جو اللہ نے انسان کی فطرت میں اپنی حکمت کے تحت رکھا ہے۔سورۂ آل عمران میں فرمایا:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ.....﴾ (آل عمران:١٤)

''مزین کر دی گئی ہے لوگوں کے لیے مرغوباتِ دنیا کی محبت جیسے عورتیں اور بیٹے.....''

یہاں سب سے پہلے ''حبّ الشهوات'' کا ذکر کر کے یہ واضح کر دیا گیا کہ جنسی خواہش کوئی برائی نہیں ہے۔اوّل تو جو دین محمد ﷺ لائے وہ انتہائی دین فطرت ہے' پھر آپ کی زندگی اتنی کھلی کتاب ہے کہ آپؐ نے ہر چیز کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔آپؐ نے فرمایا:

((حُبِّبَ اِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا: اَلنِّسَاءُ وَالطِّيْبُ' وَجُعِلَ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ))(١)

''مجھے دنیا میں سے عورتیں اور خوشبو محبوب ہے' جبکہ نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔''

حضور ﷺ نے خود بھی شادیاں کیں اور اُمت کو بھی اس کا حکم دیا۔فرمایا:

((اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ)) (٢) ''نکاح میری سنت ہے۔''

مزید فرمایا:

((فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ)) (٣)

''جس کو میری سنت پسند نہیں اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔''

دوسری طرف اسلام نے اس جذبے پر شدید قدغنیں عائد کی ہیں۔ اس لیے کہ اگر اس جذبے میں کج روی اور آوارگی آ گئی تو پوری انسانی شخصیت اور سیرت و کردار کی متاع اس سوراخ سے بہہ نکلے گی۔

میں ان لوگوں کا مرثیہ کہا کرتا ہوں جو ایک طرف تو مغرب کے فلاسفہ کی عظمت کے قائل ہیں اور دوسری طرف جب پردے اور ستر کا بیان آتا ہے تو وہ ایسے ''معصوم'' بن جاتے ہیں کہ جنسی جذبہ شاید صرف مولویوں ہی کے اندر ہوتا ہے' ان کے علاوہ کسی اور کے اندر اس جذبے کا کوئی احساس اور حس سرے سے ہوتی ہی نہیں۔ یہ سراسر ان کی بددیانتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم اس رسول ﷺ کے پیروکار ہیں جنہوں نے خود یہ کہا ہے کہ مجھے تو دنیا میں یہ دو چیزیں خوشبو اور عورت پسند ہیں' اور ہم اس قرآن مجید کو ماننے والے ہیں جس میں سورۃ المؤمنون کے بعد سورۃ المعارج میں دوبارہ بعینہٖ انہی الفاظ کے ساتھ یہ آیات وارد ہوئی ہیں:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝۲۹ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝۳۰﴾

اس کے بعد دونوں مقامات پر یہ الفاظ آئے ہیں:

﴿فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝۳۱﴾

''البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں۔''

یعنی جو اس جذبے میں حد سے بڑھیں گے اور اپنی خواہشات حرام طریقوں سے پوری کریں گے تو وہ زیادتی کرنے والے اور حدود سے تجاوز کرنے والے ہیں۔''

(میثاق' ستمبر ۲۰۱۰ء)

نظریۂ پاکستان سے انحراف کا نتیجہ: نفاق

تحریک پاکستان کے دوران ہم نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا تھا کہ اے پروردگار! اگر تو ہمیں آزادی کی نعمت عطا کر دے تو ہم تیرے دین کا بول بالا کریں گے۔ ہمارے قائد نے دس برس تک اسلام کی قوالی گائی، اسلام کے راگ الاپے۔ لیکن ہم نے ان کے رخصت ہونے کے بعد اس وعدے سے انحراف کیا اور اس انحراف کا نتیجہ نفاق کی صورت میں نکلا ہے۔ اِس نفاق کی تین صورتیں ہیں:

پہلا نفاق ''نفاق باہمی'' ہے۔ ہم ایک قوم ہوتے تھے لیکن اب قومیتوں میں تحلیل ہو چکے ہیں۔ اب تو عصبیتیں ہی عصبیتیں ہیں، صوبائی عصبیتیں ہیں، علاقائی عصبیتیں ہیں، لسانی عصبیتیں ہیں۔ پھر مذہبی اختلافات ہیں۔

دوسرا نفاق ''عملی نفاق'' ہے کہ ہمارے اخلاق کا دیوالیہ نکل گیا ہے۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں وارد حدیث نبویؐ ہے کہ ''منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بولے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے، جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔'' اب ان علامات کے حوالے سے اپنے معاشرے کا جائزہ لیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ جو جتنا بڑا ہے اتنا ہی جھوٹا ہے، جو جتنا بڑا ہے اتنا ہی وعدہ خلاف اور اتنا ہی بڑا خائن ہے۔ یہاں اربوں اور کھربوں کے غبن ہوئے ہیں، ہمارے اعلیٰ افسروں نے ڈاکو بن کر اس ملک کو لوٹا ہے۔

تیسرا اور سب سے بڑا نفاق ہمارے ہاں دستور کا نفاق ہے۔ کسی ملک میں اہم ترین دستاویز اس کا دستور ہوتا ہے۔ پاکستان کا دستور منافقت کا پلندا ہے۔ منافق وہی ہوتا ہے جو ظاہر میں مسلمان ہو اور باطن میں کافر! اور پاکستان کے دستور کا معاملہ بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کے لیے قرارداد مقاصد بھی کافی تھی، اگر اس میں ایک جملے کا اضافہ کر دیا جاتا کہ یہ بقیہ تمام دستور پر حاوی ہوگی۔ جسٹس نسیم حسن شاہ نے اس قرارداد مقاصد کو رد کر دیا کہ اس آرٹیکل کا دوسرے آرٹیکلز کے اوپر کوئی اثر نہیں ہو سکتا اور بات ختم ہوگئی۔

سالمیتِ پاکستان کے ناگزیر لوازم

ملک وملت کے استحکام ہی نہیں، بقا تک کے لیے حسبِ ذیل چیزیں ناگزیر اور لازمی ہیں:

☆ ایک ایسا طاقتور انسانی جذبہ جو جملہ حیوانی جبلّتوں پر غالب آ جائے اور قوم کے افراد میں کسی مقصد کے لیے تن من دھن لگا دینے حتیٰ کہ جان تک قربان کر دینے کا مضبوط ارادہ اور قوی داعیہ پیدا کر دے۔

☆ ایک ایسا ہمہ گیر نظریہ جو افرادِ قوم کو ایک ایسے مضبوط ذہنی وفکری رشتے میں منسلک کر کے بنیانِ مرصوص بنا دے جو رنگ، نسل، زبان اور زمین کے تمام رشتوں پر حاوی ہو جائے اور اس طرح قومی یک جہتی اور ہم آہنگی کا ضامن بن جائے!

☆ عام انسانی سطح پر اخلاق کی تعمیرِ نو جو صداقت، امانت، دیانت اور ایفاءِ عہد کی اساسات کو از سرِ نو مضبوط کر دے اور قومی وملی زندگی کو رشوت، خیانت، ملاوٹ، جھوٹ، فریب، ناانصافی، جانبداری، ناجائز اقربا پروری اور وعدہ خلافی ایسی تباہ کن بیماریوں سے پاک کر دے۔

☆ ایک ایسا نظامِ عدلِ اجتماعی (System of Social Justice) جو مرد اور عورت، فرد اور ریاست، اور سرمایہ اور محنت کے مابین عدل واعتدال اور قسط وانصاف اور فی الجملہ حقوق وفرائض کا صحیح وحسین توازن پیدا کر دے!

تحریک پاکستان کے تاریخی اور واقعاتی پس منظر، اور پاکستان میں بسنے والوں کی عظیم اکثریت کی فکری وجذباتی ساخت، دونوں کے اعتبار سے یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس ملک میں یہ تمام تقاضے صرف اور صرف دین ومذہب کے ذریعے اسلام کے حوالے اور ناتے سے پورے کیے جا سکتے ہیں۔

(استحکام پاکستان)

جزوی نہیں، کلی اطاعت مطلوب ہے

عبادت اور اطاعت درحقیقت ہمہ تن، ہمہ وقت، ہمہ وجود درکار ہے۔ جزوی (Partial) فرمانبرداری کو اطاعت نہیں کہا جا سکتا۔ اللہ کی عبادت تب ہی ہوگی جب اللہ کے تمام احکام مانے جائیں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے کچھ احکام مانے جائیں اور کچھ کو چھوڑ دیا جائے تو تجزیہ کرنے پر معلوم ہوگا کہ جن احکام کی تعمیل کی گئی وہ ہمارے نفس کو پسند تھے جبکہ نفس پر بوجھ بننے والے احکام نظرانداز کر دیئے گئے۔ لہٰذا دونوں حالتوں میں ہی درحقیقت نفس کی اطاعت کی گئی، اللہ کی نہیں۔

سورۃ البقرہ میں تمام انسانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا، (ترجمہ:) ''عبادت کرو اپنے اس رب کی جس نے تمہیں بھی پیدا کیا اور تم سے پہلوں کو بھی پیدا کیا تاکہ تم بچ جاؤ۔'' یہاں ''تم سے پہلوں کو بھی پیدا کیا'' کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ دنیا میں سب سے بڑی گمراہی یہی رہی کہ فلاح چیز ہمارے آباء واجداد سے چلی آ رہی ہے۔ تو کیا آباواجداد گمراہ نہیں ہو سکتے تھے! یہ کوئی دلیل نہیں ہے۔ حتمی چیز صرف اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت ہے۔ اسی کو اختیار کر کے دنیا میں اللہ کی نافرمانی سے جبکہ آخرت میں اللہ کے عذاب سے بچا جا سکتا ہے۔ اس بات کو مثبت طور پر سورۃ البقرۃ کی آیت 208 میں کہا گیا: (ترجمہ:) ''اے ایمان کے دعویدارو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔'' یہاں 33 فیصد سے کامیابی نہیں ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ کی سو فیصد اطاعت درکار ہے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں منفی انداز اختیار کرتے ہوئے سورۃ البقرۃ کی آیت 85 میں شدید ترین وعید آئی ہے۔

''کیا تم ہماری اس کتاب کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک حصے کو نہیں مانتے!''

مثلاً نماز پڑھتے ہو، لیکن سود سے باز نہیں رہتے جس کے بارے میں اللہ نے کہا ہے کہ سودی لین دین میں ملوث فرد کے خلاف میری اور میرے رسولؐ کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔ یہ تضاد اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ آگے فرمایا:

''تو نہیں ہے سزا ان کی جو یہ حرکت کریں تم میں سے سوائے اس کے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل وخوار کر دیئے جائیں (جو کہ آج ہم ہیں) اور قیامت کے دن وہ شدید ترین عذاب میں جھونکے جائیں'' لہٰذا زبان سے اسلام کا دعویٰ کرنے والے لیکن عملی طور پر اللہ کے احکام میں سے کچھ کو ماننے والے اور کچھ کو پاؤں تلے روند دینے والے شدید ترین عذاب کے مستحق ہوں گے۔

(''بصائر منتخب اخباری کالموں کا مجموعہ'' سے ماخوذ)

اسلام کے عالمی غلبہ میں پاکستان کا مقام و کردار

پاکستان کا معجزانہ قیام، قائداعظم کی غیر معمولی قیادت اور پاکستان کی تا حال خصوصی حفاظت و صیانت کی صرف ایک توجیہہ ممکن ہے اور وہ یہ کہ پاکستان اسلام کے عالمی غلبے کی خدائی تدبیر کے سلسلے کی اہم کڑی ہے!

اس قضیے (Proposition) یا نظریے (Theorum) کے دو اجزاء ہیں: ایک یہ کہ بالآخر اسلام پوری دنیا پر غالب آ کر رہے گا اور پورے کرۂ ارضی پر اسلام کی حکمرانی قائم ہو کر رہے گی! اور دوسرا یہ کہ اسلام کے اِس عالمی غلبے (Global Domination) میں ایک اہم اور فیصلہ کن کردار (Crucial Role) پاکستان کو ادا کرنا ہے اور یہ گویا پاکستان کی تقدیر (Destiny) ہے!

ان میں سے جہاں تک پہلے جزو کا تعلق ہے، وہ بالکل یقینی اور اٹل ہے اس لیے کہ وہ قرآن حکیم سے بھی دلالۃً (by inference) ثابت ہے اور متعدد احادیثِ صحیحہ میں تو صراحتاً مذکور ہے اور اس کے ضمن میں گمان اور قیاس کا معاملہ صرف اِس مسئلے تک محدود ہے کہ ایسا کب ہوگا؟ البتہ جہاں تک دوسرے جزو کا تعلق ہے تو وہ سراسر یا قیاس و گمان کا معاملہ ہے یا ذوق و وجدان کا۔ چنانچہ اِس کے ضمن میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ تاہم اِن سطور کے عاجز و ناچیز راقم کا گمانِ غالب یہی ہے کہ اسلام کے عالمی غلبے کا نقطۂ آغاز یہی سرزمین بنے گی جس کا نام 'پاکستان' ہے۔ گویا راقم کو علامہ اقبال کے اس شعر سے اتفاق ہے کہ ؎

میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے!

(استحکام پاکستان)

قرابت دار کے ساتھ حسن سلوک

''معاشرے کی تنظیم میں خاندان کے ادارے سے آگے بڑھ کر قرابت دار کے ساتھ حسن سلوک کا بھی ذکر ہے۔ خاندان کے ادارے کو مستحکم کرنے کے بعد اب انسان کے حسن سلوک کا دائرہ کار درجہ بدرجہ آگے بڑھنا چاہیے اور ''الاقرب فالاقرب'' کے اصول کے مطابق جو سب سے قریب ہے وہ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ حسن سلوک کا مستحق ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاٰتِ ذَى الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿٢٦﴾﴾

(بنی اسراء یل)

''اور رشتے دار کو اس کا حق ادا کرو اور محتاج اور مسافر کو بھی (اپنے مال میں سے دو) اور اپنی دولت کو نمود و نمائش کے لیے نہ اڑاؤ۔''

قرآن مجید کے اندر متعدد بار قرابت داروں کا ذکر ہے: ﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى﴾ (البقرۃ:۱۷۷)۔ اور: ﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِى الْقُرْبٰى﴾ (النساء:۳۶)

قرابت داروں کے بعد حسن سلوک کے دائرہ میں معاشرے کے محروم افراد کو بھی شامل کرنا ہوگا' جن میں یتیم' مساکین' مسافر' غرض سبھی لوگ شامل ہوں گے۔ قرابت دار کے بعد یتیم اور مساکین کا نمبر آتا ہے: ﴿وَّبِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ﴾ ''اور (احسان کرو) رشتہ داروں' یتیموں اور مساکین پر''۔ اس سے آگے بڑھیے تو پڑوس کا نمبر آتا ہے: ﴿وَالْجَارِ ذِى الْقُرْبٰى﴾ ''اور پڑوسی جو قرابت دار بھی ہو'' اگر پڑوسی قرابت دار بھی ہو تو یوں سمجھئے کہ سونے پر سہاگا ہے کہ اس کے دو حقوق جمع ہو گئے۔ ﴿وَالْجَارِ الْجُنُبِ﴾ ''اور پڑوسی چاہے اجنبی ہو''۔ یعنی وہ آپ کے قبیلے کا نہ ہو تب بھی پڑوسی ہونے کے اعتبار سے وہ آپ کے حسن سلوک کا مستحق ہے۔ ﴿وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ﴾ ''اور آس پاس کے بیٹھنے والے' عارضی طور پر آپ کی برابر کی نشست پر بیٹھا ہوا بھی آپ کا پڑوسی ہے اور وہ آپ کے

حسن سلوک کا مستحق ہے۔ اس طرح آپ بس یا ریل میں سفر کر رہے ہیں تو آپ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا شخص آپ کا پڑوسی ہے اور آپ کا فرض ہے کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ ﴿وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾ ''اور پھر مسافر''۔ ﴿وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ ''اور پھر وہ جو تمہاری ملک یمین میں ہوں''۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۝﴾ (النساء) ''یقیناً اللہ تعالیٰ کو متکبر اور اکڑنے والے لوگ بالکل پسند نہیں ہیں۔''

آخر میں ایک حدیث کا حوالہ دے رہا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ، وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ، وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ)) قِيْلَ وَمَنْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((اَلَّذِيْ لَا يَاْمَنُ جَارُهٗ بَوَايِقَهٗ))(۱)

حضور ﷺ نے تین بار یہ بات فرمائی کہ ''خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہے!'' یعنی اسے ایمان کی حقیقت حاصل نہیں۔ یا ہمارے ہاں جو احتیاط کی وجہ سے ترجمہ کیا جاتا ہے کہ اس کو ایمان کامل حاصل نہیں ہے۔ اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ جب ہم یہ ترجمہ کرتے ہیں تو اس حدیث میں جو زور اور تاثیر ہے وہ ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ بس یہ ذہن میں رکھیے کہ قانوناً وہ شخص کافر نہیں ہوتا بلکہ مسلمان رہتا ہے' لیکن ایمان کی کوئی لطیف حقیقت ہے جس سے وہ محروم ہے۔ ((وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ)) ''خدا کی قسم وہ مؤمن نہیں!'' پوچھا گیا حضور کون؟ آپؐ نے فرمایا: ''وہ شخص کہ جس کی ایذا رسانی سے اس کا پڑوسی چین میں نہیں ہے۔''

(میثاق' ستمبر ۲۰۱۰ء)

''قرآن حکیم سائنس کی کتاب بھی نہیں ہے۔ اصلاً یہ کتابِ ہدایت ہے' هُدًى لِّلنَّاسِ ہے' لیکن یہ خالقِ کائنات کا کلام ہے' لہٰذا اس میں سائنسی مظاہر (scientific phenomena) کی طرف جابجا اشارے کیے گئے ہیں۔ کوئی اشارہ جیالوجی سے متعلق ہے' کوئی چیز علم فلکیات کے میدان کی ہے' کوئی چیز بیالوجی سے تعلق رکھتی ہے تو کوئی چیز فزیالوجی اور کوئی ایمبریالوجی (جنینیات) کے دائرے کی ہے۔''

(میثاق دسمبر 2007ء)

مغربی تہذیب کا المیہ

''خدا فراموشی اور ہدایت ربانی سے محرومی کے باعث مغربی تہذیب جس کرب اور المیہ سے دوچار ہے' ہماری عظیم اکثریت کو اس کا پتا ہی نہیں۔ ہم ان ممالک کی ظاہری شان وشوکت اور جاہ وحشمت دیکھ کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ دنیا میں ان سے زیادہ خوش نصیب کوئی نہیں۔ ''دُور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں'' کے مصداق ان کے ٹھاٹھ باٹھ اور تمدنی ترقی سے ہم اتنے مرعوب ہیں کہ ہمیں ان کے آلام ومصائب کا اندازہ ہی نہیں ہوتا اور ہم اس مغالطے میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہاں ہر طرح سکھ' چین اور سکون واطمینان ہے۔ حالانکہ اس خدا نا آشنا تہذیب کا قریبی مشاہدہ کرنے والے جانتے ہیں کہ ان خدا فراموش ممالک میں خاندانی نظام درہم برہم ہو چکا ہے' جس کی وجہ سے پورا معاشرہ انتہائی کرب اور دکھ میں مبتلا ہے۔ وہاں آزادانہ شہوت رانی کا دور دورہ ہے' لہٰذا شادی بیاہ کا بکھیڑا کون مول لے۔ جن لوگوں میں سابقہ روایات کا کچھ پاس ہے' وہ شادی کا بندھن اختیار کرتے ہیں' تو اُن میں سے اکثر کا حال یہ ہے کہ شوہر بیوی سے نالاں اور اس کی عصمت وعفت کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا ہے تو بیوی شوہر سے بیزار اور اس کے باوفا ہونے کے بارے میں شکوک میں مبتلا۔ مزید برآں اوّل تو مانع حمل تدابیر سے اولاد کے جھمیلے سے بچاؤ ہوتا ہے' لیکن کسی کو اگر اولاد کی چاہت ہوئی بھی تو اکثریت کے بچے نرسریوں (Nurseries) میں پرورش پاتے ہیں۔ لہٰذا محبت مادری اور شفقت پدری سے یکسر محروم اس اولاد کے دل والدین کی محبت اور احترام سے بالکل خالی ہوتے ہیں۔ والدین جب بوڑھے ہو جاتے ہیں تو ان کے دلوں میں اولاد کی محبت کا خوابیدہ جذبہ بیدار ہوتا ہے' لیکن اولاد کا حال یہ ہوتا ہے کہ ماں باپ کی خدمت تو کجا' ان سے ملنے اور ان کے ساتھ کچھ لمحات گزارنے کے لیے بھی ان کے پاس فرصت اور وقت ہی نہیں۔ بوڑھے ماں باپ اولاد کی شکل دیکھنے کے لیے سالوں ترستے رہتے ہیں۔ وہاں ایسے بوڑھے مردوں اور عورتوں کے لیے جن کی بیویاں یا شوہر وفات پا چکے ہوں اور جو تنہا رہ گئے ہوں' ہاسٹل قائم ہیں تاکہ وہ دوسرے بوڑھوں اور بوڑھیوں کی معیت میں تنہائی کے احساس کو مٹا سکیں۔ یہ ہے خاندانی نظام کے برہم ہونے کی نقد سزا جو مغربی معاشرہ بھگت رہا ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں بھی جو لوگ مغربی تہذیب کے اندھے مقلد ہیں اور اس کی تمدنی ترقی سے جن کی نگاہیں خیرہ ہو چکی ہیں' جن کے ذہن و قلب اس خدا ناآشنا تہذیب سے مرعوب ہیں' پھر یہ لوگ مسلمان ہوتے ہوئے بھی اپنے دین کی تعلیمات سے کوسوں دور ہیں وہ بھی اسی المیہ اور کرب میں مبتلا ہیں کہ جس اولاد کو بڑے لاڈ پیار سے پالا پوسا تھا' اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی' جس کے لیے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کیا تھا' وہ اولاد ان کے حقوق سے قطعاً ناآشنا ہوتی ہے۔ ان میں سے اکثریت کو مکافاتِ عمل کے اسی قاعدے سے سابقہ پیش آتا ہے کہ جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے۔ یہ لوگ اولاد کی شکل دیکھنے کو ترستے ہیں اور یہ حسرت لیے ہوئے دنیا سے رخصت ہوتے ہیں کہ ان کی اولاد بڑھاپے میں ان کے پاس بیٹھے' ان کو کچھ وقت دے اور ان کی دل جوئی کرے۔ جب ماں باپ کے ساتھ یہ ناروا رویہ اور سلوک ہو تو بھلا قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق کی ادائیگی کا کیا سوال! یہ ہے ہدایت ربانی کو پس پشت ڈالنے کی نقد سزا جو دنیا ہی میں بھگتنی پڑتی ہے۔ آخرت میں دائمی طور پر ایسے لوگ جس دردناک انجام سے دوچار ہونے والے ہیں' وہ علیحدہ ہے۔''

(کتاب: ایک اصلاحی تحریک مع خطبۂ نکاح)

''اصل میں عمل کا سارا دارومدار سنتِ رسولؐ پر ہے۔ قرآن مجید میں نماز کی کتنی تاکید ہے۔ اسے ہر وہ شخص جانتا ہے جس کا دین سے ذرا بھی تعلق ہے' بلکہ اس بات کو تو وہ بھی جانتے ہیں جن کا دین سے عملی تعلق منقطع ہے۔ لیکن نماز کی ہیئت اور ترتیب کہاں سے ملے گی؟ اوقات کہاں سے ملیں گے؟ قرآن میں اشارات ہیں' لیکن نماز سے متعلق پورا نظام سنتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ملے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ))(۱۳) ''نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے دیکھتے ہو''۔ چنانچہ جہاں تک احکامِ دین اور فقہی مسائل کا تعلق ہے وہ سنت میں ملیں گے۔ سنت ہی احکامِ قرآن کی عملی تفسیر ہے''

(میثاق دسمبر 2007ء)

زبان کے غلط استعمال کا معاشرے پر اثر

''آپ یقیناً اس بات سے اتفاق کریں گے کہ بین الانسانی معاملات میں اکثر و بیشتر زبان کا غلط استعمال بہت سے فتنوں کو جنم دیتا ہے۔ انسانی تعلقات میں نفرت اور بیر کا بیج بونے اور پھر اس کو نشوونما دینے اور دلوں میں زہر گھولنے میں زبان کے غلط استعمال کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اس کو ''حصائد الالسنة'' سے تعبیر کیا ہے' یعنی یہ زبانوں کی کھیتیاں ہیں' جو کاٹنی پڑتی ہیں۔ زبان آپ کے قابو میں نہ ہو اور اس کا غلط استعمال ہو تو یہی بات بہت سی خرابیوں' برائیوں اور تعلقات میں بگاڑ کا سبب بنتی ہے۔ عربی کی کہاوت ہے کہ: ''تلوار کے زخم مندمل ہو جاتے ہیں لیکن زبان کا زخم مندمل نہیں ہوتا!'' ہم میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ تجربہ ہوگا کہ اس کہاوت میں بڑی صداقت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جسمانی زخم بھر جاتے ہیں' لیکن زبان کے گھاؤ کا بھر جانا اور مندمل ہو جانا مشکل' بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔ اس لیے کہ زبان کا گھاؤ براہ راست دل پر جا کر لگتا ہے' جس کے اندمال کا کوئی سوال ہی نہیں۔ شوہر اور بیوی' ساس اور بہو اور اعزہ و اقارب کے مابین جو پیچیدہ اور لاینحل مسائل و تنازعات کھڑے ہو جاتے ہیں' ان کا جب تجزیہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر کی اصل جڑ اور بنیاد زبان کا غلط استعمال ہوتا ہے۔ بین الانسانی معاملات میں قولاً سدیداً اور قول حسن کی اہمیت اس بات سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ سورۃ البقرۃ میں بنی اسرائیل سے لیے جانے والے جس عہد و پیمان اور میثاق کا ذکر ہے اس میں زبان کا صحیح استعمال بھی شامل ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۭ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ﴾ (آیت ۸۳)

یاد کرو! اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا' ماں باپ کے ساتھ اور رشتہ داروں کے ساتھ اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا اور لوگوں سے درست اور بھلی بات کہنا۔ نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا۔''

(کتاب: ایک اصلاحی تحریک مع خطبۂ نکاح)

رہبانیت خلافِ فطرت اور خلافِ دین ہے!

''نبی اکرم ﷺ نے اس تصور کی کامل نفی اور تردید فرمائی ہے' قول سے بھی اور اپنے عمل سے بھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا میرا طریقہ یہ نہیں ہے۔ میں جو دین لے کر آیا ہوں وہ دین فطرت ہے۔ یہ دین انسان کے کسی بھی طبعی اور فطری تقاضے پر کوئی غیر فطری قدغن عائد نہیں کرتا' نہ ہی وہ یہ چاہتا ہے کہ ان تقاضوں کو بالکلیہ کچل دیا جائے۔ اس کے برعکس ہمارا دین ان فطری تقاضوں کو صحیح رخ پر اور صحیح راستوں پر ڈال دیتا ہے اور صحیح خطوط پر channelize کرتا ہے۔ ان کا جو صحیح مصرف ہے' اس کے لیے اس نے جائز راہیں متعین کر دی ہیں۔ ان راستوں کو اختیار کرنے میں ہی خود انسان کے لیے اپنی انفرادی سطح پر بھی بھلائی ہے اور اجتماعیت کے اعتبار سے بھی اسی میں خیر ہے۔ لہٰذا ان تقاضوں کے پورا کرنے کا جو صحیح' جائز اور مفید طریقہ ہے اس کے لیے اس نے راستہ کھلا رکھا ہے' جیسے نکاح۔ البتہ وہ غلط راستے بند کرتا ہے' جیسے زنا' آزادانہ شہوت رانی کا طریقہ جو فرد کے لیے موجب شر اور معاشرے کے لیے موجب فساد ہوتا ہے۔ اسلام نے رہبانیت کی تعلیم نہیں دی بلکہ رہبانیت سے تاکیداً منع کیا ہے۔ چنانچہ امام ابوداؤدؒ اپنی مراسیل میں روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ)) ''اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں ہے!'' یہاں جو ''لَا'' استعمال کیا گیا ہے' وہ عربی کے قاعدے کے مطابق لائے نفی جنس کہلاتا ہے' جس کا مطلب ہوا کہ ہر قسم کی رہبانیت کی نفی ہو گئی۔ یہی بات میں دوسری طویل حدیث میں واضح طور پر آپ کے سامنے بعد میں پیش کروں گا جس کا آخری ٹکڑا یہ ہے کہ ((.....فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ)) ''جو میری سنت کو ناپسند کرے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔''

(کتاب: ایک اصلاحی تحریک مع خطبۂ نکاح)

اصلاحی تحریک کا خلاصہ

''حضرات! چند سال قبل سے مجھے احباب و رفقاء کے شدید تقاضے پر متعدد نکاح پڑھانے کا اتفاق ہوا۔ میرا شروع ہی سے یہ معمول رہا کہ خطبۂ نکاح کی غرض و غایت اور حکمت میں مَیں تقریر ضرور کیا کرتا تھا' جس میں ان آیات واحادیث کی تشریح بھی ہوتی جو نکاح کے خطبۂ مسنونہ میں پڑھی جاتی ہیں۔ ساتھ ہی مروّجہ رسومات پر بھی تنقید ہوتی اور اصلاح کے لیے کچھ مشوروں اور نصیحتوں کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ نومبر ۱۹۷۳ء میں اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ابصار احمد سلمہٗ کی شادی کے موقع پر میں نے طے کیا کہ جن اصلاحات کی طرف میں لوگوں کو متوجہ کراتا ہوں ان پر خود عمل کر کے دکھاؤں' ورنہ ان باتوں کا کہنا چھوڑ دینا چاہیے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ع یا سراپا نالہ بن جا' یا نوا پیدا نہ کر! ــــ چنانچہ پنجاب میں شاید یہ پہلی شادی تھی جو ٹھیٹھ سنت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطابق انجام پائی۔ نکاح مسجد میں منعقد ہوا اور ان تمام رسومات سے اجتناب کیا گیا جو غیر اسلامی ہی نہیں بلکہ خالص ہندوانہ ہیں۔

میں نے ۱۹۷۳ء کے اواخر ہی میں میثاق میں لکھا تھا کہ کراچی میں بعض تجارت پیشہ برادریوں میں نکاح کی مجالس کے مساجد میں انعقاد کا معمول کافی عرصہ سے جاری ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ کراچی سے جس برائی کا آغاز ہو' اسے لاہور یا پنجاب کے دور دراز گوشوں تک پہنچنے میں کوئی دیر نہیں لگتی' لیکن ایک بھلا کام جو وہاں عرصے سے ہو رہا ہے' اس کے بارے میں یہاں تا حال سوچا بھی نہیں گیا۔ چنانچہ میں نے اپنے بھائی کا نکاح مسجد میں منعقد کر کے اور تمام غیر اسلامی رسوم سے اجتناب کر کے اصلاحی کام کا آغاز کر دیا ہے۔ نیز میں نے اس کے ساتھ ہی ''میثاق'' میں اپنے ان فیصلوں کا بھی اعلان کر دیا کہ میں آئندہ سے:

ا) کسی بارات میں شرکت نہیں کروں گا' کیونکہ میرے محدود مطالعہ کی حد تک بارات کا رائج الوقت طریقہ خالص ہندوانہ تصورات پر مبنی ہے۔

ب) نکاح کے موقع پر کسی دعوت طعام میں شامل نہیں ہوں گا' کیونکہ خیر القرون سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ شادی کے ضمن میں لڑکے والوں کی طرف سے دعوتِ ولیمہ مسنون ہے'

جس کا نہ صرف ثبوت نبی اکرم ﷺ کا تاکیدی حکم بھی ملتا ہے۔

ج) نکاح کی کسی ایسی تقریب میں شرکت نہیں کروں گا جو مسجد میں منعقد نہ ہو۔

الحمد للّٰہ والمنة! میں اپنے ان فیصلوں پر کاربند ہوں[1]۔ میں آپ حضرات کو مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ صرف نکاح کے مسجد میں انعقاد پر اکتفا نہ کیجیے' بلکہ معاشرے سے شادی بیاہ کی ان تمام رسومات کو ختم کرنے کی کوشش کیجیے جن کا اسلام سے سرے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جن کا طومار اور بوجھ ہم نے خود اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔ شادی بیاہ کی ان تمام رسوم کا' جن کا ہمارے ہاں رواج ہے' جب بھی منصفانہ جائزہ لیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ ان کی اصل ہندوانہ رسم و رواج ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو قرآن حکیم اور اسوۂ رسولؐ کے ذریعے ہمارے کاندھوں پر سے بوجھ اتارے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ ''اور (ہمارا یہ نبی اُمیؐ) لوگوں پر سے وہ بوجھ اُتارتا ہے جو اُن پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے!'' پس نبی اکرم ﷺ کا احسانِ عظیم یہ ہے کہ آپؐ نے دین کو آسان سے آسان بنایا ہے۔ آپؐ نے ہدایت دی کہ ((يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا)) (متفق علیہ) ''آسانیاں پیدا کرو' مشکلات پیدا نہ کرو''۔ لیکن ہم ہیں کہ مشکل پسند بن گئے ہیں۔ ہم نے شادی بیاہ کی تقریب میں لاتعداد اضافی رسوم کو اختیار کر رکھا ہے' جس سے شادی ایک بے انتہا گراں مسئلہ بن گیا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ توارث اور برادریوں کے تعامل سے جو ہندوانہ رسوم ہمارے ہاں جاری ہیں ان کو چھوڑنے کے لیے ہم تیار نہیں۔ ہندوستان میں جن برادریوں اور خاندانوں نے اسلام قبول کیا وہ اپنے ساتھ اپنی رسوم بھی لائے اور ان کو چھوڑنے کے بجائے ان کے نام بدل دیے اور ان کو جاری رکھا اور اب تک جاری رکھے ہوئے ہیں۔ سننے میں آیا ہے' اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اس بات میں کہاں تک حقیقت ہے کہ قیام پاکستان سے قبل میو قوم میں میوات کے بعض علاقوں میں نکاح کے موقع پر مولوی صاحب آ کر نکاح بھی پڑھاتے تھے اور پھر پنڈت جی آ کر پھیرے بھی ڈلواتے تھے' تاکہ پکا کام ہو جائے۔ آخر نسلاً بعد نسل جو چیز دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی تو اس وجہ سے ان کا اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ صرف دو بول کہنے سے بندھن بندھ گیا۔ اسی لیے وہ دولہا دلہن کے کپڑوں میں گرہ لگا کر اگنی کے سات پھیرے بھی لگواتے تھے اور اس طرح ان کو

اطمینان ہوتا تھا کہ اب معاملہ مضبوط ہو گیا ہے۔

اس بات پر تو آپ لازماً مسکرائیں گے یا اسے بہت ہی بعید از قیاس گمان کریں گے ،لیکن جائزہ لیجیے کہ بعینہٖ یہی حال ہمارا ہے۔ نکاح حضور ﷺ کے طریقے پر ہو لیکن بارات کا طومار ہے، جہیز کا انبار ہے، رسومات ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر۔ جو لوگ صاحب ثروت ہیں، وہ اپنی دولت و ثروت اور امارت کے اظہار کے لیے پرانی رسموں ہی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ نئی نئی رسوم اور بدعات ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ اس معاملہ میں ان کا ذہن بڑا زرخیز ثابت ہوتا ہے، حالانکہ ان تمام رسومات کی نبی اکرم ﷺ کی سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تعامل میں کوئی بنیاد نہیں۔ کراچی کی بعض برادریوں نے چند اصلاحی اقدامات کیے ہیں۔ مجھے یہ عرض کرنے پر معاف کیا جائے کہ ان اصلاحی اقدامات کا اصل محرک دین کی تعلیمات پر عمل کرنے کے جذبے سے زیادہ معاشرتی مجبوریاں تھیں، جن کی بنیاد پر فیصلے کیے گئے کہ نکاح مسجد میں ہو اور بارات کا تصور ختم کر دیا جائے، لڑکی والے کے ہاں دعوت نہ ہو وغیرہ۔ لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ چور دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ بیٹی والا مہندی کی دعوت اور استقبالیہ وغیرہ کے نام سے اب تک پرانی رسوم کو زندہ کیے ہوئے ہے۔ رسم پرستی کا جو بُت دل کے سنگھاسن پر براجمان ہے وہ اپنی اطاعت ضرور کرائے گا اور اسی کا کسی طرح ظہور ضرور ہو گا۔ پھر دوسری رسمیں بھی جوں کی توں باقی ہیں، بلکہ ان میں کچھ اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ حالانکہ ہمارے دین نے صرف دعوتِ ولیمہ کی تاکید کی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ولیمہ ضرور کیا کرو، اور جس کو ولیمہ میں بلایا جائے وہ اس میں ضرور جائے۔ اس کی حکمت پر آپ جب غور کریں گے تو خود اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ شادی لڑکے والوں کے لیے ہی اصلاً خوشی کا موقع ہوتا ہے۔ ایک نئے خاندان کی تاسیس ہو رہی ہوتی ہے۔ لڑکی والوں کے لیے بلاشبہ اس لحاظ سے تو خوشی کا مقام ہے کہ وہ بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہو رہے ہیں، لیکن نگاہِ حقیقت بین سے دیکھیے تو بیٹی والوں کے لیے تو یہ بڑی آزمائش کا وقت ہوتا ہے۔ بچی کو پالا پوسا، اس کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا اور پھر جوان ہونے پر دوسرے خاندان کے حوالے کر دیا۔ ہزار دیکھ بھال لیا ہو، معلومات کر لی ہوں، اطمینان کر لیا ہو، لیکن یہ اندیشے پھر بھی لاحق رہتے ہیں اور یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ نہ معلوم آگے کیا ہو گا! مزاج ملیں گے یا نہیں، موافقت ہو گی یا نہیں، پتہ نہیں سسرال والوں کا سلوک کیسا ہو گا؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر بچی کی رخصتی کے وقت ماں کی ہچکیاں لگی ہوتی ہیں،

بہنیں پچھاڑے کھا رہی ہوتی ہیں اور باپ اور بھائیوں کی آنکھیں آنسوؤں سے نم ہوتی ہیں۔

میں کہا کرتا ہوں کہ بیٹی والوں کا ایثار دیکھو کہ وہ اپنے لختِ جگر کو دوسروں کے حوالے کر رہے ہیں' لیکن پھر بھی بیٹے والوں کا دل نہیں بھرتا اور رسومات کے نام پر اُن کے مطالبات کی فہرست کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔ جہیز دیسے ہی ہندوانہ رسم ہے' لیکن پہلے یہ ہمارے ہاں عام گھریلو استعمال کی اشیاء تک محدود رہتا تھا' لیکن اب تو بیٹے والوں کو فریج بھی چاہیے' ٹیلی ویژن بھی اور کار بھی! میں نے سنا ہے کہ مکان اور فلیٹ کا بھی مطالبہ ہوتا ہے۔ خدارا غور کیجیے کہ جس بچی کے باپ کے پاس یہ سب مطالبات پورے کرنے کے وسائل و ذرائع نہ ہوں اور پھر اس کی ایک نہیں اور بھی بچیاں ہوں تو وہ کیا کرے' کہاں جائے' اپنی سفید پوشی کا بھرم کیسے قائم رکھے اور اپنی جوان بیٹیوں کو کیسے بیاہے!!

وقت کی اہم ضرورت ہے کہ رسومات کا جو بُت دلوں میں چھپا بیٹھا ہے اس کو پوری طرح مسمار کیا جائے۔ اس لیے میں آپ حضرات سے عرض کروں گا کہ اس بات پر غور کریں کہ ہمارے سامنے شادی بیاہ کے لیے اصل معیار کیا ہے؟ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے اصل معیار صرف یہ ہے کہ کیا چیز نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے۔ ((مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ)) کا مفہوم یہ بھی ہے کہ جو چیز نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے' وہ سر آنکھوں پر اور جو چیز ثابت نہیں اس کو پاؤں تلے روندنے کے بجائے اگر ہم نے بسر و چشم قبول کیا تو اچھی طرح جان لیجیے کہ دین کے ساتھ ہمارا تعلق مخلصانہ نہیں' اور ہمیں اس تعلق کو درست کرنے کی فکر کرنی چاہیے!''

(کتاب: ایک اصلاحی تحریک مع خطبۂ نکاح)

''یاد رکھو اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے! اس کی معیت اُن لوگوں کو حاصل نہیں ہے جن میں مصائب جھیلنے اور مشکلات برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں' جو تھڑدلے' بزدل اور کم ہمت لوگ ہیں۔''

(مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب)

قرآن میں لفظ ''شہید'' کا استعمال

''قرآن حکیم میں اگرچہ لفظ شہید کا استعمال متعدد مقامات پر ہوا ہے اور ''شہادت'' قرآن حکیم کی ایک اہم اصطلاح ہے لیکن مقتول فی سبیل اللہ کے لیے قرآن لفظ ''شہید'' استعمال نہیں کرتا۔ اس میں استثناء صرف ایک ہے اور وہ ہے سورۂ آل عمران کی آیت ۱۴۰۔ وہاں ﴿وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ﴾ میں لفظ ''شُهَدَاءَ'' کو اگر مقتولین فی سبیل اللہ کے معنی میں لیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ دیگر تمام مقامات پر مقتول فی سبیل اللہ کے لیے اس لفظ کا استعمال ہمیں قرآن میں نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ خود نبی اکرم ﷺ کے بارے میں بھی سورۂ آل عمران میں جہاں یہ مضمون آیا ہے وہاں بھی شہید ہو جانے یا شہادت پا جانے کے لیے ''قُتِلَ'' کا لفظ ہی صیغۂ مجہول میں آیا ہے:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۴۴)

''محمد (ﷺ) اللہ کے ایک رسول ہیں' ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں' تو اگر ان کا انتقال ہو جائے یا وہ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جاؤ گے؟''

ایک حدیث میں جس میں آنحضور ﷺ نے اپنے لیے شہادت کی تمنا کا اظہار فرمایا ہے' وہاں بھی اس ضمن میں ''قُتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' کے الفاظ ہی وارد ہوئے ہیں:

((وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوَدِدْتُّ اَنِّيْ اُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ' فَاُقْتَلُ' ثُمَّ اُحْيَا' ثُمَّ اُقْتَلُ' ثُمَّ اُحْيَا' ثُمَّ اُقْتَلُ)) (رواہ البخاریؒ عن ابی ہریرہؓ)

''اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! میری دلی تمنا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں جنگ کروں اور قتل ہو جاؤں' پھر مجھے زندہ کیا جائے' پھر مقتول ہو جاؤں (اللہ کی راہ میں) اور پھر مجھے زندہ کیا جائے اور پھر قتل کر دیا جاؤں۔''

ذہن میں رکھئے کہ قرآن مجید میں لفظ شہادت کا استعمال اصلاً دین حق کی گواہی دینے کے لیے ہے۔ اللہ کے خالق و مالک ہونے کی گواہی' اللہ کی توحید کی گواہی' محمد ﷺ کی صداقت اور رسالت کی گواہی۔ (ع دے تو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی) آخرت کے حق

ہونے کی گواہی' خیر کی گواہی' قرآن کی حقانیت کی گواہی—اور یہ گواہی صرف اپنے قول سے ہی نہیں عمل سے بھی دینی ہے۔ یہ ہے ہر مسلمان کا فرض اور اس کے لیے قرآن کی اصطلاح ہے ''شہادت علی الناس'' جو تمام مسلمانوں کا فرضِ منصبی ہے بحیثیت اُمت مسلمہ۔ اس لفظ شہادت کو قرآن مجید نے اس معنی کے لیے خاص کیا ہے۔ تاہم احادیث میں مقتول فی سبیل اللہ کے لیے لفظ شہید کا استعمال بھی مل جاتا ہے۔ اس لیے ان دونوں الفاظ میں اس اعتبار سے ایک گہرا معنوی ربط موجود ہے کہ جس شخص نے حق کے غلبے کی اس جدوجہد میں اپنی جان اللہ کی راہ میں قربان کر دی اس نے گویا کہ آخری درجے میں شہادت دے دی' دین کی خاطر اپنی زندگی دے کر گویا اپنی جان سے دین حق کی گواہی دے دی۔ اب وہ شہید (گواہ) کہلانے کا بتمام وکمال مستحق ہو گیا۔''

(مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب)

بندۂ مؤمن کا نظریۂ حیات

''مؤمن کا تصورِ حیات یہ ہے کہ ہم اللہ کے پاس سے آئے ہیں اور اللہ ہی کے پاس واپس لوٹ جائیں گے۔ یہ دُنیوی زندگی ایک سفر ہے' یہ ہرگز ہماری منزل نہیں ہے۔ یہ ہمارے سفرِ حیات کا ایک عارضی سا وقفہ ہے۔ اس دنیا میں رہتے ہوئے ہم پر یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ ہم آئے کدھر سے ہیں اور اپنی اس منزل کا بھی واضح شعور ہمیں ہونا چاہیے جہاں ہمیں جانا ہے۔ ہمارا وجود بھی اللہ کا عطا کردہ ہے اور ہمیں حیات بھی اسی نے عطا کی ہے۔ لہٰذا ع ''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!'' اللہ ہمارے بارے میں جو فیصلہ بھی کرے ہمیں قبول ہے۔ اس کی مرضی کے آگے ہمارا سرِ تسلیم خم ہے۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ اس کی عطا ہے۔ ع ''ہر چہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است'' میرے اس پیالے میں میرے ساقی نے جو کچھ ڈال دیا یہ اس کی نگاہِ کرم ہی کے طفیل ہے۔ یہ اس کا عطیہ ہے' لہٰذا دل و جان سے قبول ہے۔''

(مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب)

خلافت راشدہ دوبارہ قائم نہیں ہوسکتی

''میری یہ بات شاید بہت سے حضرات کو چونکا دے کہ خلافت راشدہ دوبارہ قائم نہیں ہوسکتی۔ پہلی مرتبہ جب میں نے یہ بات کہی تھی تو برادرم مجیب الرحمٰن شامی نے ''قومی ڈائجسٹ'' میں میرا انٹرویو شائع کیا اور اس کی تشہیر کے لیے پوسٹر شائع کیا جس میں جلی حروف سے میرے یہ الفاظ نمایاں کیے گئے: ''اب خلافت راشدہ دنیا میں کبھی قائم نہیں ہوسکتی!'' یہ بات ذرا تفصیل سے عرض کی جائے تو سمجھ میں آئے گی۔ میرا موقف یہ ہے کہ خلافت راشدہ کا بعینہٖ وہی نقشہ دنیا میں اب قیامت تک نہیں آ سکتا۔ اس کی وجوہات درج ذیل ہیں۔

(ا) خلافت راشدہ' دورِ نبوت کا ضمیمہ: اگرچہ خلافت راشدہ کا دور ہماری تاریخ کے عہد زریں کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے ساتھ محبت اور عقیدت کے رشتے کا استوار ہونا عین ایمان کا تقاضا ہے لیکن دوسری جانب اس حقیقت کو ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ دورِ خلافت راشدہ کے بعض ایسے خصائص اور امتیازات ہیں جو اس کے نظامِ حکومت میں تو جزو لاینفک کے طور پر پیوست تھے لیکن اب دنیا میں دوبارہ کبھی وجود میں نہیں آ سکتے۔ مثلاً اوّلین اور اہم ترین یہ ہے کہ خلافت راشدہ ور حقیقت خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ہے' وہ دورِ نبوت کا ضمیمہ' تتمہ اور تکملہ ہے۔ حضور ﷺ کے بعد اب نہ تو نبوت کا کوئی امکان ہے اور نہ کسی نبوت کے تکملہ اور تتمہ کا۔

(ب) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی درجہ بندی: محمد رسول اللہ ﷺ پر نبوت ختم ہوئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں اشخاص کے مابین ایک درجہ بندی (gradation) ہوگئی' بایں معنی کہ حضور ﷺ کی ۲۳ برس کی انقلابی جدوجہد میں کون السابقون الاولون ہیں' کون بدری ہیں' کون وہ ہیں جنہوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت علی الموت یعنی بیعت رضوان کی تھی اور کون وہ ہیں کہ جو فتح مکہ کے بعد ایمان لائے: ﴿لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ

اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ (الحدید:۱۰) ''برابر نہیں ہیں تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے فتح سے پہلے انفاق اور قتال کیا تھا۔ ان کے درجات بہت بلند ہیں اُن کے مقابلے میں جنہوں نے فتح کے بعد انفاق اور قتال کیا''۔ وقس علی ذلك ۔ظاہر ہے کہ اب انسانوں میں ایسی درجہ بندی نہیں ہو سکتی۔

دورِ نبویؐ اور دورِ خلافت راشدہ میں بدری ہونا بڑے اعزاز کی بات تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت حاتم بن ابی بلتعہ ؓ سے ایک بڑی خطا ہو گئی تھی کہ حضور ﷺ مکہ مکرمہ کی طرف پیش قدمی کا ابھی پروگرام بنا رہے تھے کہ ان صحابی نے راز فاش کر دیا اور مکہ والوں کو اطلاع پہنچا دی کہ محمد ﷺ تم پر حملہ کرنے والے ہیں۔ جرم اتنا بڑا تھا کہ حضرت عمر ؓ نے حضور ﷺ سے کہا: مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس کی گردن مار دوں۔ حضور ﷺ نے جواب دیا: اے عمر! تمہیں معلوم نہیں ہے کہ یہ بدری ہیں اور اللہ نے اہل بدر کی ساری اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دی ہیں۔

تو یہ وہ درجہ بندی ہے جو اس زمانے میں نہ تو فی الوقت موجود ہے اور نہ آئندہ اس کا امکان ہے' اس لیے کہ یہ صرف نبوت کے ساتھ خاص ہے اور نبوت حضور ﷺ پر ختم ہو گئی۔

(ج) سنت خلفاء راشدین کا اتباع لازم: دورِ خلافت راشدہ میں جو فیصلے خلفائے راشدین نے کیے' ہمارے ہاں انہیں ایک ابدی حیثیت حاصل ہے اور وہ ہماری شریعت میں حجت ہیں۔ اُس دور میں جو اجماع ہوا وہ بھی ہمارے لیے حجت ہے۔ اجماع کے بارے میں نظری طور پر ہم کہیں گے کہ اجماع درحقیقت ممکن ہی اُس وقت تھا' اس کے بعد تو اجماع ہو ہی نہیں سکتا' اس لیے کہ اس کے بعد اُمت ایک وحدت نہیں رہی اور منقسم ہو گئی۔ اُس وقت اُمت نہ صرف فرقہ بندی سے پاک تھی بلکہ امت کے اندر کوئی سیاسی تقسیم بھی نہیں تھی' یعنی ہر اعتبار سے وحدتِ اُمت تھی۔ اس بنا پر فقہاء کرام نے خلفائے راشدین ؓ کے اجتہادات کو اجماع کا درجہ دے کر ہمیشہ کے لیے واجب التزام قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ))(۱)

''پس تم میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑو' اسے مضبوطی کے ساتھ دانتوں سے پکڑے رکھو۔''

یہ معاملہ اب کسی اسلامی حکومت کا نہیں ہوسکتا۔ نظری طور پر ایک امکان ہے کہ جب وہ آخری دور آئے گا' اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا اور پوری دنیا میں اسلام کا غلبہ ہوگا' اس وقت یقیناً پورے کرۂ ارضی پر ایک ہی اسلامی ریاست اور ایک ہی حکومت ہوگی۔ نظری طور پر اگر اس نوعیت کا اجتہاد اور اجماع ممکن ہے تو وہ اسی وقت ممکن ہے' ورنہ یہ اجماع اپنی کامل ترین صورت میں صرف دورِ خلافت راشدہ میں ہوا ہے۔

(۵) قبائلی معاشرہ اور تمدنی ارتقاء: دورِ خلافت راشدہ کے ان مثبت خصائص کے ساتھ ساتھ اس امر واقعی کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ اس وقت کا معاشرہ تمدنی ارتقاء کی اوّلین سطح پر تھا' یعنی خالص قبائلی بنیادوں پر قائم تھا' اور نظامِ مشاورت بھی لامحالہ اسی کی اساس پر استوار تھا کہ قبیلے کے سردار بیٹھ گئے اور فیصلہ ہوگیا۔ اُس دور میں اگر ہر ایک سے رائے لی جاتی تو یہ ایک بے مقصد کام ہوتا اور اسے پاگل پن سمجھا جاتا۔ اس لیے کہ اس وقت نوعِ انسانی کا سیاسی شعور مجموعی طور پر اس سطح تک نہیں پہنچا تھا' اور نہ صرف اُس وقت بلکہ بعد میں بھی طویل عرصے تک ''ریاست'' اور ''حکومت'' کے مابین کسی فرق و تفاوت کا فہم و شعور نوعِ انسانی کو حاصل نہ تھا۔ اب ظاہر بات ہے کہ تمدنی ارتقاء کا عمل بہت آگے جا چکا ہے۔

یہ دورِ خلافت راشدہ کے چار خصائص ہیں جن کا اعادہ اب نہیں ہوسکتا' لہٰذا میں اپنی رائے کے اندر تھوڑی سی لفظی ترمیم کر رہا ہوں کہ خلافت راشدہ تو قائم ہوسکتی ہے لیکن وہ خلافت راشدہ جو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ تھی اور درج بالا خصائص پر مبنی تھی' وہ اب دوبارہ قائم نہیں ہوسکتی اور جو خصوصی حیثیت اس کو حاصل تھی وہ اب کسی حکومت کو حاصل نہیں ہوسکتی''۔

(میثاق' نومبر ۲۰۱۰ء)

''آنحضور ﷺ کی ذاتِ گرامی میں ملتِ اسلامیہ کے پاس وہ ''مرکزی شخصیت'' موجود ہے جس سے تمدنِ انسانی کی وہ فطری ضرورت بتمام وکمال اور بغیر تصنع وتکلف پوری ہو جاتی ہے جس کے لیے دوسری قوموں کو باقاعدہ تکلف واہتمام کے ساتھ شخصیتوں کے بت تراشنے اور ہیرو (heroes) گھڑنے کا کھکیڑ مول لینا پڑتا ہے۔ مزید برآں دُنیا کی دوسری اقوام تو ع ''می تراشد فکرِ ماہر دم خداوندے دگر'' کے مصداق مجبور ہیں کہ ہر دور میں ایک نئی شخصیت کا بت تراشیں' لیکن ملت اسلامیہ کے پاس ایک دائم و قائم مرکز موجود ہے جو اس کے ثقافتی تسلسل (cultural continuity) کا ضامن ہے (اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ﴾ میں خطاب صرف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہی سے نہیں بلکہ تا قیامِ قیامت پوری اُمتِ مسلمہ سے ہے)۔ اس دوام اور تسلسل کے ساتھ ساتھ' اُمت مسلمہ کی وسعت اور پھیلاؤ پر بھی نگاہ رہے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ آنحضور ﷺ کی ''مرکزیت'' ہی کا ثمرہ ہے کہ مشرقِ اقصیٰ سے لے کر مغربِ بعید تک پھیلی ہوئی قوم میں نسل ولسان کے شدید اختلاف اور تاریخی و جغرافیائی عوامل کے انتہائی بعد کے علی الرغم ایک گہری ثقافتی یک رنگی (cultural homogeneity) موجود ہے۔ اور اسی کی فرع کے طور پر اس حقیقت پر بھی ہمیشہ متنبہ رہنا چاہیے کہ مختلف مسلم ممالک میں علیحدہ علیحدہ قیادتوں اور ''علاقائی شخصیتوں'' کو بس ایک حد تک ہی اُبھارنا چاہیے' اس سے تجاوز کی صورت میں اس سے ''وحدتِ ملت'' کی جڑیں کمزور ہونے کا اندیشہ ہے۔ گویا بقول علامہ اقبال ؎

یہ زائرین حریم مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں!

روئے زمین کی تمام مسلمان اقوام کو معیارِ قیادت ایک ہی رکھنا چاہیے اور وہ ہے ذاتِ محمد ﷺ —— فداہ ابی واُمی۔''

(کتاب: مسلمانوں کی سیاسی وملی زندگی کے رہنما اصول)

کل روئے ارضی پر اللہ کا دین غالب آئے گا! ان شاء اللہ

اللہ نے بھیجا حضرت محمد ﷺ کو غلبۂ دین کے لیے ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ تاکہ دین حق کو غالب کر دیں تمام ادیان پر۔ اور بھیجا پوری نوعِ انسانی کے لیے۔ ان دونوں باتوں کو جوڑیے، صغریٰ کبریٰ ملا دیجیے تو بعثتِ محمدی کا مقصد یعنی تکمیلِ رسالت کا آخری مرحلہ وہ ہوگا کہ جب کل نوعِ انسانی پر اللہ کا دین غالب آجائے۔ علامہ اقبال نے ''جوابِ شکوہ'' میں بڑی پیاری بات کہی ہے: ؎

وقت فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے!
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!!

یہ کام ابھی نہیں ہوا۔ پوری نوعِ انسانی تک تو یہ دین نہیں پہنچا۔ کل روئے ارضی پر اللہ کے دین کا غلبہ نہیں ہوا۔ لیکن نوٹ کر لیجیے کہ یہ ہو کر رہنا ہے۔ احادیث میں حضور ﷺ نے اِس کی خبریں دی ہیں۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے اپنے زمانے سے لے کر قیامِ قیامت تک کے پانچ ادوار گنوا دیے ہیں: (1) دورِ نبوت (2) خلافت علیٰ منہاجِ النبوۃ، یعنی خلافت راشدہ (3) ظالمانہ ملوکیت (4) غلامی والی ملوکیت (5) پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ۔ اس وقت نوعِ انسانی اس پانچویں دَور کی دہلیز تک پہنچی ہوئی ہے، گویا یہ دَور آیا چاہتا ہے، زیادہ دُور نہیں ہے۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے میرے لیے کل زمین کو لپیٹ دیا (یا سکیڑ دیا) تو میں نے اس کے تمام مشرق اور تمام مغرب دیکھ لیے۔ اور سن رکھو! میری اُمت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو زمین کو سکیڑ کر اور لپیٹ کر مجھے دکھا دیے گئے۔'' (صحیح مسلم)

کوئی شک ہے؟ کیسے ہو سکتا کہ دنیا ختم ہو جائے اور حضرت محمد رسول ﷺ پر تکمیل رسالت کا یہ مظہر پورا نہ ہو کہ کل روئے ارضی پر حضرت محمد ﷺ کا لایا ہوا دین، دین الحق اسی طرح غالب ہو جائے جیسے آپؐ کے دست مبارک سے جزیرہ نمائے عرب میں ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ﴾ کی شان سے غالب ہوا تھا۔

موجودہ ماحول میں اسلام اور مسلمانوں کے جو حالات ہیں، ان سے بڑی مایوسی ہوتی ہے اور کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ؎

سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے!

اس نا اُمیدی کے چکر سے نکلنے اور ''دامانِ خیالِ یار'' کو مضبوطی سے تھامنے کے لیے ان احادیث کو حرزِ جان بنائیں، انہیں پڑھیں، یاد کریں، انہیں لوگوں تک پہنچائیں۔

(''ختم نبوت کے دو مفہوم اور تکمیل رسالت کے عملی تقاضے'')

غزوۂ بدر..... یوم الفرقان

''اللہ تعالیٰ نے غزوۂ بدر کو یوم الفرقان قرار دیا' یعنی حق و باطل کے مابین تمیز والا دن۔ اس دن معلوم ہو گیا کہ اللہ کی نصرت و حمایت کس کے ساتھ ہے' ان کفارِ مکّہ کے ساتھ کہ جو ایک ہزار کی تعداد میں ہر طرح کے ہتھیار سجا کر میدانِ بدر میں آئے تھے یا ان تین سو تیرہ بے سروسامان مسلمانوں کے ساتھ جن کا رسالہ کل دو گھوڑوں پر مشتمل تھا اور جن میں سے سب کے پاس ہتھیار بھی مکمل نہ تھے۔ کسی کے پاس تلوار تھی تو نیزہ نہ تھا اور اگر نیزہ کسی کے پاس تھا تو تلوار نہ تھی' اور ایسے بھی تھے جو نیزہ اور تلوار دونوں سے تہی تھے۔ پھر یہ کہ ان بے سروسامان مسلمانوں کی عظیم اکثریت ان انصار پر مشتمل تھی کہ جن کو قریش جنگجو قوم ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان کے بارے میں قریش مکّہ کا یہ خیال تھا کہ یہ کاشت کار لوگ ہیں' لڑنے بھڑنے سے انہیں کیا سروکار! وہ تین سو تیرہ ایک ہزار کے کیل کانٹے سے لیس ہر طرح سے مسلح لشکر سے ٹکرا گئے اور اسے ذلت آمیز شکست سے دوچار کیا۔ یوم سمجھئے کہ مکّے نے اپنی اصل طاقت کو وہاں اگل دیا تھا' اس کی کُل جمعیت میدانِ بدر میں موجود تھی۔ عتبہ بن ربیعہ اور ابوجہل جیسے بڑے بڑے سردار کھجور کے کٹے ہوئے تنوں کی مانند میدانِ بدر میں پڑے تھے۔ وہ دن واقعی یوم الفرقان تھا' اس نے حق و باطل کے مابین تمیز کر دی' دودھ کا دودھ پانی کا پانی جدا کر دیا۔ اس شاندار فتح سے مسلمانوں کا مورال یقیناً بہت بلند ہوا۔ پورے علاقے پر مسلمانوں کا دبدبہ قائم ہو گیا۔ اس طرح ہجرت کے دو ہی سال بعد صورتِ حال ایک دم اس طرح تبدیل ہو گئی کہ وہ کسمپرسی اور مظلومیت کا دَور گویا کہ ختم ہوا اور مسلمانوں کی دھاک پورے علاقے پر بیٹھ گئی۔ صورتِ حال کی یہ ساری تبدیلی دراصل نتیجہ تھا غزوۂ بدر کا جسے اللہ تعالیٰ نے بجا طور پر یوم الفرقان قرار دیا تھا!''

(مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب)

صِدّیقین کے ایمان کی کیفیت

''صدّیقین وہ ہوتے ہیں جو نبی کی دعوت کو قبول کرنے میں والہانہ پیش قدمی کرتے ہیں اور قطعاً کوئی توقف نہیں کرتے۔ گویا انہیں اس کے بارے میں کوئی اشتباہ لاحق ہی نہیں ہوتا' چنانچہ نہ وہ کوئی اعتراض وارد کرتے ہیں' نہ کوئی جرح کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ آپ ہم کو دعوت دینے والے کون ہوتے ہیں؟ بلکہ ان کی کیفیت ایسی ہوتی ہے کہ جیسے کوئی نمازی وضو کر کے نماز کے لیے تیار بیٹھا ہو اور صرف انتظار کر رہا ہو کہ جیسے ہی اذان کی آواز کان میں پڑے وہ فوراً مسجد کا رُخ کرے۔ بالکل یہی کیفیت صِدّیقین کی ہوتی ہے' جن کی فطرت صالح ہوتی ہے' جن کی عقل سلیم ہوتی ہے' اور جو خود اپنے ذاتی غور و فکر کے نتیجے میں اُن نتائج کے آس پاس پہنچ چکے ہوتے ہیں جن کی دعوت وحی کے ذریعے سے انبیائے کرام اور رُسلِ عظام ﷺ تک پہنچتی ہے اور پھر اُن کے ذریعے اِن حضراتِ صدّیقین کے کانوں تک پہنچتی ہے۔

''اہل ایمان کو ابتلاؤں اور آزمائشوں سے دوچار کرنے کی اصل حکمت یہ ہے کہ مسلمانوں کی چھانٹی ہو جائے' سچے مسلمانوں اور نام نہاد مسلمانوں کے درمیان تمیز ہو جائے' پھر یہ کہ یہ آزمائشیں اہل ایمان کی مزید تربیت کا ذریعہ بھی بنتی ہیں کہ آزمائش کی ان بھٹیوں سے گزر و تو کندن بن کر نکلو۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ حالات کو ادلتا بدلتا رہتا ہے۔ وہ چاہتا تو تمہیں کوئی تکلیف نہ پہنچتی' کوئی تمہیں گزند نہ پہنچا سکتا' لیکن پھر تمہیں یہ کیسے معلوم ہوتا کہ تمہاری صفوں میں ابھی کہاں کہاں کمزوری موجود ہے۔ تمہاری جمعیت کے اندر کون کون سے گوشے ایسے ہیں کہ جہاں ابھی مزید استحکام کی ضرورت ہے۔ آئندہ کے کٹھن تر مراحل سے نبرد آزما ہونے کے لئے تمہارا اپنی تمام کمزوریوں پر متنبہ ہونا نہایت ضروری ہے۔ تبھی تمہارے لئے یہ ممکن ہوگا کہ اپنی صفوں کو از سرِ نو ترتیب دے کر انہیں تطہیر کے عمل سے گزار سکو اور اس طرح اپنی ہمت کو مجتمع کر کے آئندہ آنے والے مراحل کے لئے مناسب تیاری کر سکو!'' (مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب)

الغرض اِن صدیقین کو نبی کی دعوت کے قبول کرنے میں نہ کوئی تذبذب' تأمل یا تردّد ہوتا ہے نہ کوئی پس وپیش' کیونکہ یہ تو خود اِن کی اپنی فطرت کی پکار ہوتی ہے' اور ان حقائق پر مشتمل ہوتی ہے جو اِن کے اپنے باطن میں مضمر ہوتے ہیں اور وحی کا جامہ پہن کر نبی کے قلبِ اطہر پر وارد ہوتے ہیں اور اب نبی کی زبان سے ایک دعوت کی صورت میں ادا ہو کر ان کے کانوں میں پڑ رہے ہیں' بقول علامہ اقبال مرحوم: ؎

نکلی تو لبِ اقبال سے ہے' کیا جانیے کس کی ہے یہ صدا
پیغامِ سکوں پہنچا بھی گئی' دل محفل کا تڑپا بھی گئی!

لہٰذا وہ جس کیفیت کے ساتھ ایمان لاتے ہیں اس میں ایک والہانہ انداز ہوتا ہے' جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ''میں نے جس کے سامنے بھی دعوت پیش کی اُس نے تھوڑی دیر کے لیے کچھ نہ کچھ توقف ضرور کیا' سوائے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے کہ انہوں نے ایک لمحے کا توقف کیے بغیر فوراً میری تصدیق کر دی''۔ اب آپ خود سوچیے کہ ایسا کیوں ہوا؟ معلوم ہوا کہ ان کو ان

تسلیم و رضا

''﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ ''نہیں نازل ہوتی کوئی مصیبت مگر اللہ کی اجازت سے''۔ آیت کے اس چھوٹے سے ٹکڑے میں معانی و مفاہیم کا ایک خزینہ پنہاں ہے۔ اس کی قدرے تشریح و توضیح کی جائے تو وہ یہ ہوگی کہ اگر تم ایک علیم اور حکیم اللہ کو مانتے ہو کہ وہ ہر چیز پر قدرت بھی رکھتا ہے' اور یہ بھی تسلیم کرتے ہو کہ وہی اس کائنات کا اصل حکمران ہے اور اس کے اِذن کے بغیر ایک پتہ تک نہیں ہل سکتا' تو اس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ کوئی مصیبت' کوئی تکلیف' کوئی نقصان' کوئی حادثہ' کوئی موت' کوئی افتاد اور کسی بھی قسم کے ناخوشگوار واقعات و حوادث اِذنِ خداوندی کے بغیر وارد اور ظہور پذیر نہیں ہو سکتے ـــــ اب جو چیز اُس اللہ کے اِذن سے ہو جو سمیع بھی ہے اور بصیر بھی' علیم بھی ہے اور خبیر بھی اور ان سب پر مستزاد کامل حکیم بھی' تو اس پر شکوہ و شکایت کیسی اور اس پر دل میں تکدّر کیوں؟'' (مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب)

حقائق کے ادراک، شعور اور پہچاننے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ کون مسلمان ایسا ہوگا جو یہ بات نہ جانتا ہو کہ ''واقعۂ معراج'' کی تصدیق کے موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بارگاہِ رسالت سے ''صِدّیق'' کا لقب اور خطاب ملا تھا! اور پوری اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صدیقِ اکبر ہیں۔ مزید برآں مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ سورۃ الّیل کے آخری حصے میں شامل آیات بالخصوص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی ہیں، چنانچہ امام رازیؒ نے سورۃ الّیل کو سورۂ صِدّیق اکبرؓ قرار دیا ہے۔

یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت اگرچہ پورے عرب میں بالعموم شرک اور جہالت کی شدید اور گہری تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں اور مکّہ میں تو یہ ظلمت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور عالَم یہ تھا کہ دنیا میں خدائے واحد کی عبادت کے لیے جو مرکز تعمیر ہوا تھا وہ اقبال کے ان الفاظ کے مصداق کہ ع

''دنیا کے بُت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا''

تین سو ساٹھ بُتوں کا استھان بنا ہوا تھا اور ہر سو شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فطرتِ انسانی بالکل مسخ ہو چکی تھی اور توحید کا نور بالکل ہی مٹ چکا تھا۔ اس لیے کہ اسی مکّہ کی سرزمین میں عین اسی وقت ابوبکرؓ بھی موجود تھے جنہوں نے ساری عمر کبھی شرک نہیں کیا۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ابھی وحیٔ نبوت کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا لیکن جیسے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پیدائشی طور پر موحّد تھے اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی پہلے ہی سے موحّد تھے۔ ایسے ہی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ بھی ابتدا ہی سے موحّد تھے اور ایسی اور بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ ایک صاحب زید بن عمرو بن نفیل تھے جن کا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے آغاز سے قبل انتقال ہو گیا تھا۔ روایات میں ان کا حال یہ آتا ہے کہ کعبہ شریف کے پردے پکڑ پکڑ کر اللہ سے دعائیں کیا کرتے تھے کہ ''اے ربّ! میں صرف تیری عبادت کرنا چاہتا ہوں، میں ان تمام معبودانِ باطل سے اعلانِ براءت کر رہا ہوں جن کو اہلِ مکّہ پوجتے ہیں اور جن سے انہوں نے تیرے گھر کو آباد کر رکھا ہے، میں صرف تیری ہی پرستش اور صرف تیری ہی پوجا کرنا چاہتا ہوں لیکن میں نہیں جانتا کیسے

کروں''۔ان ہی کے صاحبزادے ہیں حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ جو یکے از عشرۂ مبشرہ ہیں اور جو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے بہنوئی ہیں۔ظاہر بات ہے کہ زید جیسے موحد کی آغوش میں تربیت پانے والے کی فطرت میں ان تمام حقائق کا موجود ہونا بالکل سمجھ میں آنے والی بات ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہوںؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے میں سبقت کی۔''

(مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب)

توکل علی اللہ

''ایمان کے نتیجے میں ہمارا سارا بھروسہ' سارا تکیہ' سارا اعتماد اور سارا توکل اللہ کی ذات پر ہونا چاہیے' اگرچہ ہم اس اسباب وعلل کی دنیا میں ساز وسامان اور ذرائع ووسائل سے مستغنی نہیں ہوسکتے اور اپنی امکانی حد تک ہمیں اسباب بھی فراہم کرنے ہوں گے' جیسے ایک دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ .....﴾ (الانفال:۶۰) یعنی اپنے دشمن کے مقابلے کے لیے تیاری کرو اور مقدور بھر جو ساز وسامان فراہم کرسکتے ہو فراہم کرو۔اور جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی کہ ''پہلے اونٹ کو باندھو' پھر اللہ پر بھروسہ کرو''۔جس کی بہترین ترجمانی مولانا روم نے اس مصرع میں فرمائی ہے ع ''بر توکل زانوئے اشتر بہ بند!'' چنانچہ اپنی استطاعت کے مطابق دُنیوی اور مادی اسباب اور ساز وسامان فراہم کرنا ایمان کے منافی نہیں ہے' لیکن اگر یہ خیال ہوگیا کہ مجرد اِن اسباب ووسائل اور ساز وسامان سے کام ہوجائے گا' گویا اصل بھروسہ' اعتماد اور تکیہ اپنی محنت' اپنی تیاری اور اپنے ساز وسامان پر اور اصل توکل مادی اسباب ووسائل پر کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کی ذات سے ہماری نگاہیں ہٹ گئیں اور ہم اس سے محجوب ہوگئے' اس کی کمالِ قدرت کا یقین دل میں قائم نہیں رہا۔اس عالمِ اسباب میں محنت وکوشش اپنی جگہ ضروری ہے اور امکانی حد تک اسباب ووسائل کی فراہمی اور ان کا استعمال بھی لازمی ہے' لیکن توکل صرف اور صرف اللہ کی ذات پر ہوگا۔''

(مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب)

طبعی محبتوں کے ضمن میں احتیاط

''انسان اس دنیا میں تنہا نہیں رہتا۔ مدنیت اس کی جبلت اور طبیعت میں رچی بسی ہے۔ لہٰذا وہ اس دنیا میں بہت سے تعلقات میں جکڑا ہوا ہے جن کے کئی دائرے ہیں۔ ایک دائرہ اس کے والدین' بھائی بہن اور بیوی بچوں کا ہے۔ دوسرے دائرے میں رشتہ دار اور اعزّہ و اقارب ہیں۔ پھر کنبے اور قبیلے کا دائرہ اور اس کے بعد قوم کا دائرہ ہے اور بالآخر یہ سلسلہ پوری نوعِ انسانی تک پھیل جاتا ہے۔ ان سب کو ایک لفظ میں جمع کیا جائے تو وہ ہے ''علائقِ دُنیوی''۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں تمدن وتہذیب کی گاڑی کو چلانے کے لیے ان علائقِ دُنیوی کے ضمن میں بہت سی فطری محبتیں انسان کے دل میں ڈال دی ہیں۔ انسان کو والدین' بہن بھائیوں' بیوی' اولاد اور رشتہ داروں سے محبت ہوتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان محبتوں میں سب سے زیادہ قوی محبت بیویوں اور اولاد کی محبت ہے۔ اگر اس میں حدِ اعتدال سے تجاوز ہو

صبر کا قرآنی تصور

''صبر ہرگز کوئی منفی شے نہیں ہے' بلکہ یہ ایک مثبت جذبہ ہے۔ کسی مقصد کی تکمیل کی خاطر یا کسی نصب العین اور منزلِ مقصود تک رسائی حاصل کرنے کی جدوجہد میں جو تکالیف آئیں اور اس راہ کی رکاوٹوں سے نبرد آزما ہونے میں جو مصائب آئیں انہیں ثابت قدمی کے ساتھ جھیلنا اور برداشت کرنا صبر ہے' جو یقیناً ایک مثبت جذبہ ہے۔ صبر کے حوالے سے یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ اللہ کی راہ میں قتال کرنے والا کوئی شخص اگر میدانِ جنگ میں پامردی اور استقامت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے جان بچانے کے لیے وہاں سے راہِ فرار اختیار کرے گا تو اس کا یہ عمل دراصل اللہ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اس کا سب کچھ کیا دھرا ضائع ہو جائے گا۔''

(مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب)

جائے تو یہی محبت انسان کے لیے دشمنی کا روپ دھار لے گی۔ لہٰذا اس کے ضمن میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ﴾ ''اے اہلِ ایمان! یقیناً تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں، پس ان سے ہوشیار رہو!''

یہ انتباہ اس لیے ضروری ہے کہ فی الواقع ان محبتوں میں انسان کے لیے بالقوہ خطرہ موجود ہے، اس لیے کہ اگر آخرت نہ ہوتی اور حساب کتاب نہ ہوتا اور کوئی جواب دہی نہ ہوتی تب تو کوئی تشویش کی بات نہ ہوتی۔ اس صورت میں تو انسان کو کھلی چھٹی ہوتی کہ بیویوں کی فرمائشیں پوری کرے، خواہ حلال سے کرے، خواہ حرام سے کرے، اولاد کو اچھے سے اچھا کھلائے اور پہنائے اور ان کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلانے کی فکر کرے، چاہے جائز ذرائع آمدنی

ہجرت کس لیے؟

''یہ نہ سمجھو کہ ہجرت کے بعد اب تمہاری تکالیف کا دَور ختم ہو گیا، مشکلات اور مصائب کا دَور اب بیت گیا۔ تم نے ہجرت کی ہے فرار کی راہ اختیار نہیں کی، یہ درحقیقت اپنے مشن اور مقصد کی طرف پیش قدمی کے لیے ایک مرکز ہے جو اللہ نے تمہیں عطا کیا ہے، تمہاری جدوجہد اب ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی ہے ع ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں! ابھی تو بڑی آزمائشیں آئیں گی۔ اصل کٹھن مراحل تو ابھی آنے ہیں کہ جن سے تمہیں سابقہ ہوگا، اس لیے کہ تمہاری یہ دعوت اور تحریک اب ایک ایسے مرحلے میں آ گئی ہے کہ جہاں نظریاتی تصادم اور کشمکش سے آگے بڑھ کر عملی تصادم یعنی جہاد بالسیف اور قتال کا آغاز کرنا ہوگا۔ گویا تم Passive Resistance کے مرحلے سے Active Resistance کے دَور میں داخل ہو گئے ہو۔ اب صرف جھیلنے اور برداشت کرنے کے مرحلے سے آگے بڑھ کر باطل پر حملہ آور ہونے اور دشمن پر ضرب لگانے کا وقت آ رہا ہے، تو اچھی طرح سمجھ لو کہ آنے والا دَور ہرگز کوئی آسائشوں اور آرام کا دَور نہیں ہے، بلکہ تمہارے لیے نئی نئی آزمائشوں کے دروازے کھل رہے ہیں۔''

(مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب)

سے ہو چاہے ناجائز ذرائع آمدنی سے ہو— لیکن جب یہ حقیقت سامنے آ چکی ہے کہ یہ زندگی تو بہت عارضی اور مختصر ہے' اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے جسے کبھی ختم نہیں ہونا اور اصل فیصلے کا دن تو قیامت کا دن ہے' یعنی وہی ہے ہار اور جیت کے فیصلے کا دن! پس اگر اس حقیقت کو جاننے کے بعد بھی تم نے اپنی بیویوں اور اولاد کی محبت سے مغلوب ہو کر اور ان کی خوشنودی کی خاطر اللہ کی حرام کردہ چیزوں میں مُنہ مارا' ناجائز آمدنیوں کا رُخ کیا اور ان کو عیش کرانے اور ان کی فرمائشیں پوری کرنے کے لیے تم نے حلال و حرام کی تمیز کو ختم کر دیا اور جائز و ناجائز کا خیال نہ رکھا تو جان لو کہ یہ تمہارے حق میں محبت نہیں' دشمنی ہے' اور اگر تم محتاط' چوکس اور چوکنے نہ رہے تو یہی بے جا محبت اور لاڈ پیار تمہاری عاقبت کی بربادی کا سبب بن جائے گا۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے کہ: ''بڑا ہی نادان ہے وہ شخص جس نے دوسروں کی دنیا بنانے کے لیے اپنی عاقبت تباہ و برباد کر لی۔''

(مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب)

احتسابی نظام

''منتخب نمائندگان کے لیے مؤاخذہ کا ایک مؤثر نظام بنانا ہوگا۔ یہ نظام اس لیے ضروری ہے کہ منتخب ہو کر آنے والے ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما نہیں ہیں' جن کی طرف سے ہمیں کسی بددیانتی اور خیانت کا اندیشہ نہ ہو۔ خلفاء راشدین کا تزکیہ خود محمد رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا۔ مؤاخذے کا یہ نظام عہدِ حاضر میں ترقی یافتہ ممالک میں کافی مؤثر ہے۔ چنانچہ امریکہ میں صدر نکسن کے خلاف ابھی مؤاخذہ (impeachment) کی تحریک شروع ہوئی تھی کہ وہ از خود مستعفی ہو گئے۔ امریکہ میں آئین نے صدر کو جہاں بہت زیادہ اختیارات دیے ہیں وہیں checks and balances کے سخت نظام نے اسے خاصا جکڑ بھی دیا ہے۔''

(کتاب: خلافت کی حقیقت)

جائے تو یہی محبت انسان کے لیے دشمنی کا روپ دھار لے گی۔ لہٰذا اس کے ضمن میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ﴾ ''اے اہلِ ایمان! یقیناً تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں' پس ان سے ہوشیار رہو!''

یہ انتباہ اس لیے ضروری ہے کہ فی الواقع ان محبتوں میں انسان کے لیے بالقوہ خطرہ موجود ہے' اس لیے کہ اگر آخرت نہ ہوتی اور حساب کتاب نہ ہوتا اور کوئی جواب دہی نہ ہوتی تب تو کوئی تشویش کی بات نہ ہوتی۔ اس صورت میں تو انسان کو کھلی چھٹی ہوتی کہ بیویوں کی فرمائشیں پوری کرے' خواہ حلال سے کرے' خواہ حرام سے کرے' اولاد کو اچھے سے اچھا کھلائے اور پہنائے اور ان کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلانے کی فکر کرے' چاہے جائز ذرائع آمدنی

ہجرت کس لیے؟

''یہ نہ سمجھو کہ ہجرت کے بعد اب تمہاری تکالیف کا دَور ختم ہو گیا' مشکلات اور مصائب کا دَور اب بیت گیا۔ تم نے ہجرت کی ہے فرار کی راہ اختیار نہیں کی' یہ درحقیقت اپنے مشن اور مقصد کی طرف پیش قدمی کے لیے ایک مرکز ہے جو اللہ نے تمہیں عطا کیا ہے' تمہاری جدوجہد اب ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی ہے ع ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں! ابھی تو بڑی آزمائشیں آئیں گی۔ اصل کٹھن مراحل تو ابھی آنے ہیں کہ جن سے تمہیں سابقہ ہوگا' اس لیے کہ تمہاری یہ دعوت اور تحریک اب ایک ایسے مرحلے میں آ گئی ہے کہ جہاں نظریاتی تصادم اور کشمکش سے آگے بڑھ کر عملی تصادم یعنی جہاد بالسیف اور قتال کا آغاز کرنا ہوگا۔ گویا تم Passive Resistance کے مرحلے سے Active Resistance کے دَور میں داخل ہو گئے ہو۔ اب صرف جھیلنے اور برداشت کرنے کے مرحلے سے آگے بڑھ کر باطل پر حملہ آور ہونے اور دشمن پر ضرب لگانے کا وقت آ رہا ہے' تو اچھی طرح سمجھ لو کہ آنے والا دَور ہرگز کوئی آسائشوں اور آرام کا دَور نہیں ہے' بلکہ تمہارے لیے نئی نئی آزمائشوں کے دروازے کھل رہے ہیں۔''

(مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب)

سے ہو' چاہے ناجائز ذرائع آمدنی سے ہو— لیکن جب یہ حقیقت سامنے آ چکی ہے کہ یہ زندگی تو بہت عارضی اور مختصر ہے' اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے جسے کبھی ختم نہیں ہونا اور اصل فیصلے کا دن تو قیامت کا دن ہے' یعنی وہی ہے ہار اور جیت کے فیصلے کا دن! پس اگر اس حقیقت کو جاننے کے بعد بھی تم نے اپنی بیویوں اور اولاد کی محبت سے مغلوب ہو کر اور ان کی خوشنودی کی خاطر اللہ کی حرام کردہ چیزوں میں مُنہ مارا' ناجائز آمدنیوں کا رُخ کیا اور ان کو عیش کرانے اور ان کی فرمائشیں پوری کرنے کے لیے تم نے حلال و حرام کی تمیز کو ختم کر دیا اور جائز و ناجائز کا خیال نہ رکھا تو جان لو کہ یہ تمہارے حق میں محبت نہیں' دشمنی ہے' اور اگر تم محتاط' چوکس اور چوکنے نہ رہے تو یہی بے جا محبت اور لاڈ پیار تمہاری عاقبت کی بربادی کا سبب بن جائے گا۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے کہ: ''بڑا ہی نادان ہے وہ شخص جس نے دوسروں کی دنیا بنانے کے لیے اپنی عاقبت تباہ و برباد کر لی۔''

(مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب)

احتسابی نظام

''منتخب نمائندگان کے لیے مؤاخذہ کا ایک مؤثر نظام بنانا ہو گا۔ یہ نظام اس لیے ضروری ہے کہ منتخب ہو کر آنے والے ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما نہیں ہیں' جن کی طرف سے ہمیں کسی بددیانتی اور خیانت کا اندیشہ نہ ہو۔ خلفاء راشدین کا تزکیہ خود محمد رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا۔ مؤاخذے کا یہ نظام عہدِ حاضر میں ترقی یافتہ ممالک میں کافی مؤثر ہے۔ چنانچہ امریکہ میں صدر نکسن کے خلاف ابھی مؤاخذہ (impeachment) کی تحریک شروع ہوئی تھی کہ وہ از خود مستعفی ہو گئے۔ امریکہ میں آئین نے صدر کو جہاں بہت زیادہ اختیارات دیے ہیں وہیں checks and balances کے سخت نظام نے اسے خاصا جکڑ بھی دیا ہے۔''

(کتاب: خلافت کی حقیقت)

''تسبیح'' کا معنیٰ و مفہوم

''لفظ ''تسبیح'' کے اگرچہ فوری طور پر جو عام معنی ذہن میں آتے ہیں وہ یہ اقرار ہے کہ اللہ پاک ہے۔ لیکن اس کا حقیقی مفہوم کیا ہے' اسے جاننا ضروری ہے۔ ''سَبَحَ' یَسْبَحُ'' فعل لازم ہے اور اس کا مطلب ہے کسی چیز کا تیرنا' خواہ وہ چیز پانی کی سطح پر تیر رہی ہو' خواہ فضا یا خلا میں اپنے مدار پر اپنی سطح کو برقرار رکھتے ہوئے حرکت کر رہی ہو۔ چنانچہ آپ کو قرآن مجید میں یہ الفاظ ایک سے زائد مقامات پر ملیں گے کہ: ﴿كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ (الانبیاء) ''یہ تمام (اجرامِ سماویہ خلا میں) اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں''۔ اس سے فعل متعدی بنتا ہے سَبَّحَ یُسَبِّحُ جس کا مطلب ہے کسی شے کو ''تیرانا'' یا اسے اس کی سطح پر برقرار رکھنا۔ اس کا مصدر ''تسبیح'' ہے۔ گویا لفظ تسبیح کے لغوی معنی ہیں ''کسی کو اس کی اصل سطح پر برقرار رکھنا''۔ چنانچہ اللہ کی تسبیح یہ ہے کہ اس کا جو مقامِ بلند ہے' اس کی جو اعلیٰ و ارفع شان ہے' اسے اس پر برقرار رکھا جائے' اور اس کی ذاتِ اقدس' صفاتِ اکمل اور شانِ ارفع کے ساتھ کوئی ایسا تصور شامل نہ کیا جائے جو اس کے شایانِ شان نہ ہو۔ گویا کسی بھی درجے کے ضعف' عجز' نقص' عیب یا محدودیت کا کوئی بھی تصور اُس کی ذات و صفات کے ساتھ شامل کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اسے اس کے مقامِ رفیع سے نیچے گرا رہا ہے۔ معاذ اللہ!۔۔۔ پس تسبیح باری تعالیٰ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس بات کا اقرار و اعتراف کیا جائے کہ اللہ ہر عیب سے' ہر نقص سے' ہر ضعف سے' ہر احتیاج سے منزہ و ماوراء اور اعلیٰ و ارفع ہے' گویا فی الجملہ ''اللہ پاک ہے''۔ واضح رہے کہ یہ معرفتِ الٰہی کا سلبی پہلو ہے کہ ہم نے یہ جان لیا کہ اللہ میں کوئی نقص نہیں' کوئی عیب نہیں' اسے کوئی احتیاج نہیں۔ وہ ان سب سے منزہ اور پاک ہے۔''

(مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب)

عظمت صحابہ

''صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عظمت کو کم کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے۔ اللہ تعالیٰ تو انہیں اپنی کتاب مبین میں اپنے رسول ﷺ کا معین قرار دے رہا ہے۔ غور کا مقام ہے اسلامی انقلاب اگر اکیلے رسول کے ذریعے سے برپا ہو سکتا ہوتا تو کیوں نہ حضرت نوح علیہ السلام انقلاب برپا کر دیتے! لیکن رسول کے ساتھ ایک ایسی جمعیت اور جماعت کی ضرورت ہوتی ہے جو اپنے آپ کو رسول کے مقصد کے لئے ہمہ تن وقف کر لے اور کامل تعاون و اعانت کا عملی مظاہرہ دکھا دے۔ جہاں رسول کا پسینہ بہے وہ اپنے خون کی ندیاں بہا دے۔ وہ رسول کے چشم و ابرو کے اشارے پر اپنی گردنیں کٹوا دینے کو اپنے لئے دنیا کی عظیم ترین نعمت و سعادت سمجھے۔ جب تک ایسے لوگوں کی جماعت و جمعیت موجود نہ ہو انقلاب نہیں آ سکتا، اللہ کا دین غالب نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی امتیازی خصوصیت والی آیتِ مبارکہ: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝﴾ سے متصلاً بعد فرمایا: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ ......﴾ —— یہ ہے ان دونوں آیات کا باہمی ربط و تعلق۔ یہ ہے نظم آیات جس میں معانی و مفاہیم اور حکم و بصائر کے کبھی ختم نہ ہونے والے خزانے موجود ہیں۔ یہ ہیں وہ جواہرات اور عجائبات جو قرآن و حدیث اور سیرتِ مطہرہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں معروضی طور پر تدبر اور غور و فکر کرنے والے طالب علم کے نصیب میں آتے ہیں۔''

(کتاب: منہج انقلاب نبوی)

تکمیل نبوت و رسالت

نبوت کی تکمیل کا مظہر یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہدایت کامل کر دی گئی۔ سابقہ انبیاء و رسل علیہم السلام کو جو کچھ بذریعہ وحی ملتا رہا ہے اس کا کامل، مکمل اور محفوظ ایڈیشن قرآن مجید ہے۔

نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ اُو رحمۃٌ لِلعالمین!

چنانچہ ہدایت الٰہی کا یہ آخری اور کامل ایڈیشن آ گیا تو گویا کہ نبوت کامل ہو گئی۔

رسالت کی تکمیل کے دو مظہر ہیں۔ ایک یہ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت مکانی اور زمانی دونوں اعتبارات سے غیر محدود ہے۔ اس لئے کہ ایک جانب آپؐ کی رسالت کرۂ ارضی پر بسنے والی تمام نوعِ انسانی کے لئے ہے اور دوسری جانب آپؐ کی رسالت کا دور دائمی ہے۔ یعنی تا قیامِ قیامت آپؐ ہی کی رسالت کا دور ہے۔ اس ضمن میں قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اشارات موجود ہیں۔ مثلاً سورۂ سبا میں ارشاد ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا.....﴾ ''اور (اے نبی) ہم نے نہیں بھیجا ہے آپؐ کو مگر تمام نوعِ انسانی کے لئے بشیر و نذیر بنا کر.....''

گویا کہ مکانی حدود ختم ہوئیں۔ کیونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پورے کرۂ ارضی کے لئے ہے اور آپؐ کی بعثت پوری نوعِ انسانی کی طرف ہوئی ہے۔ آپؐ کی مخاطب کوئی ایک قوم، کوئی ایک قبیلہ، کوئی ایک نسل، کوئی ایک علاقہ، کوئی ایک ملک اور کسی ایک دور کے انسان نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی ہے۔ یہ چیز جہاں مکانی اعتبار سے غیر محدود ہے وہاں زمانی اعتبار سے بھی غیر محدود ہے کہ اب تا قیامِ قیامت کوئی نبی اور رسول آنے والا نہیں۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دورِ رسالت ہے جو قیامت تک قائم و دائم رہے گا۔

اقتباس .....بلاعنوان

ایمان درحقیقت کوئی خارج سے ٹھونسی جانے والی چیز ہے ہی نہیں' اس کی شمع تو انسان کے اپنے باطن میں روشن ہے اور اس کا قلب بذاتِ خود وہ جامِ جہاں نما ہے جس میں کائنات کے وہ تمام حقائق ازخود منعکس ہیں جن کا دوسرا نام ایمان ہے۔ ہوتا صرف یہ ہے کہ غلط ماحول اور غلط تعلیم و تربیت کے اثرات سے انسان کی شمعِ باطن کی روشنی دھندلا جاتی ہے اور اس کے اعمال بد کے سبب سے اس کا آئینۂ قلب مکدر ہو جاتا ہے!

اور اس آئینے کو صیقل کرنے اور انسان کی اس شمع باطن کے نور کو اجاگر کرنے کے لیے ہی کلام الٰہی ﴿تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ﴾ بن کر نازل ہوا ہے۔ تلاشِ حق کی نیت سے اسے پڑھا اور اس پر غور و فکر کیا جائے تو سارے حجابات دور ہوتے چلے جاتے ہیں اور انسان کا باطن نورِ ایمان سے جگمگا اٹھتا ہے۔

یہ تو ہوئی نورِ ایمانی کی اوّلین تحصیل' اس کے بعد بھی جب کبھی غفلت یا غلبۂ بہیمیت کے سبب سے آئینۂ قلب غبار آلود ہو جائے تو اس کے جلاء و صیقل کا مؤثر ترین ذریعہ قرآن مجید ہی ہے' جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق آنحضور ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيْدُ اِذَا اَصَابَهُ الْمَاءُ)) قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا جِلَاءُ هَا؟ قَالَ :((كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةُ الْقُرْآنِ)) (رواہ البیہقی)

''بنی آدم کے قلوب بھی اسی طرح زنگ آلود ہو جاتے ہیں جیسے لوہا پانی پڑنے

سے!'' دریافت کیا گیا: یا رسول اللہ! اس زنگ کو دُور کس چیز سے کیا جائے؟ فرمایا: ''موت کی بکثرت یاد اور قرآن مجید کی تلاوت!''

خلاصۂ کلام یہ کہ محض ایک متوارث عقیدے کے طور پر قرآن کو ایک مقدس آسمانی کتاب ماننے سے ہماری موجودہ صورتِ حال میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی اور قرآن مجید کے ساتھ عدم التفات کا جو رویہ ہمارا اس وقت ہے، وہ نہیں بدل سکتا۔ قرآن مجید کے جو حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں ان کی ادائیگی کی اوّلین شرط یہ ہے کہ سب سے پہلے ہمارے دلوں میں یہ یقین پیدا ہو کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور ہماری ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے۔

اس یقین کے پیدا ہوتے ہی قرآن کے ساتھ ہمارے تعلق میں ایک انقلاب آجائے گا۔ یہ احساس کہ یہ ہمارے اس خالق و مالک کا کلام ہے جس کی ذات تبارک و تعالیٰ وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے، اور جس کا کسی ادنیٰ ترین درجے میں بھی کوئی تصور ہمارے بس میں نہیں اور جس کی ذات کے ادراک سے عجز کا احساس ہی بقول افضل البشر بعد الانبیاء، کمالِ ادراک ہے، ہمارے فکر و نظر میں ایک انقلاب برپا کر دے گا۔ پھر ہمیں محسوس ہوگا کہ اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے قرآن سے بڑی کوئی دولت اور اس سے عظیم تر کوئی نعمت موجود نہیں۔

پھر اس کی تلاوت ہماری روح کی غذا اور اس پر غور و فکر ہمارے قلوب و اذہان کے لیے روشنی بن جائیں گے — اور یقیناً یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی کہ اس کی تلاوت سے ہم کبھی سیر نہ ہوسکیں گے اور اپنی بہترین ذہنی و فکری صلاحیتوں اور اپنی پوری عمر کو اس پر تدبر و تفکر میں کھپا کر بھی ہم محسوس کریں گے کہ ع

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

''بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً'' کے ان مبارک الفاظ کے عموم سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ذمہ داری سے بالکل بَری کوئی بھی نہیں۔ جسے ناظرہ پڑھنا آتا ہے وہ دوسروں کو ناظرہ پڑھنا سکھا دے' جسے حفظ ہے وہ دوسروں کو یاد کرائے' جسے ترجمہ آتا ہے وہ دوسروں کو ترجمہ پڑھائے اور جسے اس کا کچھ علم وفہم حاصل ہے وہ اسے دوسروں تک پہنچائے۔ حتیٰ کہ اگر کسی کو ایک آیت ہی یاد ہو اور وہ اسے ہی دوسروں کو یاد کرا دے یا قرآن کی کسی ایک آیت یا سورت کا مفہوم معلوم ہو اور وہ صرف اسی کا علم دوسروں تک منتقل کر دے تو یہ بھی ''تبلیغ قرآن'' میں شامل ہے۔ اگرچہ اس مقدس اور عظیم الشان فرض کی ادائیگی کی جو ذمہ داری اُمتِ مسلمہ پر بحیثیتِ مجموعی عائد ہوتی ہے وہ صرف اس وقت پوری ہو سکتی ہے جب قرآن کا متن اور اس کا مفہوم اَطراف واکنافِ عالم تک پہنچا دیا جائے!

بحالاتِ موجودہ یہ ایک بہت دُور کی بات اور سہانا خواب معلوم ہوتا ہے' اس لیے کہ واقعی صورت حال یہ ہے کہ وہ امت کو قرآن کو اقوام واُمم عالم تک پہنچانے کی ذمہ دار بنائی گئی تھی آج اس کی محتاج ہے کہ خود اسے قرآن ''پہنچایا'' جائے۔ لہٰذا اس وقت اصل ضرورت اس کی ہے کہ خود اُمت مسلمہ میں تعلیم وتعلّم قرآن کی ایک رَو چل نکلے اور مسلمان درجہ بدرجہ قرآن سیکھنے اور سکھانے میں لگ جائے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

مال اور اولاد فتنہ ہیں!

''اس دنیا میں علائقِ دُنیوی کے ساتھ جس دوسری چیز سے انسان بندھا ہوا ہے وہ مال واسبابِ دُنیوی ہیں جن سے انسان کی حیاتِ دُنیوی کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں ایک دوسرے مقام پر (سورۃ النساء:۵) انہیں حیاتِ دُنیوی کے بقاء اور قیام کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے' لہٰذا ان سے ایک طبعی اور قدرتی لگاؤ بھی انسان کی جبلّت کا جزوِ لاینفک ہے۔ لیکن اگر اس طبعی لگاؤ میں شدت پیدا ہو جائے اور یہ چیزیں فی نفسہٖ محبوب اور مطلوب ومقصود بن جائیں تو آخرت اور عاقبت کے اعتبار سے ان سے زیادہ مضر اور تباہ کن اور کوئی چیز نہیں ہوتی ـــــ پھر اپنے دُنیوی مستقبل کے لیے انسان جس طرح پس انداز اور جمع شدہ مال پر تکیہ کرتا ہے ایسے ہی اولاد سے بھی امیدیں لگاتا ہے۔ لہٰذا اس سے ہوشیار رہو کہ ان دونوں کی محبت تمہارے حق میں فتنہ ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ ''بلاشبہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد (تمہارے حق میں) فتنہ ہیں'' ـــــ فتنہ کے لغوی معنی ''کسوٹی'' کے ہیں۔ یعنی وہ چیز جس پر پرکھ کر دیکھا جاتا ہے کہ سونا خالص ہے یا اس میں کھوٹ اور ملاوٹ ہے۔ چنانچہ اہل ایمان کو بتایا جا رہا ہے کہ اس دنیا میں مال اور اولاد تمہارے لیے کسوٹی ہیں' یعنی تمہاری آزمائش کا ذریعہ ہیں اور ان پر تم کو پرکھا جا رہا ہے کہ کہیں تم ان کی محبت سے مغلوب ہو کر اللہ کو بھول تو نہیں جاتے اور اس کے اوامر ونواہی سے بے پروا ہو کر اپنی عاقبت تو خراب نہیں کر لیتے ـــــ!''

(مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب)

آنحضور ﷺ کی دُور اندیشی کا شاہکار

''نبی اکرم ﷺ نے مدینے تشریف لاتے ہی سب سے پہلا کام جو کیا وہ آپ کی دور اندیشی اور معاملہ فہمی کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپؐ نے اپنے اس مشن کی تکمیل کے لئے فوری طور پر ایک نقشہ کار تیار کیا کہ جس کے مختلف تقاضے آپ کے سامنے اس وقت پوری وضاحت کے ساتھ موجود تھے' چنانچہ اس کے مطابق عملی اقدامات کا آغاز فرما دیا۔ مدینہ تشریف لاتے ہی آپؐ نے پہلا کام یہ کیا کہ یہودیوں سے معاہدے کر لئے۔ اور اس طرح انہیں معاہدوں میں جکڑ لیا کہ بعد کے نو دس سالوں کے دوران ایسے محسوس ہوتا ہے کہ یہود ان معاہدوں کی وجہ سے ایک عجیب مشکل میں گرفتار ہو گئے تھے۔ نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف شدید جذبات رکھنے کے باوجود وہ کوئی فیصلہ کن اقدام کرنے کے قابل نہیں رہے تھے اور خود کو بے دست و پا محسوس کرتے تھے' ہاں در پردہ سازش اور ریشہ دوانی کرنے کی کوششیں انہوں نے ضرور کیں اور بعض مواقع پر مشرکین مکّہ کو اشتعال دلا کر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی لیکن وہ براہِ راست اور کھلم کھلا نبی اکرم ﷺ کے مقابلے میں نہیں آ سکے۔ یہی معاہدے کہ جو اُن کے پاؤں کی بیڑیاں بنے تھے بالآخر اُن کے گلے کا طوق بھی بنے۔ اور انہی معاہدوں کو توڑنے کی پاداش میں وہ تینوں قبیلے باری باری اپنے انجام کو پہنچے۔ ان میں سے دو قبیلوں کو مختلف مراحل پر مدینہ بدر کیا گیا اور ایک کو اُن کی بدعہدی کی سخت ترین سزا دی گئی کہ ان کے تمام لڑائی کے قابل مَردوں کے سر قلم کئے گئے۔''

(مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب)

اقتباس .....بلاعنوان

قرآن صرف ایک بار پڑھ لینے کی چیز نہیں ہے بلکہ بار بار پڑھنے اور ہمیشہ پڑھتے رہنے کی چیز ہے' اس لیے کہ یہ روح کے لیے بمنزلۂ غذا ہے اور جس طرح جسم انسانی اپنی بقاء و تقویت کے لیے مسلسل غذا کا محتاج ہے جو انسان کے جسدِ حیوانی کی طرح سب زمین ہی سے حاصل ہوتی ہے اسی طرح روحِ انسانی جو خود آسمانی چیز ہے' کلامِ ربانی کے ذریعے مسلسل تغذیہ وتقویت کی محتاج ہے!

اقتباس .....بلاعنوان

آیاتِ قرآنی' آیاتِ آفاقی اور آیاتِ انفسی میں تفکر و تعقل کے نتیجے میں انسان محسوس کرتا ہے کہ ایک تو ان تینوں میں گہری ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور دوسرے یہ سب کامل توافق کے ساتھ بعض ایسے حقائق کی جانب رہنمائی کرتی ہیں جن کی شہادت خود اس کی اپنی فطرت میں مضمر ہے۔ اس طرح اس کے اپنے باطن کی مخفی شہادت اجاگر ہو کر اس کے شعور کے پردوں پر جلوہ فگن ہوتی ہے اور حقیقت نفس الامری کا علم' جس کا دوسرا نام ایمان ہے' اس کے شعور میں بالکل اس طرح ابھرتا ہے جیسے کسی تحریک کی بنا پر کوئی پرانی بھولی بسری بات انسان کی یادداشت کے ذخیرے کی گہرائیوں سے ابھر کر افق شعور پر طلوع ہوتی ہے۔ اسی عمل (phenomenon) کا نام قرآنی اصطلاح میں ''تذکر'' ہے۔

اقتباس .....بلاعنوان

میں نہیں سمجھتا کہ ایک ایسا مسلمان جس نے کچھ بھی پڑھا لکھا ہو' کجا یہ کہ غیر ملکی زبان تک سیکھی ہو' بی اے اور ایم اے پاس کیا ہو' ڈاکٹری اور انجینئرنگ جیسے مشکل علوم وفنون حاصل کیے ہوں' وہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں اتنی سی عربی بھی نہ سیکھ سکنے پر کیا عذر پیش کر سکے گا جس سے وہ اس کے کلام پاک کا فہم حاصل کرسکتا۔ حضرات! میں پورے خلوص اور خیر خواہی کے ساتھ آپ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ ایسے لوگوں کا عربی سیکھ کر قرآن کا فہم حاصل کرنے سے باز رہنا اللہ کے کلام کا تمسخر اور استہزاء ہی نہیں بلکہ اس کی تحقیر وتوہین ہے اور آپ خود سوچ لیں کہ اپنے اس طرزِ عمل سے ہم اپنے آپ کو اللہ کی کیسی شدید بازپُرس اور کتنی سخت عقوبت کا مستحق بنا رہے ہیں۔!

انفاق فی سبیل اللہ

''﴿وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِکُمْ ؕ﴾ ''اور خرچ کرو (اللہ کی راہ میں) اسی میں تمہاری بھلائی مضمر ہے!'' اللہ کی راہ میں خرچ کرنا غرباء' فقراء' مساکین اور یتامیٰ کے لیے بھی ہے اور اللہ کے دین کے لیے بھی! اس کا ایمان بالآخرت کے ساتھ بڑا گہرا مگر لطیف تعلق ہے' اس لیے کہ جسے آخرت پر یقین حاصل ہو وہ جو مال اللہ کے لیے صرف کرے گا اس کے بارے میں اسے یہ اطمینان ہوگا کہ یہ مال محفوظ ہوگیا' گویا اللہ کے بینک میں جمع ہوگیا۔ اب یہ بات بالکل ظاہر و باہر اور حتمی و یقینی ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کا بیشتر اور بہتر حاصل آخرت کے بینک میں جمع کرا دیا ہو تو ایسے شخص کی کیفیت موت کے وقت بالکل وہی ہو گی جو علامہ اقبال کے اس شعر میں بیان ہوئی ہے:۔

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم
چو مرگ آید تبسّم بر لبِ اوست

یعنی مردِ مؤمن کی نشانی یہی ہے کہ جب موت کا وقت آتا ہے تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اسے معلوم ہے کہ میں نے اپنے مال و دولت اور اپنی توانائیوں اور قوتوں کا بہت بڑا حصہ اللہ کے بینک میں جمع کرا رکھا ہے اور اب میں وہاں جا رہا ہوں جہاں میری بچت' میری کمائی اور میری توانائیوں کا حاصل جمع ہے۔ اناجیلِ اربعہ کے نام سے اِس وقت جو کتابیں موجود ہیں ان میں سے متی کی انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کا ایک بڑا پیارا قول ملتا ہے کہ ''اپنا مال زمین پر جمع نہ کرو جہاں کیڑا بھی خراب کرتا ہے اور چوری ڈاکے کا بھی خوف ہے' بلکہ آسمان پر جمع کرو جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے' نہ چوری کا خوف ہے' نہ ڈاکے کا اندیشہ ہے۔ اور میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جہاں تمہارا مال ہوگا وہیں تمہارا دل بھی ہوگا''۔ اس ضمن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک واقعہ بھی بڑا عجیب اور پیارا ہے۔ ان کے یہاں ایک بکری ذبح ہوئی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دستی کا گوشت بہت مرغوب تھا تو سیدہ صدیقہؓ نے ایک دستی بچا کر رکھ لی اور باقی سارا گوشت غرباء و مساکین میں تقسیم کر دیا۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپؐ نے دریافت فرمایا: ((مَا بَقِیَ مِنْھَا؟)) ''اس بکری میں سے کیا بچا؟'' حضرت عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا: مَا بَقِیَ مِنْھَا اِلَّا کَتِفُھَا ''اس میں سے کچھ نہیں بچا سوائے ایک دستی کے''۔ اس پر

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((بَقِيَ كُلُّهَا غَيْرَ كَتِفِهَا))[1] ''پوری بکری بچ گئی سوائے اس دستی کے!'' یعنی اس دستی کو تو ہم کھالیں گے اور جو کھالیا گیا وہ تو خرچ ہو گیا' البتہ جو اللہ کی راہ میں دے دیا گیا وہ باقی رہنے والا ہے' وہ اصل بچت ہے۔ لہٰذا ایمان بالآخرت کے نتیجے میں انسان کے نقطۂ نظر میں یہ تبدیلی آنی چاہیے کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں دے دیا ہے وہ حقیقی بچت ہے۔ یہی تعلیم و تلقین ہے ان الفاظِ مبارکہ میں کہ: ﴿وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ﴾ ''اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو' یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔''

(مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب)

تقویٰ کیا ہے؟

''عام طور پر ''تقویٰ'' کا ترجمہ ''خوف'' یا ''ڈر'' کے الفاظ سے کر دیا جاتا ہے' حالانکہ یہ ''تقویٰ'' کے معنی و مفہوم کی صحیح اور کامل ترجمانی نہیں ہے۔ ڈر یا خوف ایک تو ہوتا ہے کسی خطرناک' خوفناک اور ڈراؤنی شے کا' تو تقویٰ سے یہ ڈر مراد نہیں۔ اور ایک خوف اور ڈر وہ ہوتا ہے جس میں محبت کی آمیزش اور چاشنی بھی موجود ہوتی ہے' یعنی محبت بھرا خوف۔ یہ خوف تقویٰ کی کسی حد تک صحیح ترجمانی ہے۔ بغرضِ تفہیم مثال پیشِ خدمت ہے کہ جیسے آپ کو اپنے والد سے محبت ہے اور آپ نہیں چاہتے کہ آپ کے والد آپ سے ناراض ہوں یا آپ کے کسی کام سے ان کی دل شکنی ہو یا ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آپ کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو آپ کے والد کو ناپسند ہو۔ گویا آپ اپنے والد کی ناراضی کے خوف سے اُن کاموں کے ارتکاب سے احتراز کرتے ہیں جو انہیں ناپسند ہوں' پس آپ کے اس محبت بھرے خوف کو ''تقویٰ'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ گویا اللہ کا تقویٰ یہ ہے کہ انسان اپنی پوری زندگی میں پھونک پھونک کر قدم رکھے اور اس کے قلب اور ذہن پر ہر وقت یہ خیال مستولی رہے کہ میرے کسی قول اور میرے کسی عمل سے میرا خالق و مالک مجھ سے ناراض نہ ہو جائے' اور اسے ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہے کہ کوئی ایسا کام نہ کر بیٹھوں جو میرے ربّ کو پسند نہ ہو۔ یہ کیفیت' یہ طرزِ عمل' یہ رویہ اور یہ اندازِ فکر تقویٰ کی اصل حقیقت ہے!'' (مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب)

لفظ ایمان کی لغوی اور شرعی تعریف

''لفظ ''اٰمِنَ'' کو باب افعال میں لے جائیں تو مصدر بنے گا: ''ایمان''، یعنی کسی کو امن دینا۔ تو لفظ ایمان کا ترجمہ ہوا ''امن دینا''۔ اسی سے اسم فاعل بنتا ہے: ''مُؤْمِنٌ''، یعنی امن دینے والا۔ اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا نام ہے ''اَلْمُؤْمِنُ''۔ سورۃ الحشر میں فرمایا گیا ہے: ﴿اَلْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ﴾ (آیت ۲۳) ''امن دینے والا' نگہبان' سب پر غالب' اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا اور بڑا ہو کر رہنے والا''۔ معلوم ہوا کہ اٰمَنَ۔ یَاْمَنُ۔ اَمْنًا کا مفہوم ہے: خود امن میں ہونا' اور اٰمَنَ۔ یُؤْمِنُ۔ اِیْمَانًا کے معنی ہیں: دوسرے کو امن فراہم کرنا۔

لفظ ایمان کے بعد جب ''بِ'' یا ''لِ'' کا صلہ آئے گا تو معنی ہوگا ''کسی کی تصدیق کرنا''۔ مثلاً کسی نے آ کر کوئی خبر دی یا دعویٰ کیا تو جواب کی دو ہی شکلیں ہوں گی: تصدیق یا تردید۔ تصدیق کر دی تو امن رہا اور اگر تردید کر دی تو جھگڑا شروع' جھگڑا تھوڑا ہو یا زیادہ' زبانی کلامی ہو یا ہاتھا پائی ہو یا قتال اور خون ریزی' بہر حال جھگڑا شروع ہو گیا ہے۔ چنانچہ ''اٰمَنَ بِهٖ'' اور ''اٰمَنَ لَهٗ'' کے معنی ہیں کسی کی تصدیق کرنا۔ تصدیق کرنے میں امن کے ساتھ تعلق برقرار رہا اور تصدیق کرنے کا معنی دعویٰ کرنے والے کو امن دینا ہے۔ قرآن حکیم میں ''لِ'' کے صلے کے ساتھ ''اٰمَنَ لَهٗ'' کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں سرسری طور پر کسی کی بات کو مان لینا۔ اگرچہ یہاں ایک استثناء موجود ہے: ﴿فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ﴾ (العنکبوت: ۲۶) یعنی حضرت لوط علیہ السلام بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔ یہاں ایمان لانا سرسری معنی میں نہیں ہے۔

عام طور پر لفظ ''ایمان'' جب ''لِ'' کے صلے کے ساتھ آئے تو اس میں زیادہ گہرائی اور وثوق والی بات نہیں ہوا کرتی' لیکن جب ''بِ'' کے صلے کے ساتھ آئے تو اس کے معنی میں بڑے وثوق اور بھرپور اعتماد کے ساتھ کسی بات کو مان لینا اور کسی کے دعوے کی تصدیق کرنا شامل ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم نے لفظ ایمان کو جب اصطلاحی معنوں میں بیان کیا ہے تو

''بِ'' کے صلے کے ساتھ ذکر کیا ہے' فرمایا: ﴿یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ﴾..... ﴿وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ﴾..... ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾..... ﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (یہ سب آیات سورۃ البقرۃ کی ہیں)۔ ایمانِ مجمل کے الفاظ ہیں: آمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَآءِهٖ وَصِفَاتِهٖ..... اور ایمان مفصل کے الفاظ ہیں: آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَ مَلٰئِكَتِهٖ..... گویا جب لفظ ایمان ''بِ'' کے صلے کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں ''تصدیق کرنا''۔

جب ایمان نام ہے تصدیق کا' تو تصدیق ہوگی نبی کی' اس کے دعوائے نبوت کی' اور اس دعوت کی بنیاد پر نبی جو کچھ پیش کرے اس کی۔ یعنی ''تصدیقُ بما جاء به النبیُّ صلی اللّٰه علیه وسلم''۔ علامہ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں: ''الایمان لغةً التصدیق وشرعًا تصدیقُ الرسولِ فیما جاء به عن ربه''(۱) یعنی لغوی اعتبار سے ایمان نام ہے صرف تصدیق کا اور شرعاً: رسول جو کچھ اپنے ربّ کی طرف سے لائے اس کی تصدیق کا۔

نبی اور رسول کی لائی ہوئی تعلیمات مختلف امور پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان میں سے کچھ غیبی اُمور ہوتے ہیں مثلاً اللہ پر ایمان' فرشتوں پر ایمان' آخرت پر ایمان۔ اسی طرح ان تعلیمات میں سے بعض کی نوعیت احکام کی ہوتی ہے۔ یہ اوامر ہیں' یہ نواہی ہیں' یہ فرائض ہیں' یہ حلال ہیں اور یہ حرام ہیں۔ نبی و رسول سابقہ اُمتوں کے حالات اور قصص بھی بیان کرتے ہیں' ان کی تصدیق بھی شامل ایمان ہوگی۔ لیکن معروف معنی میں لفظ ایمان کا اطلاق صرف ان غیبی امور کی تصدیق پر ہوتا ہے جن کو جاننے کا ہمارے پاس خود اپنا کوئی ذاتی ذریعہ نہ ہو' مثلاً موت کے بعد کیا حالات پیش آنے والے ہیں؟ فرشتوں کو ہم نہیں دیکھ سکتے اور اسی طرح کے دوسرے غیبی امور ہماری دسترس سے باہر ہیں' اسی لیے سورۃ البقرۃ کے بالکل شروع میں ایمان کے لیے جو لفظ آیا ہے وہ ہے ﴿یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ﴾ یعنی ''وہ (متقی لوگ) غیبی امور پر ایمان لاتے ہیں''۔ تو معلوم ہوا کہ ایمان کا اصلاً اور اصطلاحاً مفہوم ''غیبی امور کو تسلیم کرنا'' ہے۔

واضح رہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے پہلے نبی تھے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی۔ ان کے درمیان ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی اور تین سو پندرہ رسول تشریف لائے۔ ان رسولوں میں سے پانچ رسولوں کو ''اولوالعزم'' کا لقب ملا ہے۔ انبیاء و رسل علیہم الصلاۃ والسلام کی تعلیمات دو حصوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ایک حصہ احکامِ شریعت کہلاتا ہے جو ہر علاقے اور

زمانے کے اعتبار سے بدلتا رہا ہے۔ مثلاً نماز کی صورتیں بدلتی رہی ہیں' روزے کے احکام بدلتے رہے ہیں۔ البتہ دین کا دوسرا حصہ ''ایمانیات'' کہلاتا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی' بال برابر فرق نہیں آیا۔ حضرت آدم' حضرت نوح' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ' حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد ﷺ سب کی ایمانیات کی تعلیم ایک ہی رہی ہے۔ یہ چونکہ انبیاء کی تعلیم کا وہ حصہ ہے جو امورِ غیبی سے متعلق ہے' لہٰذا اس میں کبھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔'' (حقیقت ایمان)

معاشرے سے برائیوں کو دور کرنے کے حدیث میں تین درجے بیان ہوئے ہیں۔ مسلم شریف کی حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ رَآی مِنکُمْ مُنکَرًا فَلْیُغَیِّرْهُ بِیَدِهٖ ' فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ ' فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ))

یعنی تم میں سے جو کوئی بھی کسی برائی کو دیکھے تو پہلا درجہ عزیمت کا ہے کہ طاقت سے برائی کو روک دے۔ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے تلقین کی جائے' نصیحت کی جائے کہ کیا کر رہے ہو' باز آ جاؤ۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ حالات اتنے بگڑ جائیں کہ زبانوں پر تالے ڈال دیے جائیں' زبان بندی ہو جائے' تو دل میں یہ احساس ضرور رہے' صدمہ ضرور رہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے! ایک شدید کرب کا احساس باقی رہے۔ یہ آخری درجہ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ))[1] ''اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے''۔ اگر برائیوں پر دل کی کڑھن بھی موجود نہ رہے تو معلوم ہوا کہ ایمان کی رمق بھی اندر باقی نہیں رہی ہے۔ یہ وہ درجہ ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا کہ:

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا!
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

(مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب)

مذاہب عالم کی ایک بڑی غلطی

''توبہ کے معاملے میں تاریخ مذاہب عالم میں ایک بہت بڑی غلطی ہوئی ہے اور دُنیا کے دوسرے مذاہب نے اپنے فلسفہ اخلاق میں توبہ کے بارے میں بہت ٹھوکریں کھائی ہیں جس کے باعث ان کا نقطہ نظر کج ہوگیا ہے۔ اب دیکھئے اصل تورات میں حضرت آدم وحوا علیہما السلام سے سرزد ہونے والی غلطی' ان کی توبہ اور پھر اس غلطی کے معاف ہونے کا تذکرہ موجود تھا' لیکن بعد میں جب تورات کو دوبارہ مرتب کیا گیا تو اس میں ان کی توبہ اور معافی کا ذکر شامل نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ سے انہوں نے عجیب وغریب فلسفے بنا لیے—— آپ اندازہ کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کتنا اونچا مقام عطا کیا تھا کہ سارے فرشتوں کو ان کے سامنے سجدہ کروایا اور اس کے بعد صرف ایک ہی حکم دیا کہ اس درخت کے قریب مت جانا! اُس وقت تو ابھی کوئی شریعت نہیں تھی اور نہ ہی کوئی لمبے چوڑے احکام تھے۔ بس صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ جہاں سے مرضی کھاؤ پیو' سارا باغ مباح ہے' بس اس ایک درخت کے قریب مت جانا۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴿۳۵﴾﴾ (البقرۃ) ''اور اس درخت کے قریب مت جانا ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے''۔ مگر حضرت آدم اور حضرت حوا وہی کام کر بیٹھے جس سے منع کیا گیا تھا۔ سوچیے' کتنی بڑی خطا ہوگئی! لیکن قرآن نے وضاحت کر دی کہ اس غلطی کے سرزد ہونے کے فوراً بعد حضرت آدم کے دل میں ندامت پیدا ہوگئی۔ دل میں پچھتاوا ہے اور دل توبہ کر چکا ہے' لیکن ان کے پاس الفاظ نہیں تھے کہ کن الفاظ میں اللہ سے معافی مانگیں۔ تو وہ الفاظ بھی اللہ نے سکھائے: ﴿فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ﴿۳۷﴾﴾ (البقرۃ) ''پھر سیکھ لیے آدم نے اپنے ربّ سے چند کلمات' تو اللہ نے اس کی توبہ قبول کر لی۔ بے شک وہی تو ہے توبہ کا بہت قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا۔''

توبہ کی اصل حقیقت تو انسان کے اندر اپنی غلطی پر ندامت کا پیدا ہو جانا ہے۔ اس حقیقت کو علامہ اقبال نے اپنے عنفوانِ شباب میں اس شعر میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے' جسے

داغ دہلوی نے بہت پسند کیا اور اس پر داد دی کہ میاں اس عمر میں یہ شعر!

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے!

انفعال کہتے ہیں پشیمانی اور شرمندگی کو۔ عام طور پر جب کسی انسان پر پشیمانی اور شرمندگی طاری ہوتی ہے تو پیشانی پر پسینہ سا آ جاتا ہے۔ اس بارے میں علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اللہ کی نگاہ میں ان قطروں کی اتنی قیمت اور اتنی وقعت ہے' کہ میرے بندے نے پشیمانی اختیار کی ہے' اسے اپنے اس غلط کام پر رنج و افسوس ہو رہا ہے' کہ پروردگار نے پسینے کے ان قطروں کو موتیوں کی طرح چن لیا ہے۔ حضرت آدم سے جب خطا کا ارتکاب ہوا تو ان کے دل میں وہ پشیمانی پیدا ہو گئی' لیکن ان کے پاس وہ الفاظ نہیں تھے جن سے اپنی پشیمانی کا اظہار کرتے۔ تو اللہ تعالیٰ کی رحمت یہ ہوئی کہ اُس نے وہ کلمات خود سکھا دیے۔ قرآن نے ان ''کلمات'' کا بھی تذکرہ کیا ہے جن کے سبب حضرت آدم و حوا کو معافی ملی: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۖ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ (الاعراف) ''اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے' اور اگر تو نے ہمیں بخش نہ دیا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم ضرور خسارہ پانے والوں میں ہو جائیں گے''۔ یہ بعینہٖ وہی بات ہے جو سورۃ الزمر کی آیت ۵۳ میں بیان ہوئی ہے: ﴿يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ﴾ یعنی گناہ کرنے والا خود اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے' اس سے اللہ کو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ یہاں بھی حضرت آدم نے یہی دعا کی کہ اے ہمارے ربّ! ہم نے یہ گناہ کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا' اصل تورات میں تو حضرت آدم و حوا کی توبہ اور ان کی معافی کا تذکرہ موجود تھا' لیکن موجودہ تورات' جو بعد میں مرتب ہوئی' اس میں حضرت آدم و حوا کی معافی والی بات شامل نہیں ہے۔ اصل حقیقت کو جاننے کے لیے ہم مختصراً تورات کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں۔ اصل تورات ۲۶ سو برس سے دنیا سے غائب ہے۔ تورات کا اصل نسخہ یروشلم میں موجود ہیکل سلیمانی (حضرت سلیمان علیہ السلام کی بنائی ہوئی مسجد) میں موجود تھا۔ ۵۸۷ قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصر (Nebuchadnezzar) نے اس ہیکل سلیمانی کو گرا دیا تو وہ نسخہ اسی ملبے میں دفن ہو گیا۔ یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ نسخہ مسجد اقصیٰ کے نیچے اب بھی موجود

ہے۔ان کا کہنا ہے کہ جب بخت نصر نے ہیکل سلیمانی کو گرایا تھا تو جو نیچے تہہ خانے تھے وہ نہیں گرے تھے اور محفوظ رہ گئے تھے اور وہاں تورات کا اصل نسخہ اور تابوتِ سکینہ (جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا' من وسلویٰ کے نمونے اور بہت سے تبرکات رکھے ہوئے ہیں) موجود ہے۔ انہی تہہ خانوں میں ہیکل کے ربائیوں کی لاشیں بھی موجود ہیں۔ جب ہم کھدائی کریں گے تو یہ تمام چیزیں دنیا کے سامنے آ جائیں گی۔ بہرحال اِس وقت مجھے یہ کہنا ہے کہ چونکہ اصل تورات اس وقت گم ہوگئی تھی اور ڈیڑھ سو سال کے بعد اسے یادداشتوں سے مرتب کیا گیا تو اس میں غلطیاں پیدا ہوگئیں اور ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ حضرت آدم علیہ السلام نے جو توبہ کی اور اللہ نے ان کی توبہ کو قبول فرمالیا' اس کا ذکر اس موجودہ تورات میں نہیں ہے۔ اس سے عیسائیوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا اور عقیدہ بنالیا کہ وہ ابتدائی گناہ (original sin) جو ہمارے جدامجد آدم سے سرزد ہوا تھا اس گناہ کا اثر نسلِ آدم میں پیدا ہونے والے ہر بچے میں ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر بچہ پیدائشی طور پر گناہ گار ہے اور وہ اپنے جدامجد کے گناہ کی گٹھڑی لے کر اس دنیا میں آنکھیں کھولتا ہے۔ عیسائیوں کے اس عقیدے اور اسلام کی تعلیمات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسلام کے مطابق ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ معصوم ہے' بلکہ مسلم ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے:

((مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ' فَاَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ اَوْ یُنَصِّرَانِهٖ اَوْ یُمَجِّسَانِهٖ))

''ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے' یہ تو اُس کے والدین ہیں جو اس کو عیسائی یا یہودی یا مجوسی بنالیتے ہیں۔''

جب عیسائیوں نے یہ غلط عقیدہ اختیار کیا کہ بنی نوع انسان کا ہر بچہ بنیادی طور پر گناہگار ہے اور وہ اپنے جدامجد کے گناہ کا بوجھ لے کر اس دنیا میں آ رہا ہے تو اب انہوں نے اس کے علاج کے طور پر ''کفارہ'' کا عقیدہ ایجاد کیا۔ یہ ہے ایک غلطی پر دوسری غلطی اور دوسری پر تیسری غلطی ؎

خشت اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

عیسائیوں کے نزدیک عقیدۂ ''کفارہ'' کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ آدم کی اولاد کا ہر بچہ بنیادی اور پیدائشی طور پر گناہگار ہے تو اللہ نے اپنے اکلوتے صلبی بیٹے ''مسیح'' کو

زمین پر بھیجا اور اسے آدم کے گناہ کے کفارہ کی غرض سے سولی پر چڑھا دیا (معاذ اللہ، نقل کفر کفر نہ باشد)۔ اسے گویا قربانی کا بکرا بنا دیا اور ان سب گناہگاروں کی طرف سے قبول کر لیا تاکہ جو عیسیٰ کو مانتے ہیں ان کے گناہ کا کفارہ ہو جائے۔

یہ عقیدہ ہے عیسائیت کا۔ اس عقیدہ کی بنیاد اور جڑ یہی ہے کہ جب گناہ ہو گیا تو گناہ کا اثر باقی رہے گا۔ جبکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ نہیں، تمہاری سیرت و کردار پر جو بھی داغ ہیں، دھل جائیں گے اور تمہارے نامہ اعمال میں جو دھبے ہیں، صاف ہو جائیں گے، بس خلوصِ دل سے توبہ کر لو: ﴿تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾۔

توبہ کے اس فلسفے کا ایک اور نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر آپ سے کوئی خطا ہو گئی، گناہ ہو گیا اور آپ کو یہ بتایا جائے کہ اب بچاؤ کی کوئی شکل نہیں ہے، اس کی سزا تو مل کر رہے گی، تو ظاہر ہے کہ پھر آپ کے اندر اصلاح کا کوئی جذبہ پیدا ہی نہیں ہوگا۔ اصلاح کے لیے ایک قوت ارادی کی ضرورت ہوتی ہے اور بچاؤ کا ہر دروازہ بند کرنے سے قوت ارادی کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔ اسلام نے اس اصلاح کے جذبے اور قوت ارادی کو زندہ رکھنے کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے تاکہ لوگوں کے لیے ایک امید باقی رہے کہ میں ''point of no return'' پر نہیں کھڑا ہوں کہ جہاں سے میرے لیے واپسی کا کوئی راستہ نہ ہو۔ ابھی میرے لیے واپس جانے کا امکان ہے۔ تو اس سے انسان کے اندر اصلاح کا مادہ پیدا ہوگا، ہمت پیدا ہوگی، ارادہ پیدا ہوگا اور وہ اپنے آپ کو درست کر لے گا۔''

(توبہ کی عظمت اور اس کی تاثیر)

''میں نے گرہ میں باندھ رکھا ہے کہ قرآن اور احادیثِ صحیحہ میں جو معجزات، خرقِ عادت اور محیر العقول برکات و واقعات مذکور ہیں، ان سب پر ہمیں حرف بہ حرف (literally) ایمان لانا ہوگا۔ اس لیے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور وہ جس ربّ العالمین اور خالقِ کائنات کا انسان سے تعارف کراتا ہے وہ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ کی شان کا بھی حامل ہے، وہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ بھی ہے، اور صرف وہی اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ اور اَلْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ہے۔ لہٰذا اس معاملہ میں مَیں کسی تاویل کا روادار نہیں۔ ان کو جوں کا توں قبول کرنا میں ایمان کا لازمی جزو سمجھتا ہوں۔'' (میثاق دسمبر 2007ء)

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وفاداری کے تقاضے

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وفاداری کے چار تقاضے سورۃ الاعراف کی ایک آیت میں بیان کیے گئے ہیں۔ فرمایا:

﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الاعراف)

''تو جو لوگ ان پر ایمان لائے' اور ان کی تعظیم کی' اور ان کی مدد کی' اور جو نور ان کے ساتھ نازل ہوا ہے اس کی پیروی کی' تو یہی مراد پانے والے ہیں۔''

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے چار حقوق کا تذکرہ ہے' جن کے ادا کرنے سے ہی رسولؐ کے ساتھ وفاداری کا حق ادا ہوگا۔

پہلا تقاضا: ایمان

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وفاداری کا پہلا تقاضا ایمان ہے' یعنی آپؐ پر دلی یقین والا ایمان ہو۔ ایمان کے حوالے سے بہت تفصیلی بحثیں ہیں۔ ایک قانونی و فقہی ایمان ہے جس کی بنیاد پر دنیا میں ہم ایک دوسرے کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ اس کا تعلق اقرار باللسان سے ہے' یعنی کسی نے زبان سے کہا: اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ تو اب وہ مسلمان ہے۔ یہ تو قانونی ایمان ہے۔

اس کے مقابلے میں ایک حقیقی ایمان ہے جو اصل میں نام ہے یقین قلبی کا۔ جب یہ شہادت کسی کے دل کی گہرائیوں سے نکلے تو وہ شخص حقیقی معنوں میں ''مؤمن'' ہے۔ اس اعتبار سے ایمان کا تقاضا صرف زبانی گواہی اور شہادت سے پورا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے دل کا یقین ہونا بے حد ضروری ہے۔

دوسرا تقاضا: تعظیمِ رسولؐ

دوسرا تقاضا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی کما حقہٗ تعظیم ہو۔ جب آپ کے سامنے رسول

اللہ ﷺ کا نام لیا جائے اور آپ ان پر درود نہ بھیجیں تو آپ گویا رسول اللہ ﷺ کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تو یہ بھی لازم تھا کہ ان کی آواز حضور ﷺ کی آواز سے اونچی نہ ہو جائے۔ اس حوالے سے سورۃ الحجرات میں فرمایا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝۲﴾ (الحجرات)

''اے اہل ایمان! اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے اونچی نہ کرو اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو (اس طرح) ان کے روبرو زور سے نہ بولا کرو مبادا تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔''

یعنی رسول اللہ ﷺ سے بلند آواز سے اس طرح بات نہ کر بیٹھنا جیسے کہ آپس میں ایک دوسرے سے کر لیتے ہو۔ میری اور آپ کی کسی بات پر بحث ہو رہی ہے' آپ نے زور سے آواز بلند کی تو میں نے آپ سے بڑھ کر آواز بلند کی۔ یہ ہم آپس میں تو کر سکتے ہیں' لیکن اگر ایسا معاملہ رسول اللہ ﷺ سے کیا تو سارے اعمال حبط ہو جائیں گے۔

اس قرآنی حکم ﴿لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ﴾ پر عمل کی ہمارے لیے صورت یہ ہے کہ کسی موضوع پر میں اپنا خیال پیش کر رہا ہوں' آپ اپنا خیال پیش کر رہے ہیں۔ آپ نے اپنی رائے پر نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث بیان کی' تو اس قرآنی حکم کا تقاضا یہ ہے کہ اب میری زبان بند ہو جانی چاہیے۔ اس کے بعد بھی اگر میں کچھ کہتا ہوں تو یہ رسول اللہ ﷺ کی توہین ہے اور میں اس قرآنی حکم کے خلاف کر رہا ہوں۔ ہاں بعد میں میں تحقیق کروں گا کہ یہ حدیث جو بیان کی گئی ہے صحیح ہے یا نہیں' اس کی سند درست ہے یا نہیں' محدثین کے ہاں اس حدیث کا کیا مقام ہے' اسماء الرجال کے ماہرین اس حدیث کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ بعد میں تحقیق تو کروں گا' مگر اُس وقت میری زبان بند ہو جانی چاہیے۔ اگر ہم یہ نہیں کرتے اور اپنی رائے پر ڈٹے رہتے ہیں تو گویا ہم نے رسول کی آواز سے اپنی آواز کو بلند کر دیا۔

تیسرا تقاضا: نصرتِ رسولؐ

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وفاداری کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ آپ ﷺ کی مدد کی جائے۔ اب مدد کس کام میں کرنی ہے' یہ بہت اہم بات ہے۔ اس بارے میں نوٹ کر لیجیے کہ

رسول اللہ ﷺ کی مدد سے اللہ کے دین کو غالب و نافذ کرنے کی جدوجہد مراد ہے۔ اللہ کے ساتھ وفاداری کا بھی یہی تقاضا ہے کہ اُس کے دین کی مدد کی جائے۔ اس اعتبار سے یہاں اللہ اور رسول کے ساتھ خلوص اور اخلاص جڑ گئے ہیں کہ اللہ کے دین کو قائم کرنا میرے ایمان کا تقاضا بھی ہے اور رسول اللہ ﷺ کا فرضِ منصبی یہی تھا۔ لہٰذا آپ ؐ کی نصرت اسی کام کے لیے ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی حکومت بنانے کے لیے تو کوئی جدوجہد نہیں کی تھی۔ وہ تو جب آپ ؐ مدینہ تشریف لائے تو آپ ہی سربراہِ مملکت اور وقت کے خلیفہ تھے' لیکن اس وقت بھی آپ ؐ کے گھر میں فاقے تھے' اس وقت بھی کئی کئی دن آپ ؐ کے گھر کے چولہے میں آگ نہیں جلتی تھی۔ تو آپ ؐ نے اپنی سلطنت' اپنی حکومت یا اپنی کوئی جائیداد نہیں بنائی۔ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ بنی نوعِ انسان کے سب سے زیادہ باصلاحیت انسان نبی آخرالزماں حضرت محمد ﷺ تھے' لیکن آپ ؐ نے اپنی ان صلاحیتوں اور توانائیوں سے اپنی ذات کے لیے کبھی کچھ حاصل نہیں کیا۔ تو یہاں نصرتِ رسول ؐ وہی اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے ہے اور یہ معرکہ ابھی بھی جاری ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

بلکہ اب ایک مرتبہ پھر یہ بھٹی بہت دہکنے والی ہے۔ ایک بہت بڑی جنگ —— احادیث میں جس کو ''المَلحمَۃ العُظمٰی'' کہا گیا ہے —— ہونے والی ہے جو پچھلی صدی کی دونوں عالمی جنگوں کو مات دے جائے گی۔ ان جنگوں میں بھی کروڑوں انسان قتل ہوئے تھے' اب بھی کروڑوں قتل ہوں گے۔ یہ جنگ زیادہ دور نہیں ہے' اس کے لیے سٹیج تیار ہو رہا ہے۔ بہرحال اب بھی اگر آپ اطمینان سے بیٹھے ہیں اور غلبۂ دین کی جدوجہد میں حصہ نہیں لے رہے تو گویا آپ نہ اللہ کے دین کی وفاداری کا ثبوت دے رہے ہیں اور نہ رسول اللہ ﷺ کی نصرت کا تقاضا پورا کر رہے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے خبر دی ہے کہ قیامت سے پہلے کل روئے ارضی پر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام قائم ہوگا۔ اب اس جدوجہد میں جو لوگ اپنا حصہ ڈالیں گے وہ کامیاب ہو جائیں گے اور جو اپنے دھندوں میں مگن رہ کر اپنی زندگی گزاریں گے' یا جن کے پیش نظر وہی معاش کی بھاگ دوڑ' وہی صرف اپنے اور اپنے اہل وعیال کی فکر رہے گی' یا جن کے پیش نظر صرف دنیوی

مستقبل رہے گا' جبکہ دینی یا اُخروی مستقبل سے انہیں کوئی غرض ہی نہیں ہوگی تو وہ محروم رہ جائیں گے۔ البتہ یہ یاد رکھیے کہ چاہے آپ اس معرکہ میں شامل ہوں یا نہ ہوں' یہ لازماً ہو کر رہے گا۔ اس کی خبر علامہ اقبال بھی ساٹھ سال پہلے دے گئے ہیں:۔

دنیا کو ہے پھر معرکہ رُوح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردیٔ مؤمن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

چوتھا تقاضا: قرآن کی پیروی

رسول اللہ ﷺ سے وفاداری کا چوتھا تقاضا جو اس آیت میں بیان کیا گیا وہ یہ ہے کہ جو نور یعنی قرآن آپؐ کے ساتھ نازل کیا گیا اس کی پیروی کی جائے۔ اس حوالے سے بھی تفصیلی گفتگو ماقبل بیان ہوگئی ہے کہ قرآن کے ساتھ وفاداری کے پانچ حقوق ہیں۔ ان حقوق کو بجالانے سے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وفاداری کا ایک حق بھی ادا ہو جائے گا۔ اس اعتبار سے یہاں رسول اور قرآن کے ساتھ وفاداری کے تقاضے جڑ گئے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وفاداری اور خیر خواہی کے تقاضے کے حوالے سے بھی میرا ایک کتابچہ ''نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں'' موجود ہے۔ یہ میری ایک تقریر پر مشتمل ہے جو میں نے اوائل ۱۹۷۳ء میں ناظم آباد کراچی کی ایک جامع مسجد میں ماہِ ربیع الاول کی مناسبت سے کی تھی۔ اس کتاب کو معمولی حک واضافہ کے ساتھ ۱۹۷۴ء میں کراچی ہی سے شائع کر دیا گیا۔ میری خواہش یہ تھی کہ اسے ازسرنو مرتب کر کے ''مسلمانوں پر نبی اکرم ﷺ کے حقوق'' کے عنوان سے شائع کروں' لیکن بوجوہ اس کی نوبت نہ آئی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ اپنے تعلقات کی اساسات اور ان کے مضمرات کا صحیح فہم بھی عطا فرمائے اور ان پر عملاً کاربند ہونے کی توفیق بھی مرحمت فرمائے۔ آمین!

(میثاق ستمبر ۲۰۱۳ء)

اقتباس .....بلاعنوان

''موجودہ دور کے فتنوں میں ایک بڑا فتنہ ''معاشی مسئلہ'' ہے لوگ دنیا کمانے اور زیادہ سے زیادہ سامان تعیش اور آسائش دنیا کے حصول میں لگے ہوئے ہیں حلال وحرام کی تمیز معدوم کے درجے میں آگئی ہے۔ جو آسودہ حال ہیں ان پر مزید کمانے کی دھن سوار ہے۔ جو اوسط آمدنی کے حامل ہیں ان پر اپنے معیار زندگی کو بلند کرنے کی دھن سوار ہے۔ جو غریب طبقہ سے متعلق ہیں وہ حسد ونفرت کے شکار ہیں۔ حُبِّ دنیا نے پوری طرح انسانی ذہن پر پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ حُبِّ دنیا کی علامت ہے حُبِّ مال۔ چونکہ یہی ذریعہ ہے اس عیش وتعیش اور لذات کے حصول کا جس میں نفس انسانی مبتلا ہوتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے تعلیم دی ہے کہ ''عبادت وتقویٰ میں اپنے سے اُوپر والے کو دیکھو اور اس سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ یہی تعلیم قرآن میں موجود ہے۔ (فاستبقوا الخیرات) اور نعمتوں اور معاش (روزی) کے معاملہ میں اپنے سے نیچے والے کو دیکھو تاکہ تم کو جو کچھ ملا ہے اس پر شکر کرو۔'' لیکن آج معاملہ برعکس ہے۔ آج خیر کے کاموں میں سبقت کا فقدان ہے اور ہے بھی تو ''ریا'' پیش نظر ہوتی ہے۔ جو بھی تگ ودو میں مصروف نظر آتا ہے اس کا مقصود حصول مال نظر آتا ہے۔ آج قناعت عنقا ہے ہر شخص دنیا کمانے میں دیوانوں کی طرح لگا ہوا ہے، الا ماشاء اللہ۔ کیسا دین اور اس کے احکام' کیسی آخرت اور اس کا احتساب۔ آج انسان کا وہی حال ہے جس کا نقشہ قرآن حکیم میں سورۃ الہمزہ میں یوں کھینچا گیا ہے کہ ﴿اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالاً وَّعَدَّدَهٗ (۲) یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗ اَخْلَدَهٗ (۳)﴾ ازروئے قرآن حبِّ مال دنیا پرستی ہے' خدا پرستی نہیں۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ط﴾ (ال عمران:92)

اور اہل ایمان کو متنبہ کر دیا گیا کہ:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ (سورہ توبہ)

مال کے پرستاروں کو نبی اکرم ﷺ نے دینار و درہم کا بندہ (عبد) قرار دیا ہے اور رحمۃ للعالمین ﷺ نے اُن کے لیے بددُعا فرمائی ہے:

((تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ))

''تباہ و برباد ہو دینار کا بندہ اور درہم کا بندہ۔''

(رودادِ تنظیم اسلامی حصہ اوّل)

''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ضمن میں انسان کو اپنی ذات اور اپنے نفس کو مقدم رکھنا ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم دوسروں کو تو نیکی کی نصیحت و تلقین کریں اور خود اُس پر عامل نہ ہوں۔ برائی پر ہم دوسروں کی نکیر کریں، ان پر تنقید کریں اور اپنی برائیوں پر نہ نظر ڈالیں نہ ان کو دور کرنے کی فکر کریں۔ سورۃ البقرۃ میں بنی اسرائیل کے جرائم میں جو فہرست بیان ہوئی ہے اس میں ایک جرم یہ بھی فرمایا گیا:

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ (البقرۃ: ٤٤)

''کیا تم لوگوں کو نیکی اور بھلائی کا حکم دیتے ہو (اور انہیں اس کی تلقین و نصیحت کرتے ہو) اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو!''

تو انسان میں یہ دونوں وصف بیک وقت مطلوب ہیں۔ وہ اپنی اصلاح کے لیے بھی کوشاں رہے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتا رہے۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے لیے مدد و معاون ہوں گی۔''

(مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب)

جذبہ شکر کی انتہا

''جب انسان عہدِ طفولیت میں ہوتا ہے تو اس کے ذہن کی دنیا ابھی اتنی محدود ہوتی ہے کہ وہ اپنے والدین ہی کے بارے میں یہ سمجھتا ہے کہ یہی میرے رازق ہیں' یہی میرے محافظ ہیں' یہی میرے دکھ درد محسوس کرنے والے ہیں' مجھے کوئی تکلیف ہو تو اسے یہی رفع کرنے والے ہیں' لہٰذا اس کا غیر شعوری جذبۂ شکر اپنے والدین کی ذات پر مرتکز رہتا ہے' لیکن جیسے جیسے فکر انسانی کا ارتقاء ہوتا ہے اور عقل اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے' انسان کا شعور پروان چڑھتا ہے اور اس کے ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے تو انسان کو معلوم ہوتا چلا جاتا ہے کہ میں تو بہت سوں کا زیرِ بارِ احسان ہوں۔ میرا وطن ہے' میری قوم ہے' میرے اعزہ و اقرباء ہیں۔ یہ سب کے سب میرے محسن ہیں' میری بھلائی کے لیے سوچتے ہیں۔ میں درجہ بدرجہ ان سب کا زیرِ بارِ احسان ہوں۔ اسی طرح گویا جذبۂ شکر پھیل رہا ہے۔ پھر انسان یہاں تک سوچتا ہے کہ یہ زمین جس سے مجھے غذا حاصل ہو رہی ہے' یہ سورج جس سے یہ سارا نظام چل رہا ہے' فصلیں پک رہی ہیں' بارشیں ہو رہی ہیں جن سے مُردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے تو میں ان میں سے ہر چیز کا زیرِ بارِ احسان ہوں۔ میری جو ضروریات پوری ہو رہی ہیں تو اس پوری کائنات کی ایک ایک شے میری ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی میں لگی ہوئی ہے۔ اس طرح یہ شکر پھیل کر کائنات کی وسعتوں کو اپنے اندر سمو لیتا ہے!

اس کے بعد اگر انسان ایک چھلانگ اور لگا لے' فکر انسانی اگر ایک قدم اور اٹھا لے تو وہ اس نتیجے تک پہنچ سکتا ہے کہ یہ تمام مظاہرِ فطرت اور ان میں جو تعدد نظر آ رہا ہے' ان میں جو توافق اور نظم نظر آ رہا ہے' ان سب کا منبع اور سرچشمہ کوئی ایک ذات ہے۔ سورج میں جو تمازت ہے وہ اس کی اپنی نہیں' کوئی اور ہے جس نے اس میں یہ حرارت و تمازت رکھی ہے۔ کسی شے میں اگر کوئی وصف ہے تو وہ اس کا ذاتی نہیں' کسی کا عطا کردہ ہے۔ ایک خالق' ایک ربّ' ایک منعم ہے جس کے انعامات و احسانات کا یہ پورا سلسلہ اس کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔ نتیجہ کیا نکلے گا! یہ کہ غور و فکر اور عقل کا یہ ذہنی سفر جب اس حد کو پہنچ جائے گا تو وہ شکر جو والدین کی ذات سے شروع ہو کر پھیلتا ہوا کائنات کی وسعتوں کو محیط ہو گیا تھا' ایک ذات پر مرتکز ہو جائے گا اور وہ سمجھ لے گا کہ شکر کا مستحق حقیقی اللہ ہے۔''

(مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب)

ایمان بالرسالت کا خصوصی مقام

''جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ شرعی اور فقہی اعتبار سے اصل ایمان' ایمان بالرسالت ہے۔ اگر کوئی شخص موحد کامل ہو' کردار کے اعتبار سے اونچے مقام پر ہو لیکن رسول کو نہ مانے تو وہ کافر ہے۔ اس کی ساری توحید اور اخلاق و کردار کی ایمان کے اعتبار سے کوئی قدر و قیمت نہیں جب تک کہ وہ رسول کو نہ مان لے۔ تو معلوم ہوا کہ ایمان بالرسالت کی شرعی' فقہی اور قانونی حیثیت اتنی زیادہ ہے کہ ایک اعتبار سے ایمان بالرسالت' ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ پر بھی حاکم ہے۔ کیونکہ ایمان باللہ بھی صرف وہی معتبر ہوگا جو ان اسماء وصفات کے ساتھ ہو جن کی خبر ہمیں رسول اللہ ﷺ سے ملی ہے۔ اپنے طور پر کسی وجودِ مطلق' universal spirit' روحِ کائنات' یا واجب الوجود کو مان لینا اللہ تعالیٰ پر ایمان شمار نہیں ہوگا جب تک کہ یہ ایمان ''آمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَائِهٖ وَ صِفَاتِهٖ'' (میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر اس کے اسماء وصفات سمیت ایمان لایا) کی کیفیت کا حامل نہ ہو۔ اور یہ اسماء وصفات ہمیں یا تو قرآن حکیم سے ملے ہیں جو ہمیں رسول اللہ ﷺ کے ذریعے ملا ہے یا پھر سنت مطہرہ سے معلوم ہوئے ہیں۔ بہرحال ہمیں ایمان باللہ کے باب میں جو بھی معلومات حاصل ہوئیں' ایمان بالرسانت کے حوالے سے ملیں۔ چنانچہ محض کسی کو خالق مان لینا ''ایمان باللہ'' شمار نہیں ہوگا۔ اسی طرح محض کسی کو رُوحِ کائنات مان لینا بھی ایمان باللہ شمار نہیں ہوگا جب تک کہ اس ہستی کے لیے وہ اسماء وصفات نہ تسلیم کیے جائیں جن کا علم ہمیں رسالت کے واسطے سے ہوا ہے۔

اسی اصول کے مطابق ایمان بالآخرۃ بھی صرف وہی معتبر ہوگا جو ان تمام تفصیلات کے ساتھ ہو جن کی خبر ہمیں محمد رسول ﷺ نے فراہم کی ہے۔ محض مجازات' قانونِ مجازات اور انسانی وجود و حیات کا کوئی تسلسل مان لینا ایمان بالآخرت نہیں کہلا سکتا۔ موت' رُوح کی پرواز' قبر' حسابِ قبر' قبر کی نعمتیں یا سزائیں' بعث بعد الموت' حشر و نشر' حاضری محشر' شفاعت کبریٰ' وزنِ اعمال' جزاء و سزا' حساب کتاب' پُل صراط'' جنت اور دوزخ' جنت کی نعمتیں یا دوزخ کی سزائیں اور عقوبتیں' یہ تمام چیزیں جو پوری تفصیلات کے ساتھ ہمیں احادیث نبویہؐ سے ملی ہیں ان کو دل کی گہرائی سے مانا جائے تب دینی اور شرعی اعتبار سے یہ ایمان بالآخرت کہلائے گا' ورنہ مجرد رُوح انسانی کے تسلسل یا وجودِ انسانی کی بقا کو اگر کوئی مانتا بھی ہے تو یہ ایمان بالآخرۃ نہیں ہے۔''

(حقیقت ایمان)

محض ایک متوارث عقیدے کے طور پر قرآن کو ایک مقدس آسمانی کتاب ماننے سے ہماری موجودہ صورتِ حال میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی اور قرآن مجید کے ساتھ عدم التفات کا جو رویہ ہمارا اس وقت ہے' وہ نہیں بدل سکتا۔ قرآن مجید کے جو حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں ان کی ادائیگی کی اوّلین شرط یہ ہے کہ سب سے پہلے ہمارے دلوں میں یہ یقین پیدا ہو کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور ہماری ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے۔

اس یقین کے پیدا ہوتے ہی قرآن کے ساتھ ہمارے تعلق میں ایک انقلاب آ جائے گا۔ یہ احساس کہ یہ ہمارے اس خالق و مالک کا کلام ہے جس کی ذات تبارک و تعالیٰ وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے' اور جس کا کسی ادنیٰ ترین درجے میں بھی کوئی تصور ہمارے بس میں نہیں اور جس کی ذات کے ادراک سے عجز کا احساس ہی بقول افضل البشر بعد الانبیاء کمالِ ادراک ہے' ہمارے فکر و نظر میں ایک انقلاب برپا کر دے گا۔ پھر ہمیں محسوس ہو گا کہ اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے قرآن سے بڑی کوئی دولت اور اس سے عظیم تر کوئی نعمت موجود نہیں۔

پھر اس کی تلاوت ہماری روح کی غذا اور اس پر غور و فکر ہمارے قلوب و اذہان کے لیے روشنی بن جائیں گے — اور یقیناً یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی کہ اس کی تلاوت سے ہم کبھی سیر نہ ہو سکیں گے اور اپنی بہترین ذہنی و فکری صلاحیتوں اور اپنی پوری عمر کو اس پر تدبر و تفکر میں کھپا کر بھی ہم محسوس کریں گے کہ ؏

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!''

(مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق)

عیب تلاش کرنے کی ممانعت

''ایک دوسرے کے حالات کی ٹوہ میں نہ رہا کرو''۔ کہا جاتا ہے کہ مکھی گندگی پر ہی بیٹھے گی' اس لیے کہ وہ اس کی فطرت ہے۔ اسی طرح کچھ لوگ کھوج کرید میں رہتے ہیں کہ اس گھر میں کیا ہو رہا ہے' وہاں کوئی دنگا فساد ہے یا نہیں؟ ذرا سی کوئی بات اگر مل گئی تو لے اڑے۔ یہ ان کا ذوق ہوتا ہے۔ تو اس سے روکا گیا ہے' بلکہ حدیث میں تو یہاں تک آیا ہے کہ اگر تمہارے کسی مسلمان بھائی کا کوئی عیب تمہارے علم میں خود بخود آ جائے تو اسے بیان کرنا تو دور کی بات ہے' اس کے اوپر پردہ ڈالو۔ اس کے برعکس خود تجسس کر کے لوگوں کے عیوب تلاش کرنا یہ تو بہت بری بات ہے۔''

(میثاق دسمبر 2015ء)

غیبت کی ممانعت

''کسی مسلمان بھائی کے پیچھے اس کی کوئی برائی بیان نہ کرو۔ اس حوالے سے حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ اگر اس میں وہ برائی موجود ہو تو؟ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا :((اِنْ كَانَ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدِ اغْتَبْتَهُ وَاِنْ لَمْ يَكُنْ فِيْهِ فَقَدْ بَهَتَّهُ))(صحیح مسلم) ''اگر وہ عیب اس میں ہے جو تم کہتے ہو تبھی تو وہ غیبت ہے' اور اگر اس میں وہ عیب نہ ہو تو پھر تم نے اس پر بہتان لگایا ہے''۔ ایک شخص کے اندر اگر کوئی عیب ہے یا اس نے کوئی برائی کی ہے تو اس کے پیٹھ پیچھے اس کا ذکر مت کرو' ہاں اس کے سامنے اس انداز سے بات کرو تا کہ وہ اپنی اصلاح کرے۔ پیٹھ پیچھے کرو گے تو یہ غیبت ہے اور اس کو اتنا برا کہا گیا کہ:﴿اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ﴾ ''کیا تم میں سے کوئی شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ یہ بات تو تمہیں بہت بری لگے گی''۔ یعنی کسی مسلمان بھائی کی غیبت کرنا اخلاقی سطح پر وہی فعل ہے جیسے کسی مسلمان بھائی کا گوشت کھانا۔ اس کے اندر مناسبت یہ ہے کہ مردہ اپنا دفاع نہیں کر سکتا' آپ جہاں سے چاہیں اس کی بوٹی اُڑا لیں۔ اسی طرح جو شخص موجود نہیں ہے تو وہ بھی اپنا دفاع نہیں کر سکتا۔ وہ موجود ہوتا تو بتاتا' نہیں بھئی ایسا نہیں ہے' بلکہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے اور یہ بات میں نے نہیں کی ہے۔ اگر سامنے ہوگا تو وہ کچھ نہ کچھ دفاع تو کر سکتا ہے' لیکن جب موجود ہی نہیں تو وہ اپنی عزت کا دفاع نہیں کر سکتا' جیسے مردہ اپنا دفاع نہیں کر سکتا۔''

(میثاق دسمبر 2015ء)

بندۂ مؤمن کا کام

''ایک بندۂ مؤمن کا کام یہ ہے کہ اپنا سب کچھ راہِ حق میں لا کر ڈال دے' اپنی قوت و صلاحیت، اپنی توانائیاں، اپنا مال اور اپنی جان اس کام کے لیے وقف کر دے، اس میں کھپا دے۔ تو جیسا کہ کہا گیا ہے کہ ''السعی مناو الاتمام من اللّٰہ'' کوشش کرنا ہمارے ذمہ ہے کسی کام کی تکمیل کر دینا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ اس کام کو تکمیل تک پہنچنا سراسر اللہ کے اذن اور اُس کے فیصلہ پر منحصر ہے۔ اور اللہ کا اِذن اور فیصلہ اس کی حکمت کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر کام کے لیے ایک اجل معین کر رکھی ہے ہم نہیں جانتے کہ اس نے اپنے دین کی نشاۃ ثانیہ اور اس کے غلبہ و اظہار کے دور ثانی کے لیے کون سا وقت مقرر فرمایا ہوا ہے۔ ہم کو نہیں معلوم کہ دین حق کے بالفعل قائم اور نافذ ہونے تک ابھی اللہ تعالیٰ کتنے قافلوں کو اُٹھائے' جو کچھ دُور تک چلیں' چند کٹھن منازل طے کریں' اور پھر تھک ہار کر رہ جائیں۔ پھر کوئی دوسرا قافلہ ایک عزم نو کے ساتھ مترتب ہو اور آگے بڑھے اور اس جدوجہد کو کسی خاص حد تک لے جائے ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ البتہ ہم یہ جان گئے ہیں اور یہ جان لینا ہی ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم مسئول ہیں عزمِ مصمم کرنے پر' اور ہم مسئول ہیں سعی و جہد پر، ہم مسئول ہیں اپنی سی کر گزرنے پر۔ اس راہ کے کسی ایک مرحلے کی تکمیل بھی ہمارے بس میں نہیں ہے۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق اور اس کی حکمت پر منحصر ہے۔''

(روداد تنظیم اسلامی حصہ اوّل)

☆ میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ اپنا اصل محور اور حقیقی نصب العین آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول بنائیں۔

☆ میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے دینی فرائض اور فرض عبادات کو ان ہی شرائط کے ساتھ ادا کرنے کی فکر کیا کیجیے جو قرآن وسنت میں بیان ہوئی ہیں۔

☆ میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ تلاوت قرآن مجید کو اپنا شعار بنائیے، کسی مستند ترجمہ اور تفسیر کی مدد سے ان کا ''مطالعہ'' بھی کیجیے اور اس پر غور وتدبر بھی۔ حدیث شریف' سیرتِ مطہرہؐ اور سیر صحابہؓ کے مطالعہ کو بھی اپنے معمولات میں شامل کیجیے۔

☆ میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ نوافل' خاص طور پر تہجد کا اہتمام کرنے کی کوشش کیجیے۔ ہم بہت ہی کمزور اور بے بضاعت ہیں۔ ہمارے لیے زادِ راہ اگر کوئی ہے تو یہی ہے کہ ہم میں عبادات کا شوق پروان چڑھے۔ وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ اور يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ۔

☆ میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ نبی اکرم ﷺ کے اتباع کو اپنا شعار بنائیے۔ صبغۃ اللہ اسی طرز عمل سے ہم پر غالب آئے گا۔''

(روداد تنظیم اسلامی حصہ اوّل)

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاھور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی **نشأۃِ ثانیہ** ـ اور ـ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ